جواہر پارے

یعنی [illegible] اسلامیہ دہلی

اُردو زبان کے صاحب طرز ادیبوں اور شاعروں کے
منتخب مضامین نظم و نثر کا بہترین مجموعہ!

مُرتّبہ

مقبول انور داؤدی

قیمت ۴ روپے

فیروز سنز
لاہور کراچی پشاور

۱۹۵۶ء

باراوّل	۱۹۵۳ء	۱۰۰۰
باردوم	۱۹۵۵ء	۵۰۰
بارسوم	۱۹۵۸ء	۱۰۰۰

ناشران : فیروز سنز لاہور

طابع : فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور

باہتمام عبدالحمید خاں

فہرس

حصۂ نثر

پیش لفظ

ہر قوم کا ادب اس قوم کی انفرادی، اجتماعی معاشرتی و سیاسی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی قوم کے ادب کو دیکھ کر ہی اس کے خیالات و افکار اور مجلسی و معاشی ارتقاء کا اندازہ لیا جا سکتا ہے۔ ازمنہ قدیم کی اقوام دنیا میں موجود نہیں۔ مگر ان میں سے جن قوموں کا ادب اور فنونِ لطیفہ زمانے کی خرد برد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ اُن کی تہذیب و تمدن، معاشرت اور ثقافت کا آج بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

اردو زبان دنیا کی جدید ترین زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس لئے اس کا ادب بھی کم سنی کے دور سے گزر رہا ہے۔ تاہم یہ ہماری گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تہذیبی، تمدنی اور سیاسی و معاشی کشمکش کا حامل ہے اور اس مختصر مدت میں بھی اس نے جو حیرت انگیز ہمہ گیری حاصل کر لی ہے۔ اُس سے اُس کے تابناک مستقبل کا پتہ چلتا ہے اور یہ اُمید بندھتی ہے کہ کچھ عرصہ بعد ہمارا ادب بھی دُنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے مماثل ہو جائے گا۔ اور ہم اردو ادب کو دُنیا بھر کے نقادوں کے سامنے فخر سے پیش کر سکیں گے۔

اگر ہم اُردو ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو ہمیں دامانِ اُردو جملہ علوم و فنون سے لبریز نظر آئے گا۔ ادب و آرٹ، فلسفہ و سائنس، تاریخ و جغرافیہ، غرض کہ کون سا فن ہے جس تک اردو کی پہنچ نہ ہوئی ہو۔ دوسرے علوم و فنون کے متعلق بلند بانگ دعاوی شاید صحیح نہ ہوں، مگر ادب کے متعلق تو ہم ببانگ دہل کہہ سکتے ہیں کہ جب اس کا بچپن ایسا ہے تو جوانی کیسی ہو گی۔

زیر نظر کتاب اردو کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک کے ادب (نظم و نثر) کا ایک کامیاب مطالعہ ہے جس میں اُردو ادب کی مختصر سی تاریخ کے علاوہ ان بلند پایہ اور مایہ ناز اُدباء و شعرا کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے جنہوں نے اُردو کی ترویج و ترقی میں ان تھک کوشش کی۔

اُمید ہے کہ طلبہ کے علاوہ دیگر ادب دوست احباب کے لئے بھی یہ کتاب مفید ثابت ہو گی۔

اُردو ادب کی کہانی

اُردو زبان کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دِلّی کے اطراف و جوانب میں بولی جاتی تھی۔ اور اس کا تعلق براہِ راست شورسینی پراکرت سے تھا۔ مسلمانوں کی آمد سے اس میں فارسی الفاظ کا عمل دخل شروع ہُوا۔ چونکہ نئی زبانوں کی طرح اس میں فارسی الفاظ و محاورات کو قبول کرنے کی کافی صلاحیت تھی۔ لہٰذا فارسی کے نرم اور ملائم الفاظ کو اس نے آسانی سے جذب کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ اُردو ایک نئی زبان بنتی چلی گئی۔ چونکہ فارسی الفاظ ہندی رسم الخط میں آسانی اور صحت سے نہ لکھے جا سکتے تھے۔ اس لئے اس کے لئے فارسی رسم الخط رائج ہُوا۔ اور اُردو شاعری فارسی شاعری کے قدم بقدم چلنے لگی۔ اسی طرح نثر پر بھی ایسا ہی انقلاب گذرا۔ الغرض اُردو پر فارسی زبان کا اس قدر گہرا اثر ہُوا۔ کہ اردو کی ابتدائی خصوصیات کا بالکل خاتمہ ہو گیا

ویسی کی طرح مغربی زبانوں نے بھی اُردو پر اپنا گہرا اثر ڈالا۔ ڈچ اور فرانسیسی کے اثرات اب بہت کم رہ گئے ہیں لیکن پرتگالی اور انگریزی الفاظ اپنی اصلی حالت میں اور بعض کسی قدر تبدیلی کے بعد اب تک موجود ہیں ہے۔ جیسے اسٹیشن بوتل تولیہ وغیرہ

اُردو زبان کی ابتداء عام بول چال سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اسی زبان میں اشعار لکھے جانے لگے۔ مگر اس وقت کیفیت یہ تھی۔ کہ ایک مصرعہ فارسی کا ہے اور دوسرا اُردو کا۔ یا مخلوط زبان میں اشعار لکھے جانے لگے۔ اُردو زبان کے ابتدائی دور نظم میں اکثر اشعار ایسے مل سکیں گے۔ کہ صرف ایک لفظ کے فارسی کر دینے سے سارا شعر یا مصرعہ فارسی کا ہو جاتا تھا۔

چونکہ نظم میں فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال ہونے لگے تھے یہی وجہ ہے کہ جب نثر کی بنیاد رکھی گئی۔ تو نثر بھی مقفیٰ ہی پسند کی جانے لگی۔ جس میں بیحد

تصنع تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہی غیر مانوس الفاظ اور ترکیبیں اردو میں اسی طرح گھل مل گئیں۔ کہ اب وہ ہماری زبان کا جزو ہیں۔ اور ان کو نکالنا عبث کوشش ہے۔

امیر خسرو اُردو کے پہلے شاعر ہیں۔ اُردو کی پہلی غزل انہیں سے منسوب ہے انہوں نے ان گنت پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور دو سُخنے کہے۔

امیر خسرو سے لے کر شعرائے دکن تک تین صدیوں کے طویل زمانے میں زبان نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ البتہ روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس میں بہت سے فارسی کے الفاظ شامل کر لئے گئے۔

شاہان بیجا پور اور گولکنڈہ کے عہد میں اُردو زبان کا آفتاب عالمتاب طلوع ہوا۔ یہ بادشاہ خود صاحب علم و فضل اور اہل علم کے قدردان تھے۔ محمد قطب شاہ عبداللہ قطب شاہ اور ابو الحسن دکھنی زبان میں شعر کہتے تھے۔ اسی طرح بیجا پور کے بادشاہ عادل شاہ اوّل اور ثانی کی تصانیف زبان و ادب کے تدریجی ارتقاء کی قابل قدر مثالیں ہیں۔

ولی کے زمانے میں اگرچہ اور بھی شاعر موجود تھے۔ لیکن ان کے سامنے کوئی نہ چمک سکا۔ ولی نے اردو شاعری کا رنگ بنیاد باقاعدہ طور پر رکھا۔ وہ شمالی ہند کے شعراء نے انہی کا تتبع کیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ولی کو ریختہ کا موجد کہا جاتا ہے ان کا کلام نہایت سادہ اور صاف ہے۔ تصوف کا رنگ بھی موجود ہے۔

آخری عمر میں ولی دکن سے دہلی میں آ گئے۔ اور دلی والے انہی کا تتبع کرنے لگے۔ چونکہ اُردو کے یہ شاعر فارسی کے بھی کہنہ مشق شاعر تھے۔ لہذا اردو شاعری فارسی شاعری کے نقش قدم پر چلنے لگی۔

حاتم، خان آرزو۔ ناجی، مضمون اور آبرو اُردو کے اجداد ہیں۔ ان کا کلام صاف۔ سادہ اور تصنع سے پاک ہے۔ ولی کے کلام کی نسبت ہندی الفاظ کم ہیں۔ البتہ فارسیت کا رنگ غالب ہے۔

میر سودا کا زمانہ اردو شاعری کی ترقی کا زمانہ ہے۔ یہ دونوں استاد اپنے ہم عصروں اور پہلے حریفوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کو زینت الفاظ اور جدت خیال سے سنوارا اور غزل اور قصیدہ کو عروج پہنچایا ان کے علاوہ ان کے دوسرے ہم عصر شعرا نے بھی اردو شاعری کو ہندی الفاظ سے پاک کیا۔ اس دور میں زبان میں وسعت و قوت پیدا ہوئی۔ اور نئے نئے الفاظ و محاورے اور ترکیبیں زبان میں داخل ہوئیں۔ اسی دور میں "معاملہ بندی" کا رواج ہوا۔ جرات۔ انشا اور رنگین اس کے پیشرو تھے۔

"معاملہ بندی" نے بعد میں ریختی کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن چونکہ ایسے اشعار نفسیاتی جذبات کو ابھارنے کے لئے کہے جاتے تھے۔ ریختی کی مثالیں ولی کے ہمعصروں میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن ایک مدت کے بعد انشا اور رنگین نے اسے پھر سے زندہ کیا۔ مشہور ریختی گو میر یار علی خاں جان صاحب نے اسے ایک فن قرار دیا۔ ریختی میں یہ صاحب دیوان ہیں۔ لیکن اب یہ صنف متروک ہو چکی ہے۔

اسی دور کے شعرا نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہ لوگ غزل کے استاد تھے۔ مثنوی اور قصیدہ بھی خوب لکھتے تھے۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا جواب نہیں۔ سودا قصیدہ کے بادشاہ تھے۔

دوسرے دور کی ابتدا شاہ نصیر، ذوق، غالب، مومن اور ظفر سے ہوتی ہے اس عہد میں ہندی کے رہے سہے الفاظ بھی زبان سے خارج کر دئے گئے۔ شاہ نصیر کو انشا اور ذوق کے زمانے کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہئے۔

اسی دور میں نظیر اکبر آبادی ہوئے۔ جن کا رنگ سب سے جدا اور نرالا تھا۔ غالب و مومن کے ہاں فارسی الفاظ اور محاورات کی بھرمار ہے۔ اس عہد میں غزل اور قصیدے کو بہت ترقی ہوئی۔ سنگلاخ زمینوں اور جدید بحروں میں اشعار لکھے جانے لگے خیالات میں جدت اور مضامین میں ندرت پیدا ہو گئی۔

پر بہت بڑا احسان کیا۔ اور عبدالحلیم شرر تاریخی ناول کے موجد ہوئے۔ ڈرامے کو آغا حشر کاشمیری نے بام عروج پر پہنچایا۔

طباعت کی آسانیوں سے اردو رسائل، جرائد اور اخبارات بکثرت نکلنے لگے۔ انگریزی کتابوں کے تراجم نے یورپ کی طرز انشا پردازی کو اردو دانوں کے سامنے پیش کیا۔ جس سے اردو نظم و نثر میں انقلاب آگیا۔ مسجع اور مقفیٰ عبارت موقوف ہوگئی۔ درسی ضرورت کے لئے جو ترجمے کئے گئے۔ ان کی زبان نہایت صاف اور سلیس ہوگئی۔ اور اب اردو فارسی سے بے نیاز ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوگئی۔

موجودہ دور میں سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریاآبادی، سید علی بلگرامی مولوی عزیز مرزا، مولوی عبدالحق، مولوی وحیدالدین سلیم۔ سر شیخ عبدالقادر منشی دیانرائن نگم، لالہ سری رام دہلوی نے اردو ادب کی خدمت میں نمایاں حصہ لیا۔

مولانا ظفر علی خاں۔ عبدالمجید سالک، سید سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش حامداللہ افسر، پروفیسر رشید احمد صدیقی، احسن مارہروی، مولانا حسرت موہانی۔ مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے نثر و نظم میں اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

حیدرآباد نے اردو کی ترویج و ترقی میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔ انجمن ترقی اردو۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اردو زبان کی خدمت میں سرگرم حصہ لیا پنجاب بھی زبان کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ محدود وسائل میں بھی اس نے زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

لیکن تقسیم ہندوستان کے بعد اردو صرف پاکستان کی زبان ہوکر رہ گئی۔ ہندوستان میں خالص ہندی زبان کو رواج دیا جارہا ہے۔ جس

سے ہندوستان میں اُردو کا مستقبل نہایت تیرہ و تاریک نظر آ رہا ہے۔ البتہ پاکستان نے اس کو قومی زبان قرار دے کر اس کی سرپرستی قبول کر لی ہے۔ اور توقع ہے کہ آزادی کے دور کی یہ زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں بہت جلد بار حاصل کرے گی۔

داؤدی

میر امّن دہلوی

بعض مصنفین کا بیان ہے کہ ان کا اصلی نام میر امان اور تخلص لطف تھا۔ مگر وہ اپنے عرف میر امّن کے نام سے زیادہ مشہور رہا۔ ان کے بزرگ شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں ہندوستان میں آئے اور عہدِ مغلیہ میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے۔

چالیس سال کی عمر میں زمانے کی گردش اور دلی کی بربادی نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ کچھ مدت عظیم آباد (پٹنہ) میں قیام کیا اور پھر کلکتہ چلے گئے۔ اور نواب دلاور جنگ کے بھائی محمد کاظم کے اتالیق مقرر ہوئے۔ پھر میر بہادر علی حسینی کی وساطت سے ڈاکٹر گلکرائسٹ تک رسائی نصیب ہوئی اور فورٹ ولیم کالج میں ملازمت مل گئی۔

میر امن عبارت میں روانی، سادگی، محاورات کے برمحل استعمال، حفظ مراتب اور زبان کی شستگی کا بڑا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کی مشہور اور غیر فانی تصنیف "باغ و بہار" ہے۔ میر امّن پہلے شخص ہیں، جنہوں نے ٹھیٹ اردو زبان میں یہ کتاب لکھی۔

بصرے کی ملکہ

سُن اے جوان دانا سلطان اس اقلیم کا بڑا بادشاہ تھا۔ اس کے گھر میں سات بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ایک دن بادشاہ نے جشن فرمایا۔ یہ ساتوں لڑکیاں سولہ سنگار کئے بال بال گنج موتی پرو کر بادشاہ کے حضور میں کھڑی تھیں۔ سلطان کے کچھ جی میں آیا تو بیٹیوں سے فرمایا اگر تمہارا باپ بادشاہ نہ ہوتا اور تم کسی غریب کے گھر پیدا ہوتیں تو تمہیں بادشاہزادی اور ملکہ کون کہتا، خدا کا شکر کرو کہ شاہزادیاں کہلاتی ہو۔ یہ ساری خوبی میرے دم سے ہے۔ چھ لڑکیاں ایک زبان ہو کر بولیں کہ جہاں پناہ سچ فرماتے ہیں۔ اور آپ ہی کی سلامتی سے ہماری بھلائی ہے۔ لیکن ملکہ جو سب سے چھوٹی تھی۔ مگر عقل و شعور میں سب سے بڑی تھی۔ چپکی کھڑی رہی۔ اور اس گفتگو میں بہنوں کی شریک نہ ہوئی اس واسطے کہ یہ کلمہ کفر کا ہے۔ بادشاہ نے غصّہ ہو کر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ بیٹی تم کچھ نہ بولیں۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ تب ملکہ نے اپنے دونوں ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اگر جان کی امان پاؤں تو یہ لونڈی کچھ عرض کرے۔ حکم ہوا کہ کیا کہتی ہے؟

تب ملکہ نے کہا قبلۂ عالم آپ نے سنا ہے کہ سچی بات ہمیشہ کڑوی ہوتی ہے۔ سو اس وقت اپنی زندگی سے ہاتھ دھو کر عرض کرتی ہوں۔ کہ جو کچھ خدا نے میری قسمت میں دیا ہے اس کا مٹانے والا کوئی نہیں ہے وہ کسی طرح ٹلنے کا نہیں۔ جس بادشاہ علی الاطلاق نے آپ کو بادشاہ کیا ہے اُسی نے مجھ کو بادشاہزادی بھی کہلوایا۔ اس کی قدرت کے کارخانے میں کسی کا اختیار نہیں چلتا۔ آپ کی ذات ہمارے لئے ولی نعمت اور قبلہ و کعبہ ہے۔ حضرت

قدم مبارک کی خاک پا کو سُرمہ کروں تو بجا ہے۔ مگر نصیب ہر ایک کا ہر ایک کے ساتھ ہے۔ بادشاہ کو یہ سُن کر غصّہ آیا۔ اور یہ جواب بُرا معلوم ہُوا۔ بیزار ہو کر فرمایا۔ چھوٹا مُنہ بڑی بات ہے اس کی یہی سزا ہے۔ کہ گہنا پاتا جو کچھ اس کے پاس ہے اُتار لو اور اس کو ایک میانے میں بٹھا کر ایسے جنگل میں کہ جہاں نام و نشان آدم زاد کا نہ ہو چھوڑ آؤ۔ دیکھیں اس کے نصیب میں کیا ہے؟

بموجب حکم بادشاہ کے اُس آدھی رات میں کہ خوب اندھیری تھی۔ ملکہ کو جو ناز نخرے میں پلی تھی اور سوائے اپنے محل کے دوسری جگہ نہ دیکھی تھی۔ سبھوں نے لے جا کر ایک میدان میں کہ وہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ انسان کا تو کیا ذکر ہے چھوڑ کر چلے آئے۔ ملکہ کے دل پر عجیب حالت گذری۔ کہ کیا تھا کیا اور ایک دم میں کیا ہو گیا۔ پھر خدا کی جناب میں شکر کرتیں۔ اور کہتیں کہ تُو ایسا ہی بے نیاز ہے۔ جو چاہا سو کیا۔ جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ تجھ سے نا اُمید نہیں ہوتی اسی اندیشے میں آنکھ لگ گئی جب صبح ہُوئی اور ملکہ کی آنکھ کھُلی۔ پکاریں کہ وضو کو پانی لانا۔ پھر رات کی بات چیت یاد آئی۔ کہ تو کہاں۔ یہ کہہ کر تیمّم کیا اور سجدۂ شکر ادا کیا۔

اے عزیز! ملکہ کی اِس حالت کے سُننے سے چھاتی پھٹتی ہے اور اس کے بھولے بھالے جی سے پُوچھا چاہیئے کیا کہتا ہوگا۔ غرض اس میدان میں بیٹھی خدا سے لو لگا رہی تھیں۔ سچ ہے جب کچھ بن نہیں آتا تو خدا ہی نظر آتا ہے۔ نہیں تو اپنی تدبیر میں ہر ایک شخص لقمان اور بو علی سینا ہے۔ اب خدا کے کارخانے کا تماشا دیکھیئے۔ اسی طرح تین دن رات صاف گزرے ملکہ کے مُنہ میں ایک کھیل اُڑ کر نہیں گئی وہ پھول سا بدن سُوکھ کر کانٹا ہو گیا اور کندن سا دمکتا ہوا رنگ ہلدی سا بن گیا۔ مُنہ میں پپڑی بندھ گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ مگر ایک دم اٹک رہا تھا۔ کہ وہ آتا جاتا تھا۔ جب تک سانس تب تک آس۔

بارے ایک درویش خضری صورت نورانی چہرہ روشن دل آکر پہنچا
اور ملکہ کو دیکھ کر بولا۔ اے بیٹی اگرچہ تیرا باپ بادشاہ ہے لیکن قسمت میں
یوں لکھا تھا۔ اب اس لڑکے کو اپنا خادم سمجھ۔ اور بیٹے پیدا ہوئے۔ اسے کارت
دل میں خیال رکھو۔ خدا خوب کرے گا۔ فقیر کے کچکول میں جو کچھ ٹکڑے بھیک سے
مانگے موجود تھے ملکہ کے روبرو رکھے اور پانی کی تلاش میں چلنے لگا۔ دیکھا
ایک کنواں ہے پر ڈول رسی نہیں۔ درخت سے پتے توڑ کر دونا
بنایا اور اپنی سیلی کھول کر اس سے باندھی اور پانی نکال کر لڑکے کو پلایا تو کچھ
ہوش آیا۔ اس مرد خدا نے بے کس دیکھ کر جان کر بہت تسلی دی اور خاطر
جمع کر کے آپ بھی رونے لگا۔ ملکہ نے جب اس کی دلداری بے حد دیکھی
تب اس کے مزاج کو بھی استقلال ہوا۔

اس روز سے پیرمرد نے یہ مقرر کیا کہ صبح کو بھیک مانگنے شہر میں نکل جاتا
جو ٹکڑا پارچہ پاتا لا کر ملکہ کو کھلاتا۔ اس طور سے تھوڑے دن گذرے۔ ایک
روز ملکہ نے سر میں تیل ڈالنے اور کنگھی چوٹی کرنے کا ارادہ کیا۔ جوں ہی موباف
کھولا چوٹی میں سے ایک موتی کا دانہ گول آبدار نکل پڑا۔ ملکہ نے فقیر کو دے
کر کہا۔ کہ اس کو شہر میں بیچ لا۔ وہ فقیر اس کو بیچ کر اس کی قیمت لایا۔
تب ملکہ نے حکم کیا۔ کہ ایک مکان موافق گذران کے یہاں بنواؤ۔ فقیر نے
کہا کہ اے بیٹی نیو دلوانے کی کھود کر تھوڑی مٹی جمع کرو۔ ایک دن پانی لا کر
گارا کر کے گھر کی بنیاد درست کر دوں گا۔ ملکہ نے اس کے کہنے کے مطابق
مٹی کھودنی شروع کی۔

جب ایک عمیق گڑھا کھودا گیا۔ زمین کے نیچے ایک دروازہ نمودار ہوا۔
ملکہ نے اس در کو صاف کیا۔ ایک بڑا گھر جواہر اور اشرفیوں سے معمور نظر
آیا۔ ملکہ نے چار پانچ لپ اشرفیوں کی لے کر بند کر دیا۔ اور مٹی اوپر سے
ہموار کر دی۔ اتنے میں فقیر آیا تو ملکہ نے کہا۔ راج معمار اور کاریگر اپنے کام

کے استاد اور مزدور جلد بلا لاؤ۔ جو اس زمین پر شاہانہ عمارت کہ طاق کسریٰ نے جفت ہو اور قصر نعمان سے سبقت لے جائے اور شہر پناہ اور قلعہ اور باغ اور باؤلی اور ایک مسافر خانہ کہ لاثانی ہو تیار کریں لیکن پہلے نقشہ کاغذ پر درست کر کے حضور میں لادیں جو پسند کیا جائے۔ فقیر نے ایسے کاریگر، کردہ کار ذی ہوش لا کر حاضر کئے۔ موافق فرمانے کے تعمیر عمارت کی ہونے لگی اور نوکر چاکر ہر ایک کارخانہ جات کی خاطر چن چن کر فہمیدہ اور بادیانت آدمی مقرر ہونے لگے۔ اس عمارت عالی شان کی خبر رفتہ رفتہ بادشاہ ظل سبحانی کو جو قبلہ گاہ ملکہ کے تھے پہنچی۔ سن کر متعجب ہوئے اور پوچھا یہ کون شخص ہے جس نے محلات بنانے شروع کر دیئے اور اس سے کوئی واقف نہیں تھا جو عرض کرتا۔ سبھوں نے کانوں پر ہاتھ دھرا اور کہا کوئی غلام واقف نہیں کہ اس کا بانی کون ہے۔

تب، بادشاہ نے ایک امیر کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میں مکانوں کو دیکھنے آیا چاہتا ہوں۔ اور یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کہاں کی شہزادی ہو اور کس خاندان سے ہو۔ یہ کیفیت دریافت کرنی اپنے تئیں منظور ہے۔ ملکہ نے جوں یہ خوشخبری سنی دل میں خوش ہو کر یہ عرضی لکھی۔ کہ جہاں پناہ بادشاہ سلامت حضور کی تشریف آوری کی خبر طرف غریب خانے کے سن کر نہایت خوشی حاصل ہوئی اور سبب عزت و حرمت کمترین کا ہوا زہے نصیب و زہے طالع اس مکان کے جہاں قدم مبارک کا نشان پڑے اور وہاں کے رہنے والوں پر امن و دولت سایہ گستری کرے اور نظر توجہ سے وہ دونوں سرفراز ہوں۔ یہ لونڈی امیدوار ہے۔ کہ کل پنجشنبہ مبارک دن ہے، اور میرے نزدیک بہتر نوروز سے ہے۔ اور صورت آپ کی مثل آفتاب کے ہے۔ تشریف لا کر اپنے نور سے اس ذرۂ بے مقدار کو قدوم منزلت بخشئے۔ اور جو کچھ اس عاجز سے میسر ہو سکے نوش جاں فرمائیے۔ یہ عین

غریب نوازی اور مسافر پروری ہے۔ زیادہ تعداد سے اور اس امیر کی بھی تواضع
کر کے رخصت کیا

بادشاہ نے عرضی پڑھ کر دلا بھیجا کہ ہم کے بہتری دعوت قبول کی انشاءاللہ
تشریف لاویں گے۔ ملکہ نے نوکروں اور پیادوں کا رواج چولہے سے کہا کہ دارم ایسا تیار ہو
کہ بادشاہ کھا کر نہایت محظوظ ہوں اور اعلیٰ درجہ کی خوب ذائقہ کی رکابیں
ہوں جو کھا کر خوش ہو کر جائیں۔ ملکہ نے نہایت سب قسم کے کھانے
سامنے بیٹھے۔ اتنے میں تیار ہو گئے جب شام ہوئی بادشاہ معہ تخت
پر سوار ہو کر ملکہ کے مکان کی طرف تشریف لے گئے۔ ملکہ اپنی خاص سہیلیوں
کو لے کر استقبال کو گئیں۔ جہاں ہی بادشاہ کے تخت پہ نظر پڑی آداب سے
مجرا بجا لانے کیا۔ یہ قاعدہ دیکھ کر بادشاہ کو اور زیادہ حیرت ہوئی اور
اسی انداز سے جلوس کر کے بادشاہ کو تخت مرصع پر لا بٹھایا۔ ملکہ نے سوا لاکھ
روپے کا چبوترہ تیار کرا رکھا تھا۔ اور ایک سو ایک کشتی جواہر و اشرفی اور
پشمینے کی اور ریشمی و طلائی اور زردوزی کی لگا رکھی تھی۔ اور دو زنجیر فیل
اور دس راس اسپ عراقی اور قیمتی مرصع ساز سے تیار کر رکھے تھے۔ نذر
گذارنے اور آپ دونو ہاتھ باندھے روبرو کھڑی رہی۔

بادشاہ نے محبت مہربانی سے پوچھا کہ تم کس ملک کی شہزادی ہو اور یہاں
کیوں کر آنا ہوا۔ ملکہ نے آداب بجا لا کر التماس کیا کہ یہ وہی لونڈی گنہگار ہے
جو غضب سلطانی کے باعث اس جنگل میں آئی اور یہ سارے کرشمے خدا کے
ہیں۔ جو آپ دیکھتے ہیں۔ یہ سنتے ہی بادشاہ کے خون نے جوش کیا۔ اٹھتے
ہی گلے سے لگایا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس کرسی پہ بیٹھنے کا حکم کیا۔ لیکن
بادشاہ حیران اور متعجب بیٹھے تھے فرمایا کہ بیگم سے کہو کہ شہزادیوں سمیت
جلد آویں۔ جب وہ آئیں اور پہچانا تو گلے مل کر خوب روئیں اور شکر کیا۔
ملکہ نے اپنی والدہ اور چھوٹی ہمشیروں کے پاس اتنا جواہر رکھا کہ تمام

عالم کا خزانہ اس کے پاسنگ میں نہ چڑھے۔ پھر بادشاہ نے سب کو پاس بٹھا کر خاصہ نوش جاں فرمایا۔ اور جب تک جہاں پناہ زندہ رہے۔ اسی طرح پر گذرانی کبھی آپ آتے اور کبھی ملکہ کو اپنے ساتھ محلوں میں لے جاتے۔ جب بادشاہ نے رحلت فرمائی سلطنت اس اقلیم کی ملکہ کو پہنچی کہ ان کے سوا دوسرا لائق کام کے نہ تھا۔

(میرامن دہلوی)

رجب علی بیگ سرور

رجب علی بیگ سرور ۱۲۰۰ھ میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم پائی۔ ۱۲۴۰ھ میں جلاوطن ہو کر کانپور پہنچے اور ۱۲۶۳ھ میں واجد علی شاہ نے درباری شعراء کے زمرے میں پچاس روپے ماہانہ پر داخل ہوئے۔ ۱۲۷۵ھ میں بادشاہ کے حکم سے شمشیر خانی کا ترجمہ "سرورِ سلطانی" کے نام سے کیا۔ اس کے بعد مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ کے بنارس مہاراجہ کے پاس چلے گئے۔ راجہ ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ ۱۲۸۶ھ میں انتقال کیا۔

"فسانۂ عجائب" سرور کا شاہکار ہے اس کے علاوہ شبستان سرور، گلزار سرور، شگوفۂ محبت وغیرہ بھی ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ سرور نے اپنی عبارت میں بے شمار عربی، فارسی ترکیبیں لا کر اور قافیہ بندی کے بکھیڑوں میں پڑ کر عبارت کو چیستان بنا دیا ہے۔ رنگینی عبارت آرائی، قافیہ پیمائی ان کا خاص رنگ ہے۔ غرض اپنے وقت کے اچھے انشاپرداز تھے۔

جانِ عالم کا طوطا

بلبلِ نوا سنج ہزار داستان وطوطیِ خامۂ زمزمہ سنج خوش بیان گلشنِ تقریر میں یوں چہکا ہے کہ بعد رسمِ شادی سیرِ شکار کی اجازت سواری کا حکم شاہ ذوی الاقتدار سے حاصل ہوا۔ گاہ گاہ شام و پگاہ جانِ عالم سوار ہونے لگا۔ ایک روز گذر اس کا گدڑی بازار میں ہوا۔ انبوہ کثیر حجم غفیر نظر آیا۔ اور غلغلۂ تحسین و آفرین از زمین تا چرخِ بریں بلند پایا۔ شہزادہ اُدھر متوجہ ہُوا۔ دیکھا ایک مردِ پیر نحیف، ستر اسی برس کا سن، نہایت ضعیف پنجرا ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔ اس میں ایک جانور مانند سکانِ جناں، سبز پوش، طائر بے مروّت، خانہ بدوش، با منقار گلنار۔ لطیفے لطیف و رنگین۔ اور نکتے قابلِ تعریف و نمکین مثالِ طوطیِ پس آئینہ بیان کرتا ہے۔

شہزادے کے دیکھتے ہی طوطا اپنے مالک سے بولا۔" اے شخص کہ کب بخت تیرا افلاس کے برجِ تیرہ سے نکلا۔ نصیب چمکا، طالعِ برسرِ یاری زمانہ آمادۂ مددگاری ہُوا۔ دیکھ ایسا شہزادہ حاتم شعار، ابرِ گہر بار متوجہ اس مشتِ پر، ذرۂ بے مقدار پر ہُوا ہے۔ وہ بیکار شئے، کارگاہِ بے ثبات میں ہوں جس کا طالب نہیں کہیں بجز اس کے کہ جانور ہوں اور بلّی کا کھاجا۔ مگر جو یہ نظرِ عنایت کرے ابھی تیرا ہاتھ پرزر ہو، دامن گہر سے بھرے۔ جانِ عالم نے جو یہ سخنِ ہوش ربا، کلمۂ حیرت افزا سُنے، طوطے عقل کے اُڑے۔ پنجرا اس طائر ہمہ دان دجالو سحر بیان کا ہاتھ میں لے کے مالک سے قیمت پوچھی۔

طوطے نے کہا ؎

کب لگتا ہے کوئی اس دل بے حال کا مول
سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول

"مگر جو حضور کی مرضی"۔ جانِ عالم نے لاکھ روپے حلعت کے، و عنایت کئے اور پنجرا ہاتھ میں لئے دولت سرا کو روانہ ہوا۔ گھر میں جا ماہ طلعت کو دکھا کے مصرع انشا کا پڑھا ہے۔

بازار ہم گئے تھے اک چوٹ مول لائے

طوطے نے شہزادے کو سخنانِ دلچسپ، قصص عجیب، حکایاتِ غریب، شعرِ خوب، خمسہ ہائے مرغوب سنا اپنے دامِ محبت میں اسیر کیا۔ یہ نوبت پہنچی کہ سونے جاگنے دربار کے سوا جدا نہ ہوتا۔ جب دربار جاتا پنجرا بتاکید حفاظت ماہ طلعت کو سونپ جاتا اور دربار سے دیوانہ وار لشوقِ گفتار بے قرار جلد پھر آتا۔

ایک دن شہزادہ دربار گیا۔ طوطا محل میں رہا۔ اس روز ماہ طلعت نے غسل کیا۔ اور لباسِ تکلّف سے جسم آراستہ، زیورِ پر تکلّف سے پیراستہ ہو، آئینہ لگا کرسی پہ بیٹھی۔ ہوا جو لگی، آئینے میں صورت دیکھ خود محوِ تماشائی ہوئی۔ بہر عجب و نخوت میں آشنا ہوئی۔ خواصوں اور جلیسوں سے جو ہمدم و دمساز، محرمِ راز تھیں اپنے حسنِ خدا داد کی داد چاہی۔ ہر ایک نے موافقِ عقل و شعور تعریف کی۔ کسی نے کہا، ہلالِ عید ہو۔ کوئی بولی خدا جانتا ہے۔ دیدہ ہو نہ شنیدہ ہو۔ اللہ نے بایں کثرتِ مخلوقات تمہارا ہمسر از قسمِ جن و بشر بنایا نہیں۔ پری نے یہ قدِ بالا، حور نے یہ حسن کا جھمکڑا پایا نہیں۔ جب وہ کہہ چکیں ماہ طلعت نے کہا "طوطا بہت عقلمند، ذی شعور، سیاح نزدیک و دور ہے۔ اس سے بھی پوچھنا ضرور ہے"۔ مخاطب ہوئی کہ اے مرغِ خوش خو، طائرِ زمرد لباس سرخ رو بذلہ سنج، بے رنج! سچ کہنا۔ اس سج دھج کی صورت کبھی تیرے وہم و خیال کی نظر سے گزری ہے؟ اس وقت طوطا رنجیدہ دل کبیدہ خاطر مضمحل بیٹھا تھا۔ چپ ہو رہا۔ شہزادی نے پھر پوچھا طوطے نے بے اعتنائی۔

"شاید ایسا ہی ہو"۔ یہ زندگی برہم ہو کے بولی: "میاں مٹھو! جینے سے خفا ہو جو ہمارے روبرو چہاچہا کر گفتگو کرتے ہو"۔ طوطے نے کہا "سوال دیجیے اور دھمکانا اور حکومت سے ڈرانا، غصے کی آنکھ دکھانا اور ہے۔ کیوں الجھتی ہو، شاید نہیں سچی ہو"۔ پھر تو شعلۂ غضب کا سینۂ شہزادی میں مشتعل ہوا۔ کہا "کیوں جانور، بے تمیز، نا چیز، تیری موت آئی ہے؟ کیا بیہودہ تیں تیں مچائی ہے۔ واہی بک رہا ہے۔ ہمارا مرتبہ نہیں سمجھتا ہے؟" طوطے کے منہ سے نکلا "کیوں اتنی خفا ہوتی ہو، اپنا منہ ملاحظہ کرو۔ صاحب! تم بڑی خوبصورت ہو، یہاں تو یہ حسن بھی تھی کہ جان عالم تشریف فرما ہوں۔ عجب صحبت دیکھی کہ شہزادی کا تمام رب دبا دل کباب غیظ میں آ۔ نظر بھر ہم ستمگار اسی وحشی کی اور آپ ودا۔ نفس بینا کھانا پانی تھا۔ اگر آپ اور گھڑی بھر دیر لگاتے۔ تشریف نہ لاتے تو میرا طائر روح گربۂ غضب شہزادی سے مجروح ہو کر پرواز کرتا۔ ہرگز جیتا نہ پاتے"۔

ماہ طلعت ان باتوں سے زیادہ مکدر ہوئی۔ شہزادے سے کہا "اگر میری بات کا طوطا صاف جواب نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ، پَر نوچ کر اس کی آنکھیں لوں گی۔ جب دانہ پانی کھاؤں گی"۔ جان عالم نے کہا "کچھ برائی تو کہو"۔ طوطے نے گذارش کی "حضور! یہ مقدمہ غلام سے سنیئے۔ آج شہزادی صاحبہ اپنی دانست میں بہت نکھر کے

دیکھ آئینے کو کہتی تھی کہ اللہ رے میں!

مجھ سے پھر فرمایا "تو نے ایسی صورت کبھی دیکھی ہے"؟ مجھ اجل رسیدہ کے منہ سے نکلا "خدا نہ کرے"۔ اس جرم قبیح پہ شہزادی کے نزدیک کشتنی، سوختنی، گردن زدنی ہوں۔ بقول میر تقی ؎

بے جرم نہ تیغ ہی رکھا تھا گلے کو!
کچھ بات بری منہ سے نہ نکلی تھی بھلے کو

جانِ عالم نے کہا "تم بھی کتنی عقل سے خالی، حمق سے بھری ہو۔ تم تو پہری ہو جانور کی بات پہ اتنا آزردہ ہونا۔ گویا بے ایک بے طائر ہے۔" میاں مٹھو کو ان باتوں کی تاب نہ آئی آنکھیں بدل کر روکھی صورت بنائی اور تیں سے بولا "خداوند نعمت! جھوٹ جھوٹ ہے۔ سچ سچ ہے۔ ہمیشہ سچ کا بول بالا نہیں ہے۔ وہ ذات وحدہٗ لاشریک کی ہے۔ اس کے سوا ایک سے ایک بہتر و بہتر ہے۔ میں نے تو دونوں سے زیج کر ایک کا کہا تھا۔ اگر راستی پہ ہونا گردن کج کے لئے سیدھا کو میں سونا۔ یہ سُن کر وہ اور بگڑ ہوئی۔ سچ مشہور ہے "راسخ مت تریا ہٹ، بالک ہٹ۔" جانِ عالم نے بور ہو کے کہا "جو ہو سو ہو، مٹھو پیارے سچ کہہ دو" طوطے نے منت عرض کی "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔ مجھ سے سچ نہ بلوائیے۔ میرا منہ نہ کھلوائیے۔ نہیں انجامِ راستی حضور کے دشمنوں کو شکست نوردی، بابا ہی پیمائی، غریب الوطنی، کوچہ گردی نصیب ہوگی۔" شہزادے نے کہا "یہ حیلہ تم نے اور نیا سنایا، اب جو کچھ کہنا ہے، کہہ چاہئے۔ باتیں نہ بنائیے" ...... اس نے کہا "میں نے ہر چند چاہا۔ آپ رنج سفر سے باز رہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ عدم میں حضور کے یہ امر لکھا ہے۔ میرا قصور اس میں کیا ہے؟ سعہ

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں کرنا رفو
سوزنِ تدبیر گو ساری عمر سیتی رہے

سنئے قبلۂ عالم! یہاں سے برس دن کی راہ شمال میں ایک ملک ہے۔ عجائب زرنگار۔ ایسا خطہ ہے کہ مرقعِ خیال مانی و بہزاد میں نہ کھچا ہوگا۔ اور پیرِ دہقان فلک نے مزرعۂ عالم میں نہ دیکھا ہوگا۔ شہر خوب آبادی مرغوب۔ خورشید ہر شو اس کے دروازے سے ضیا پاتا ہے۔ بدر کامل اس شہر میں غیرت سے کاہیدہ ہو ہلال نظر آتا ہے۔ وہاں کی شہزادی ہے۔ انجمن آرا۔ اس کا تو کیا کہنا۔ کہاں میری زبان میں طاقت اور دہان میں طلاقت جو شمہ

مذکور شکل و شمائل اس زہرہ جبین۔ فخر لعبتان لندن و چین کا سناؤں سہ

ایک ہیں کیا خوب! اگر دیکھے اسے حُسن آزریں
اپنی صنّاعی پہ حیراں خود وہ صورت گر رہے

لیکن سات سَو خواص زرّیں کمر، تاج دلبری بر سر، ماہرو عنبریں مُو، سرگروہِ خوبان جہاں، جانان جاں، آرام دل مشتاقاں اس کی خدمت میں شب و روز سرگرم خدمت گزاری بڑی تیاری سے رہتی ہیں۔ اگر اُن کی لونڈیوں کو شہزادی صاحبہ بنظر انصاف دیکھیں، اور غیرت کو بھی کام فرمائیں تو یقین ہے چُلّو بھر پانی میں محجوب ہو کر ڈوب جائیں"۔ ماہ طلعت یہ سُن کر سُن ہوئی اور سر جُھکا لیا ؛

سر سید احمد خاں

اردو زبان کے پہلے ادیب تھے جنہوں نے قومی، ملکی، مذہبی، معاشرتی، اصلاحی، اخلاقی، علمی اور ادبی تحریروں میں بے ساختگی، جوش، اعتدال، متانت و ظرافت، اردو زبان و محاورہ کے ذریعے ثابت کر دیا کہ اردو میں ہر قسم کے مضامین ادا کرنے کی قابلیت ہے۔ سید احمد خاں ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ شاہجہاں کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے۔ ننھیال کی طرف سے خواجہ فرید کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

سر سید کی والدہ نہایت دانشمند اور نیک دل خاتون تھیں۔ ان کی تربیت و اخلاق کا سر سید کی زندگی اور سیرت پر گہرا اثر پڑا۔ سر سید شروع میں پڑھائی پر تو زیادہ توجہ نہ دیتے تھے۔ مگر انہیں مطالعہ کا بے انتہا شوق تھا اور اکثر وقت اس زمانے کے نامور لوگوں کی صحبت میں گذارتے۔

لیکن ملازم ہونے کے بعد تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اس محنت کا یہ نتیجہ تھا کہ بڑا نام پایا۔ علم و ادب کی خدمت کے علاوہ انہوں نے قوم کی بہترین خدمات انجام دیں۔ علی گڑھ کالج کے بانی تھے۔ اس زمانے کے علماء نے انگریزی پڑھنا گناہ قرار دے رکھا تھا لیکن آپ نے مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے قوم کو انگریزی پڑھنے کی طرف توجہ دلائی۔ اور حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کی موجودہ تعلیم محض سر سید کی مساعی کی مرہونِ منت ہے۔

سر سید ملازم ہو کر بلند سے بلند مدارج پر پہنچے۔ سرکاری کام کے باوجود تصنیف و تالیف کا شغل برابر جاری رہا۔ اور بے شمار کتابیں لکھ ڈالیں۔ پبلک جلسوں میں تقریریں کرنا بھی سر سید کا ایجاد ہے۔

تعصّب

انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے۔ یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اُس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے۔ مگر اُس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسان سے ہے اُس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اُس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیونکہ اُس کا تعصب اُس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اُس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اُس کے فائدے اور نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا۔ کیونکہ اُس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔

تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے۔ اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے۔ مگر صرف تعصب سے اُس کو اختیار نہیں کرتا۔ اور دیدہ و دانستہ بُرائی میں گرفتار اور بھلائی سے بیزار رہتا ہے۔

مذہبی تعصبات کی نسبت بھی کچھ تھوڑا سا بیان کریں گے مگر اوّل امور تمدن و معاشرت میں جو نقصان تعصب سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کا ذکر کرتے ہیں

انسان قواعد قدرت کے مطابق مدنی الطبع پیدا ہوا ہے۔ وہ تنہا اپنی حوائج ضروری کو مہیا نہیں کر سکتا۔ اس کو ہمیشہ مددگاروں اور معاونوں کی جو دوستی اور محبت سے ہاتھ آتے ہیں ضرورت ہوتی ہے۔ مگر متعصب بسبب اپنے تعصب کے تمام لوگوں سے منحرف اور بیزار رہتا ہے۔ اور کسی کی دوستی اور محبت کی طرف بجز

اُن نیک لوگوں کے جو اُس کے ہم رائے ہیں مائل نہیں ہوتا۔

عقل اور قوت اور قدرت کا مقتضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ امور متعلق تمدن و معاشرت میں جو باتیں زیادہ آرام اور زیادہ لیاقت اور زیادہ عزت کی ہیں اُن کو انسان اختیار کرے مگر متعصب اُن سب نعمتوں سے محروم رہتا ہے۔

ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت ترقی دے کر حاصل کرنا چاہیے مگر تعصب اپنی بد خصلت سے ہر ایک ہنر و فن و علم کے اعلیٰ درجہ تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔

وہ اُن تمام دلچسپ اور مفید باتوں سے جو نئی تحقیقات سے اور نئے علوم و فنون سے حاصل ہوتی ہیں محض جاہل اور ناواقف رہتا ہے اُس کی عقل اور اُس کے دماغ کی قوت محض بیکار رہ جاتی ہے اور جو کچھ اُس میں سمائی ہوئی ہے اُس کے سوا اور کسی بات کے سمجھنے کی اُس میں طاقت اور قوت نہیں رہتی وہ ایک ایسے جانور کے مانند ہو جاتا ہے اُس کو جو کچھ بالطبع آتا ہے اُس کے سوا اور کسی چیز کی تعلیم و تربیت کے قابل نہیں ہوتا۔

بہت سی قومیں ہیں جو اپنے تعصب کے باعث تمام باتوں میں کیا اخلاق میں اور کیا علم و ہنر میں اور کیا فضل و دانش میں اور کیا تہذیب و شائستگی میں اور کیا جاہ و حشمت اور مال و دولت میں اعلیٰ درجہ سے نہایت پست درجہ ذلت اور خواری کو پہنچ گئی ہیں اور بہت سی قومیں ہیں جنہوں نے اپنی بے تعصبی سے ہر جگہ اور ہر قوم سے اچھی اچھی باتیں اخذ کیں اور ادنےٰ درجہ سے ترقی کے اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ پر پہنچ گئیں۔

مجھ کو اپنے ملک کے بھائیوں پر اس بات کی بدگمانی ہے کہ وہ بھی تعصب کی بد خصلت میں گرفتار ہیں اور اس سبب سے ہزاروں قسم کی بھلائیوں کے حاصل کرنے سے اور دُنیا میں اپنے تئیں ایک معزز قوم کو دکھلانے سے محروم اور ذلت اور خواری اور بے علمی اور بے ہنری کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ اور اسی لئے میری خواہش

ہے کہ وہ اس بدخصلت سے نکلیں اور علم وفضل اور ہنر وکمال کے اعلیٰ درجہ کی عزت تک پہنچیں۔

ہم مسلمانوں میں ایک غلطی یہ بڑی ہے کہ بعض دفعہ ایک غلط نانیک کے جذبہ سے تعصب کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اور جو شخص اپنے مذہب میں بڑا متعصب ہو اور تمام شخصوں کو جو اس کے مذہب کے نہیں ہیں اور تمام ان علوم وفنون کو جو اس مذہب کے لوگوں میں نہیں ہیں نہایت حقارت سے دیکھے اور برا سمجھے۔ اس شخص کو نہایت قابل تعریف اور توصیف کے اور بڑا پختہ اور پکا اپنے مذہب میں سمجھتے ہیں مگر ایسا سمجھنا سب سے بڑی غلطی ہے جس نے حقیقت میں مسلمانوں کو برباد کر دیا ہے۔

ہمارا مذہب اور مذہبی علوم اور دنیا اور دنیاوی علوم بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ چیزیں ہیں پس بڑی نادانی ہے جو دنیاوی علوم اور فنون کے سیکھنے میں کسی قسم کے تعصب مذہبی کو کام میں لاویں۔

اگر یہ خیال ہو کہ ان دنیاوی علوم کے سیکھنے سے ہمارے عقائد مذہبی میں سستی آتی ہے کیونکہ مذہبی مسائل ان دنیاوی علوم کے پڑھنے سے مشتبہ یا غلط معلوم ہوتے ہیں تو نہایت ہی افسوس کا مقام ہے کہ مسلمان اپنے ایسے روشن اور مستحکم سچے مذہب کو ایسا ضعیف اور کمزور سمجھتے ہیں کہ دنیاوی علوم کی ترقی سے اس کی برہمی کا خیال کرتے ہیں۔ مذہب اسلام ایسا مستحکم اور سچا مذہب ہے کہ جس قدر دینی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوتی جاوے گی اسی قدر اس کی سچائی زیادہ تر ثابت ہوگی۔

اب ہم یہ بات بتاتے ہیں کہ اپنے مذہب میں پختہ ہونا جدا بات ہے اور یہ ایک نہایت عمدہ صفت ہے۔ جو کسی اہل مذہب کے لئے ہو سکتی ہے اور تعصب گو کہ وہ مذہبی باتوں میں کیوں نہ ہو نہایت برا اور خود مذہب کو نقصان پہنچانے والا ہے۔

غیر متعصب مگر اپنے مذہب میں پختہ ہمیشہ سچے اور دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے اس کی خوبیوں اور نیکیوں کو پھیلاتا ہے اس کے اصولوں کو دلائل سے ثابت کرتا ہے مخالفوں اور معترضوں اور شک کرنے والوں کی باتوں کو ٹھنڈے دل سے سنتا ہے اور خود بھی اس کے دفعیہ پر مستعد ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کے دفعیہ کا موقع دیتا ہے

برخلاف اس کے متعصب نادان دوست اپنے مذہب کا ہوتا ہے وہ اپنی نادانی سے اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے پہلے تو ایسی بدخصلت اختیار کرنے سے جو ہر عقلمند کے نزدیک مذمت کے قابل ہے اپنے مذہب کے حسن اخلاق اور اس کے نتیجوں کی خوبی پر داغ لگاتا ہے اپنے مذہب کی خوبیوں کے پھیلنے اور لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنے کے بدلے الٹا اس کا حارج قوی ہوتا ہے اپنے تعصب کے سبب بد اخلاق اور مغرور اور متعصب سخت دل ہو جاتا ہے اور ٹھیک مصداق اس آیت کا بن کر ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك سے مخالفت صریح کرتا ہے۔

مذہب میں متعصب شخص دوسروں کے اعتراضوں کو جو اس کے مذہب پر ہیں سننا یا مشہور ہونا پسند نہیں کرتا اور اس سبب سے ضمناً وہ اس بات کا باعث ہوتا ہے کہ مخالفوں کے اعتراض بلا تحقیقات کئے اور بلا جواب دیئے باقی رہ جاویں اور وہ اپنی نادانی سے تمام دنیا پر گویا یہ بات ظاہر کرتا ہے کہ اس کے مذہب کو مخالفوں کے اعتراضوں سے نہایت اندیشہ اور اس کے برہم ہو جانے کا خوف ہے پس یہ تمام باتیں مذہب کی دوستی کی نہیں بلکہ مخالفوں کی فتح یابی اور میدان جیت لینے کی ہیں۔

غرضکہ تعصب خواہ دینی باتوں میں ہو یا دنیاوی باتوں میں نہایت برا اور بہت سی خرابیوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

مغرور اور متکبر ہو جانا اور اپنے ہم جنسوں کو سوائے چند کے نہایت حقیر

و ذلیل سمجھنا متعصب کا خاصہ ہوتا ہے۔

اُس کے اصولوں کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ تمام دُنیا کے لوگوں سے سوائے چند کے کنارہ گزیں ہو مگر ایسا کر نہیں سکتا اور مجبوری ہر ایک سے ملتا ہے اور ناچار دل سے ان کا ادب اور اپنی جھوٹی نیازمندی بھی ظاہر کرتا ہے اور ایسا کرنے سے ایک بدخصلت نفاق اور کذب اور دغا بازی اور فریب و مکاری کی اپنے میں پیدا کرتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے خود ہی تمام کمالات اور تمام خوبیاں اور خوشیاں حاصل کی ہوں۔ بلکہ ہمیشہ ایک قوم نے دوسری قوم سے فائدہ اُٹھایا ہے مگر متعصب شخص ان نعمتوں سے بدنصیب رہتا ہے۔

علم میں اُس کی ترقی نہیں ہوتی۔ ہنر و فن میں اُس کو دستگاہ نہیں ہوتی۔ دنیا کے حالات سے وہ ناواقف رہتا ہے۔ عجائبات قدرت کے دیکھنے سے محروم ہوتا ہے۔ حصول معاش اور دنیاوی عزت اور تمدن مثل تجارت وغیرہ کے وسیلے جاتے رہتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ تمام دنیا کے انسانوں میں روز بروز ذلیل و خوار اور حقیر و ناچیز ہوتا جاتا ہے۔

اُس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اُس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں۔ بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے۔ بیا کیا بن رہا ہے اور مکھی کیا چن رہی ہے۔

وہ بجز کوڑے پر کی گھاس کے چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے۔ نرگس کیا دیکھتی ہے۔ اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے۔

تعصب میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ جب تک وہ نہیں جاتا کوئی ہنر و کمال اُس میں نہیں آتا۔ تربیت اور شائستگی۔ تہذیب و انسانیت کا مطلق نشان نہیں پایا جاتا۔ اور جب کہ وہ مذہبی غلط نمائیگی کے پردے میں ظہور کرتا ہے تو اور بھی سم قاتل ہوتا ہے۔ کیونکہ مذہب سے اور تعصب سے کچھ تعلق نہیں ہے۔

انسان کو خراب و برباد کرنے کے لئے شیطان کا سب سے بڑا داؤں تعصب اور مذہبی نفرت سے دل میں ڈالنا اور اس تاریکی کے فرشتہ کو روشنی کا فرشتہ کر کے دکھانا ہے۔

پس میری التجا اپنے بھائیوں سے یہ ہے کہ ہمارا خدا نہایت مہربان اور بہت بڑا منصف ہے اور سچائی کا پسند کرنے والا ہے وہ ہمارے دلوں کے بھید جانتا ہے وہ ہماری نیتوں کو پہچانتا ہے۔ پس ہم کو اپنے مذہب میں نہایت سچائی سے پختہ رہنا مگر تعصب کو جو ایک بُری خصلت ہے چھوڑنا چاہیئے تمام بنی نوع انسان ہمارے بھائی ہیں۔ ہم کو سب سے محبت اور سچا معاملہ رکھنا، سب سے سچی دوستی اور سب کی سچی خیرخواہی کرنا ہمارا فرض ہے پس اسی کی ہم کو پیروی چاہیئے۔

ڈاکٹر سر سید مرحوم

محسن الملک محمد مہدی علی خان

محسن الملک نواب محمد مہدی علی خان یو۔پی۔ کے کرنگا شہر اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ اپنی ہمت اور قابلیت سے دس روپے ماہوار کی نوکری سے شروع ہوئے۔ اور بڑے سے بڑے عہدہ پر پہنچے۔ اور حضور نظام سے محسن الدولہ محسن الملک کا خطاب حاصل کیا۔

جب سرسید نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا تو نواب صاحب نے اس میں جامع اور مدلل مضامین لکھنے شروع کیے جن کے باعث اردو ادب میں انہیں ایک امتیاز حاصل ہو گیا، سرسید مرحوم کی طرح نواب محسن الملک کو بھی اردو زبان میں ناقابلِ فراموش حیثیت حاصل ہے ؛

اسلام

تمام متکلمین اور حکما کا قول ہے - کہ حقائق الاشیاء ثابتہ یعنی ہر چیز اپنی ذات ایک حقیقت اور ماہیت ہے - اور انہیں کا یہ مقولہ ہے - کہ تقلیب الماہیت محال یعنی ماہیت کا بدل جانا عقلاً محال ہے - اور جو شے عقلاً محال ہو - اس کا واقع بھی ہونا غیر ممکن -

پس اگر ہم کسی شے کی حقیقت کو جانتے ہوں - لیکن اس کو اس کی ماہیت سے بدلا ہوا پائیں یعنی جو اس کی ذاتی حقیقت اور ہمیں معلوم تھی - اس میں فرق دیکھیں - تو ہم کو لازم ہے کہ ہم اس کا سبب دریافت کریں - اور ان عوارضِ خارجی اور اسبابِ عارضی کی تحقیقات پر متوجہ ہوں جن کے سبب سے اس کی ماہیت ہماری نظروں میں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے ہر شے کی ماہیت ثابت اور قائم رہنے کے لئے ضرور ہے - کہ وہ اپنی اصلی حالت پر باقی رہے - اور کوئی دوسری شے اس میں نہ ملے - ورنہ جہاں ترکیب اور اختلاط نے راہ پائی - اور اشیائے مختلف ایک دوسری سے ملیں - تو پھر اشیائے مختلف کی ماہیت کا دریافت کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور اختلاط سے جس نے ان چیزوں کی حالت اصلی کو بدل دیا - شبہ تقلیب ماہیت کا ہوتا ہے -

ہر شے فی نفسہٖ اپنی ماہیت اور حقیقت میں جدا جدا ہے - اور کسی دو چیز کی ایک ماہیت نہیں ہے - اس لئے کہ جب تک ماہیت دوسری نہ ہوگی - تب تک وہ شے دوسری نہ کہلائے گی - پس جب دو چیزیں کہ لامحالہ فی ذاتہٖ جداگانہ ماہیت رکھتی ہونگی باہم ملیں گی - تو ان کے اختلاط سے دونوں کی ماہیت ایک نہ ہو جائے گی گمان کی ترکیب باہمی سے ان اشیائے مختلفہ کا ایک رکھ دیا جائے - اصل میں دونوں چیزیں اپنی جداگانہ ماہیت پر باقی رہیں گی - اور اس ترکیب سے اُن

کی حقیقت میں کچھ فرق نہ آئے گا۔

لیکن ترکیب اور اختلاط کے سبب سے اُن اشیائے مختلفہ کی ہیئتِ ظاہری ایسی بدل جائے گی کہ ان کے ہر اجزائے منفردہ یعنی ہر شے جداگانہ کی حقیقت کا دریافت کرنا نہایت دشوار اور قریب بہ محال ہوگا۔ اور پھر جب تک کہ وہ ترکیب، کسی عمدہ تدبیر سے دُور نہ کی جائے۔ اور ہر شے اپنی اصلی حالت پر نہ لائی جائے تب تک ماہیت کا دریافت کرنا احاطۂ امکان سے خارج ہوگا۔

پس اگر ہم کسی شے کی حقیقت دریافت کرنے پر مستعد ہوں۔ تو پہلا کام ہمارا یہ ہے کہ ہم اس حالتِ موجودہ پر نظر کریں۔ کہ آیا وُہ اپنی اصلی حالت پر باقی ہے۔ یا کہ اور چیزیں بھی اس میں ملی ہوئی ہیں۔ اگر ہم اور چیزوں کا میل اُس میں پائیں۔ تو دوسرا کام ہمارا یہ ہوگا۔ کہ ان چیزوں کو جُدا کرکے اس شے سے علیحدہ کرکے اس کی اصلی حالت پر لے آنے کا قصد کریں اور جبکہ ہم اس شے کے اور چیزوں کے جُدا کرنے کا قصد کریں تو تیسرا کام ہمارا یہ ہوگا کہ ہم اس آلہ او ذریعہ کو پیدا کریں جس سے وہ اختلاط کی صورت دور ہو سکے اگر ہم اپنے ان تینوں کاموں میں غلطی نہ کریں گے۔ تو ضرور اس شے کی حقیقت دریافت کرسکیں گے۔

جب ہم کسی چیز کے حُسن و قبح کی تحقیقات پر آمادہ ہوں۔ تو ہم کو لازم ہے کہ پہلے ہم اس شے کی حقیقت جس طرح اُوپر ہم نے بیان کی ثابت کرلیں۔ بعد اس کے اپنی رائے اس شے کی بُرائی بھلائی کی نسبت قائم کریں۔ ورنہ اگر ہم بغیر دریافت کرنے اس کی حقیقت کے کسی مرکب شے کو جوہرِ مجرد سمجھ کر اس پر اپنی رائے قائم کریں گے۔ تو ہم غلطی اور دھوکے میں رہیں گے۔ اور وہ رائے ہماری نسبت اُس شے کے نہ ہوگی۔ بلکہ نسبت اُن اشیائے مختلفہ کے ہوگی۔ جن کو اختلاط نے ظاہر میں ایک کردیا ہے۔

جب ہم موجوداتِ خارجی میں سے کسی کو دیکھتے ہیں۔ تو سرسری نظر میں ہم کو ہر شے بسیط معلوم ہوتی ہے۔ اور ہماری پہلی نگاہ اس کی ترکیب اور اختلاط پر

نہیں جاتی۔ لیکن جس قدر ہم غور کرتے جاتے ہیں۔ اُسی قدر ہم کو اس کے اجزائے ترکیبی کی کیفیت معلوم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر ہم کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ کوئی شے ان میں سے جوہر بسیط اور مجرد محض نہیں ہے۔ اور سب میں اشیائے متضادہ ملی ہوئی ہیں۔ آخر ہم کو اس آلہ یا ذریعہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ جس سے اس ترکیب کو باطل کر کے ہر شے کو جدا جدا کر دیں۔

جو کیفیت ہم نے اعیان موجودات کی بیان کی۔ وہی حال ہماری مدرکات اور معلومات اور معتقدات کا ہے۔ کہ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم جانتے ہیں اور جو کچھ ہم مانتے ہیں۔ اس کی نسبت صحت اور سچائی کا یقین نہیں کر سکتے۔ اور اس کو غلطی اور خطا اور وہم اور شک کی آمیزش سے خالی نہیں کہہ سکتے۔ جب تک کہ ہم اس کو کسی سچے ذریعہ اور کامل آلہ سے جانچ نہ کریں اور اس کے اجزاء مرکبہ کو علیحدہ علیحدہ کر کے نہ دیکھ لیں۔ پس جس طرح موجوداتِ خارجی میں سے کسی شے کی حقیقت کے جاننے کا دعویٰ کرنا بغیر اس کے کہ اس کو اپنی اصلی حالت پر لا کر امتحان کر لیں نادانی ہے۔ اسی طرح ہم کو اپنے معتقدات میں سے کسی اعتقاد کی صحت پر یقین کرنا قبل اس سے کہ ہم اس کو توہمات اور خیالات سے جدا کر دیں بڑی غلطی ہے۔

جیسے کہ ہم کو کسی موجودات کی حقیقت معلوم کرنے پر یقین نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم نے خود اس کو مذکورہ تدبیروں سے نہ جانچا ہو۔ اسی طرح ہم کو اپنے معتقدات کی صحت پر اعتقاد کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہم نے بذاتہ اُس کو اسی طرح دریافت نہ کیا ہو۔ اور اگر ہم نے ایسا کر لیا ہو تو پھر ہمارا اعتقاد بھی صحیح ہو گا۔ اور اس پر ہم کو یقین بھی ایسا ہو گا۔ کہ گو ساری دُنیا ہماری مخالف ہو اور تمام جہان ہم کو مجنون اور دیوانہ بنا دے۔ مگر ہمارے اس یقین اور اعتقاد میں کچھ خلل نہ ہو گا۔

بغیر اپنی ذاتی تحقیقات اور جانچ کے جو کچھ ہم سمجھیں اور جو کچھ اعتقاد

کہ یہ وہ صرف سُنا ہوا ہوگا۔ اور کبھی غلطی کے احتمال سے محفوظ نہ رہے گا اور اطمینان قلبی جس شے کا نام ہے۔ وہ کبھی حاصل نہ ہوگی۔ ہماری مثال ٹھیک ٹھیک ایک اندھے کی ہوگی جس کو کوئی ہاتھ پکڑ ے لئے جاتا ہو کہ بد قسمت سے راہ بتانے والا پھسل گیا خیر ہت گذری۔ ورنہ کسی گڑھے غار میں گر کر مٹی خراب ہوئی۔

تحقیق کرنے والے کو ہر چیز کی تحقیقات کے لیئے ضرور ہے کہ جو کچھ لوگوں سے اس کی حقیقت کی نسبت سُنا ہو یا جو کچھ اس نے خود سمجھ رکھا ہو۔ اس سے اول اپنے دماغ کو خالی کرے اور کسی کی حقیقت اور صحت پر پہلے سے یقین نہ کرے اس لئے کہ اگر وہ ایسا کرے گا تو یا تحقیقات کرنے پر اس کو توجہ نہ ہوگی اس لئے کہ وہ اپنے خیالات کو یقینات سمجھ کر اپنے آپ کو مستغنی سمجھے گا یا تحقیقات کرتے وقت اس کو توہمات اور خطرات ایسے پیدا ہوں گے۔ کہ وہ اس کی تحقیق میں خلل ڈالیں گے۔

ایسی تحقیقات کرنے والے کو چاہیئے کہ وہ اُن سب باتوں کو جو لوگوں سے سُنی ہوں۔ یا جو کچھ اس کے دل میں گذری ہوں پیش نظر رکھے اور بغیر پیدا کرنے یقین کے کسی پر وہ اُن کی تحقیق بذریعہ اس آلہ اور ذریعہ کے جو اس کے امتحان کے لیئے ہوا کرے ظاہر نہ کرے تا آنکہ اس کو خود معلوم ہو جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا۔

تمثیلاً ہم بیان کرتے ہیں۔ کہ حکمائے یونان کا قول تھا۔ کہ عناصر چار ہیں جن کا نام اُن کی اصطلاح میں اسطقسات اربعہ تھا۔ اور اُن کے جوہر بسیط ہونے پر ہزارہا آدمی معتقد تھے اور ہزاروں برس سے اب تک معتقد ہیں۔ اور اب حکمائے یورپ کا قول ہے کہ وہ مرکب ہیں پس ہم جس کی بات کو بغیر امتحان اور جانچ کے مانیں گے وہ فی نفسہٖ صحیح ہو۔ مگر ہمارا بے جانچ مان لینا ہی ہماری غلطی ہے۔ اس لئے ہم کو لازم ہے۔ کہ ہم دونوں کے دلائل سُنیں

اور جو ذریعے ان کی ماہیت اور ان کے خواص دریافت کرنے کے دونوں کے پاس ہوں ان کو خود استعمال کریں ... تو ہم خود یقین کر لیں گے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا اور اگر یہ دیکھ کر کہ ایک کا قول تو بیان ... نہیں اور دوسرے کی بات تک نہ سنیں - تو ہم درحقیقت جاہل بلکہ جہل مرکب میں گرفتار سمجھے جائیں گے اور گو وہ قول حسن اتفاق سے سچ نکلے ... بہت ہی ... ہم مستحق اور دھوکا میں پڑے ہونے سے ہر منصف کے نزدیک ... جاہل ٹھہریں گے ۔

ان مقدمات کی ترتیب و تمہید سے مطلب ہمارا یہ ہے کہ قوم کی موجودہ حالت پر غور کیا جاوے اور اس کی حقیقت اور ماہیت دریافت کرنا ہے۔ پس ہم اس حالت موجودہ کو ایک شے قرار دیتے ہیں - جو نام سے اسلام کے متعارف ہے اور سرسری نظر میں سے وہ تمامی جانی جاتی ہے اور ہمارے تمام عقائد اور اعمال و حرکات و سکنات اور چال و چلن پر مسلمانی کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے - لیکن غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے - کہ وہ ہزاروں اجزاء سے مرکب اور بے شمار چیزوں سے مختلط ہے اور وہ جوہر نورانی جس کا نام اسلام ہے اور جو فی ذاتہ ہر برائی سے پاک اور ہر تیرگی سے صاف ہے۔ اجزائے کثیفہ کے مل جانے سے مکدر اور تاریک ہو رہا ہے اور اس کا اصلی نور اس تکدر کے سبب سے چھپ گیا ہے ۔

ہر ملک میں عرب سے لے کر ہندستان تک اور ہر قوم میں سادات و شیوخ سے لے کر محترفہ بازاری تک اور ہر مذہب میں اہل سنت سے لے کر معتزلہ تک اور ہر فریق میں علماء سے جہلاء تک اس نورانی جوہر کا جدا گانہ جلوہ دکھائی دیتا ہے - اور اس کُلی طبعی کا مضمون ہر فرد میں ایک علیحدہ طور سے نظر آتا ہے پس جو شخص سرسری نگاہ سے دیکھتا ہے - وہ اِن سب کو ایک ہی شے جان کر اس کو اسلام سے تعبیر کرتا ہے اور ہمارے عقائد اور رسمیات کو اصل اسلام سمجھ کر اُن کے حسن و قبح سے بحث کرتا ہے ۔

پس اگر ہم اس مجموعہ کو مع جمیع افراد کے اسلام کہیں۔ تو یہ کہنا ہمارا محض غلط ہے۔ اور اگر اس سے کلیتہً انکار کریں۔ تو بھی انکار ہمارا نادرست ہے۔ اس لئے ہم کو سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں کہ ہم انہیں اصول موضوعہ کو جو اوپر بیان کئے گئے پیش نظر رکھ کر اس کی ترکیب اور اختلاط کے دور کرنے کی فکر کریں اور کسی نہایت سچے ذریعہ اور مفید تدبیر سے ہر ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ کر کے اسلام جس شئے کا نام ہے۔ اس کو الگ کریں۔ تب اسلام کی حقیقت معلوم ہونے پر یقین کر کے ان آراء مختلف کو جو اس مجموعہ مرکب کے حسن و قبح کی نسبت ہے۔ دیکھیں۔ تاکہ ہم کو معلوم ہو جائے کہ ان اجزائے مختلفہ کا تعلق کس قدر اصل اسلام سے ہے۔ اور کس قدر ان اشیائے خارجی سے جو اسلام میں مختلط ہو گئی ہیں۔

غرضکہ اس کام کے لئے ہم کو کوئی سچا اور کارآمد آلہ درکار ہے۔ جو کہ اس ترکیب کو دور کرے اور وہ سچا اور کارآمد آلہ کیا ہے۔ رسول صلعم کی ذات ہے۔ جن کا لقب احمد مجتبےٰ اور جن کا نام محمد مصطفےٰ ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔

کوئی یہ خیال نہ کرے کہ وہ آلہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ بلکہ بالکل صحیح و سالم ہمارے پاس اب تک موجود ہے اور قیامت تک موجود رہے گا ہاں اس کے اجزا کا سمجھنا اور اس سے کام لینے کا طریقہ جاننا ضرور ہے۔

اس آلہ سے مراد وہ صورت شخصی نہیں ہے۔ جس میں اور لوگ بھی مشابہت صوری رکھتے تھے۔ بلکہ خاص وہ منصب مراد ہے۔ جس میں کوئی کچھ مناسبت نہیں رکھتا۔ یعنی نبوت اور ہدایت کہ اس کے دو جزو ہیں۔ ایک ایسا سچا کہ کسی طرح کا اس میں شک و شبہ نہیں۔ دوسرا ایسا کہ جس کی سچائی پر کسی قدر صحت اور سند اور تحقیقات کی حاجت ہے۔ پہلے جزو سے مراد کتاب اللہ ہے۔ دوسرے جزو سے مراد حدیث ہے۔ پس جس کے پاس یہ دونو جزو موجود ہوں اس کے پاس ہر وقت ہر ساعت

وہ آلہ گویا ہندآپہ ور ہندے موجود ہے جو شرق میں ہو خواہ مغرب میں۔
شمال میں ہو خواہ جنوب میں ہے

نہ بیچ گل ہرجا کہ سد بہم گل است | خم بہ ہرجا کہ جوشد ہم مل است
گر ز مغرب بر زند خورشید سر | عین خورشید است نے چیزے دگر

پس ہم کو اپنے تمام حالات کا دینی ہوں یا دنیاوی عملی ہوں یا فرض متعلق حقوق اللہ سے متعلق ہوں یا حقوق العباد سے۔ امتحان کرنا لازم ہے۔ اور امتحان کا طریق یہ ہے۔ کہ اس کی تطبیق کتاب اللہ اور سنت سے کریں۔ جس کو اس کے مطابق پاویں۔ اس کو اسلام سمجھیں۔ اور جس کو مخالف پائیں اس کو اسلام سے خارج جانیں۔

اسلام کو ہماری ذات سے دو قسم کا تعلق ہے۔ ایک متعلق عقائد کے جس کو حکما حکمت بالغہ یا کمال علمی کہتے ہیں۔ دوسرا متعلق اعمال کے جس کو عقلا قدرت فاضلہ اور کمال علمی سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے امر کو جو حقیقت اصول ہے۔ کتاب و سنت نے ایسا صاف کر دیا ہے۔ کہ اب کسی دوسرے سے پوچھنے بتلانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ مراتب توحید اور نبوت اور معاد کی کامل تشریح کر دی ہے دوسرے امر کو جو درحقیقت فروع ہے اس کے اصول بھی تصریح کے ساتھ بیان کر دئے ہیں۔ اس لئے ہم کو اپنی دونو باتوں کو کتاب و سنت سے ملانا چاہئے۔ تب معلوم ہوگا۔ کہ کتنی باتیں ہم میں اسلام کی ہیں اور کتنی اس سے خارج اور کون کون سا عمل ہمارا موافق اس کے ہے۔ اور کون سا مخالف۔

ہمارے حالات دنیوی بھی مذہب کے تعلقات سے آزاد نہیں ہیں۔ بلکہ ہر معاملہ میں خواہ وہ سیاست مدن سے متعلق ہو۔ خواہ اس کو حکمت منزل سے علاقہ ہو۔ ہم کو شریعت کی پابندی ہی ہمارا تمدن اور معاشرت اور رہنا آزادانہ یعنی بلاقید شریعت کے نہیں ہو سکتا۔ جو برتاؤ دنیاوی ہمارا ہوگا وہ بھی مذہبی

ہو گا۔ اور ہماری ہر بات اور ہر چال اور ہر فعل اور ہر عمل میں جلوہ اسلام کا چمکے گا۔ اگر وہ برتاؤ مطابق شریعت کے ہے۔ تو وہ نورِ اسلام ہے۔ اور اگر مخالف ہے تو وہ داغ اسلام۔

شریعت نے ہم کو رہبانیت کی تعلیم نہیں کی۔ جوگی ہونے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ فرمایا ہے۔ کلوا من الطیبات واعملوا صالحا اس لئے اگر دل بیار اور دست بکار ہو تو عین ثواب ہے۔ شریعت نے دائرہ معیشت کو تنگ نہیں کیا۔ زینتِ دنیا سے ممنوع نہیں گردانا۔ ہم سب مسلمان محرمات سے بچ کر اپنی زندگی کو نہایت آرام سے بسر کر سکتے ہیں۔ اور اپنی اوقات کو اور اپنے مال کو اگر اپنے بھائیوں کی بھلائی میں صرف کریں۔ تو کسی عبادت میں اس سے زیادہ ثواب کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہم نے اپنی بدبختی سے دین کو شرک و بدعت کے عقیدوں سے خراب اور دنیا کو غفلت اور جہالت کے سبب سے برباد کر رکھا ہے۔ نہ دین کے ہوئے نہ دنیا کے ؎

گئے دونو جہاں کے کام سے ہم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے

جب ہم خلفائے راشدین کے اصولِ سیاست اور طریق معاشرت اور اخلاق اور عادات اور چال چلن اور برتاؤ کو دیکھتے ہیں۔ تو ہماری آنکھوں کے سامنے بہت سی عجیب و غریب چیزیں بکھر جاتی ہیں۔ اور بہت سے عقدے ہمارے حل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہم کچھ مختصر سا حال خلفائے راشدین کی خلافت کا لکھتے ہیں۔ لیکن صرف اُن باتوں کو جو کہ متعلق سیاست اور معاشرت کے ہیں۔ تاکہ اس سے فوائدِ ذیل حاصل ہوں۔

اوّل معلوم ہونا اُن کے اصولِ سیاست کا کہ وہ کیسے تھے اور کن قواعد پر مبنی تھے۔

دوسرے ظاہر کرنا اُن کے اخلاق و عادات کا کہ وہ کیسی صفائی اور

سچائی اور راستی ہر معاملہ میں رکھتے تھے۔ اور غیر مذہب والوں سے کس طور سے پیش آتے تھے۔

تیسرے ظاہر کرنا اس کے مختلف قواعد انتظامیہ کا جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ موافق ضرورت وقت اور حال زمانہ کے اصول سیاست اور تمدن اور معاشرت کے مقرر کرنا اور وقتاً فوقتاً ان میں اصلاح کرنا اور ایسے نئے ضابطے جو پہلے جاری نہ تھے۔ منضبط کرنا اور امور مفید عام کے اجرا میں کوشش کرنا (بشرطیکہ کوئی نص کتاب و سنت سے اس کے منع اور حرمت پر نہ ہو) ان کے نزدیک بدعت نہ تھا۔

چوتھے مخالفت ان سلاطین اسلامیہ کی شریعت سے جنہوں نے اپنی حرکات ظالمانہ اور افعال جابرانہ سے اپنے بے جا تعصب اور غلط غضب کو سلطنت کے کاموں میں دخل دیا اور ناجائز طور سے اپنے اختیارات شاہی کو برتا اور اسلام کو بٹہ لگایا۔

پانچویں واقف کرنا اپنے بھائی مسلمانوں کو ان کے پیشواؤں کے اخلاق اور عادات سے اور ان کے قواعد انتظامیہ اور قوانین حکمیہ سے تاکہ ان کو معلوم ہووے کہ وہ امورات انتظام سلطنت میں کیسی استعداد رکھتے تھے اور وہ تہذیب و شائستگی کی ترویج میں کیسی سعی بلیغ کرتے تھے

پہلا اصول جس پر بنا خلافت کی تھی اجتماع تھا۔ یعنی امام اور خلیفہ کا مقرر ہونا تمام امت اور رعیت کی مرضی پر موقوف تھا۔ قرابت اور رشتہ اور وراثت کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔ چنانچہ جب وقت وفات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قریب ہوا۔ تو لوگوں نے کہا۔ کہ آپ اپنے بیٹے عبداللہ کو اپنا جانشین کر دیجئے حضرت نے فرمایا اس کا کچھ حق نہیں ہے۔

دوسرا اصول خلیفہ کو آزادی اور خود مختاری کا حاصل نہ ہونا۔ امام اور خلیفہ اجرائے احکام اور انتظام امورات سلطنت میں آزاد اور خود مختار

خدا پر بھروسہ کر کے اس کو شروع کرنا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اصول کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور نہایت خوبی سے اس کی پابندی کی جب وہ کوئی کام کرتے تو سب سے مشورہ اور صلاح کرتے اور پھر سب کو میزان عقل میں تول لیتے اور جو ایک رائے پر نہایت استقلال سے قائم ہو جاتے۔ اسی واسطے تدبیر مملکت میں انہوں نے دھوکا نہ پایا اور ان کی سب تدبیریں مفید پڑیں۔

حضرت عمرؓ کو اس اصول کا یہاں تک لحاظ تھا کہ اگر کسی فروعی مسئلہ میں وہ نص صریح کتاب و سنت کی نہ پاتے تو وہ مشورہ کرتے۔

یہ چوتھا اصول بھی دوسرے اصول کا ثمرہ ہے۔ اس لئے کہ جب بادشاہ کو آزادی اور خود مختاری نہ ہوگی۔ تو لامحالہ وہ صرف اپنی مرضی سے کام نہ کر سکے گا اور اس کو ضرورت ان لوگوں سے پوچھنے کی ہوگی جو کہ صاحب الرائے ہوں۔

یہ اصول وہی ہے جو کہ اب تربیت یافتہ قوموں میں یورپ کی جاری ہے۔ جس کو باختلاف لغت اور زبان کے کونسل کہتے ہیں۔

پانچواں اصول خلیفہ کو ملک کی آمدنی کا سوائے حق معین کے اپنے صرف میں نہ لانا۔ ملک کی آمدنی خواہ وہ جزیہ کی ہوتی ہو یا خراج کی یا عشر کی وہ سب بیت المال میں جمع ہوتی۔ خلیفہ کو کسی قسم کا اختیار اس پر نہ تھا۔ صرف روزینہ یا تنخواہ مقرری کے سوا وہ کچھ نہ لے سکتے تھے۔ ابتدا سے عہد خلافت میں حضرت صدیق اکبرؓ کو صرف کھانا کپڑا ملتا تھا۔ اور جب آمدنی زیادہ ہوئی تب دو ہزار پانچسو درہم ملنے لگے۔ اور حضرت عمرؓ بھی اپنی ذات کے واسطے صرف اسی قدر لیتے جس قدر اور مہاجرین و انصار کو دیتے تھے۔

جو آمدنی ملک کی ہوتی وہ خزانہ میں جمع ہوتی۔ اور فوج کے سرداروں اور سپاہیوں اور مہاجرین و انصار کو اس سے مشاہرہ مقررہ اور فقرا اور مساکین کو آذوقہ کافی دیا جاتا۔ اور بوقت ضرورت عام فائدہ کے کاموں میں صرف کی جاتی

اسی طرح پر کوفہ اور بصرہ وغیرہ شہروں کی آبادی ور عمارت میں یا وقت ایام
قحط وغیرہ کے جس کا نام قحط رمادہ ہے ۔ غلہ کے باہر سے منگانے میں صرف کی گئی
ملک کی آمدنی سے جس طرح مسلمان فقراء و مساکین کو حصہ دیا جاتا ۔ اسی
طرح یہ اہل کتاب وغیرہ کو کچھ تخصیص مسلمانوں کی نہ تھی ۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے ۔ کہ حضرت عمرؓ نے ایک بڈھے اندھے یہودی کو
بھیک سوال کرتے دیکھا اور وقت استفسار کے معلوم ہوا ۔ کہ جزیہ کے مطالبہ
کے واسطے وہ سوال کرتا ہے ۔ اسی وقت اس کا ہاتھ پکڑ کر بہ بیت الخلق سے
گھر لائے اور کچھ اس کو دیا ہے ۔ اور جزیہ کے تحصیل کرنے والوں کو حکم
دیا ۔ کہ اس کا اور اس قسم کے لوگوں کا خیال رکھنا ۔ یہ کون انصاف ہے ۔ کہ اس
کی جوانی کی کمائی تو ہم کھاویں ۔ اور بڑھاپے میں اس کو ذلیل کریں ۔ اور اس کی
کچھ بھی خبر نہ لیں ۔ اس لئے آئندہ سے ایسے لوگوں سے مطالبہ نہ کرو ۔ اور ان
کو جزیہ سے معاف جانو ۔ اور بیت المال کے داروغہ کو حکم دیا ۔ کہ خدا نے فرمایا
ہے انما الصدقات للفقراء ۔ اور یہ بھی مساکین اہل کتاب سے ہیں اس
لئے ان کو دینا چاہئے ۔

چھٹا اصول وقت لشکر کشی کے کسی ملک پر مراعات اور حسن سلوک کا لحاظ رکھنا اور
حد سے تجاوز یا زیادتی نہ کرنا اور جہاں تک ممکن ہو نرمی سے پیش آنا ۔

جب کسی ملک کے فتح کرنے کے لئے لشکر بھیجا جاتا تھا تو اس لشکر کے سردار کو
جو احکام دئے جاتے تھے اُن میں امور مفصلہ ذیل پر نہایت تاکید کی جاتی تھی ۔

اوّل ۔ کوئی عورت اور لڑکا اور بڈھا اور ضعیف نہ مارا جائے ۔

دوسرے ۔ کسی کا ناک کان نہ کاٹا جائے ۔

تیسرے ۔ عبادت کرنے والے گوشہ نشین قتل نہ کئے جاویں ۔ اور اُن کے
عبادت خانے نہ کھودے جائیں ۔

چوتھے کوئی درخت پھل دار نہ کاٹا جائے ۔ کوئی کھیت نہ جلایا جاوے ۔

پانچویں - کوئی عمارت اور آبادی ویران نہ کی جاوے -
چھٹے - کسی جانور - بکری - اونٹ وغیرہ کی کونچیں نہ کاٹی جاویں -
ساتویں - کوئی کام بغیر صلاح ومشورہ کے نہ ہووے -
آٹھویں - ہر ایک کے ساتھ طریقہ انصاف اور عدل کا برتا جاوے - کسی پر ظلم اور جبر نہ کیا جاوے -
نویں - جو عہد و پیمان غیر مذاہب والوں سے کیا جاوے - اس میں بیوفائی نہ کی جاوے اور وہ ٹھیک ٹھیک وفا کیا جاوے -
دسویں - جو لوگ اطاعت قبول کریں - اور جزیہ دیں - ان کی جان و مال مسلمانوں کی جان و مال کے برابر سمجھی جاویں - اور اُن کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جاوے - اور تمام معاملات میں اُن کے احکام مثل مسلمانوں کے تصور کئے جاویں -
گیارھویں - جب تک کہ اسلام کے قبول کرنے کی دعوت نہ کی گئی ہو نہ لڑنا نہ چاہئے -
ان احکام پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ مقابلہ اور لشکر کشی کے وقت کیسی نیکی اور رحم اور نرمی کی رعایت کی جاتی تھی - اور غدر اور فریب اور بد عہدی پر کس قدر تہدید ہوتی تھی - کوئی بادشاہ نیک سا نیک اور رحیم سا رحیم کیوں نہ ہو لشکر کشی کے وقت اس سے زیادہ نرمی نہیں کر سکتا -
ساتواں اصول - امورات ریاست اور انتظام سلطنت کے عمدہ انصرام کے لئے لائق عہدہ داروں اور اہلکاروں کا منتخب کرنا اور ان کو وقت مقرر کے ہدایات خاص کرنا اور ہمیشہ ان کی نگرانی رکھنا -
جس عامل کو حضرت عمرؓ مقرر کرتے اس کو احکام ذیل سناتے اور اس کی تعمیل کی تاکید کرتے -
اول - چوبدار اور حاجب نہ رکھنا - کسی مستغیث کو آنے کی روک ٹوک کا

ذریعہ پیدا نہ کرنا گو یہ حکم تھا کہ دارِ عدالت کو ہر وقت کھلا رکھنا۔

دوسرے جب کوئی استغاثہ کرے اس کو سننا اور مدعی سے گواہ عادل یا حلف سے قسم لے کر اس کو فیصلہ کرنا جس شخص پر حدِ شرعی جاری نہ ہوئی ہو یا جھوٹی شہادت میں مشہور نہ ہو یا اس پر محبت اور وراثت کی تہمت نہ ہو وہ عادل سمجھا جاوے گا۔

اگر گواہوں کی حاضری کے واسطے مدت مانگی جاوے تو مہلت دینا۔

تیسرے۔ مقدمات کا جلد فیصلہ کرنا تاکہ ایسا نہ ہو کہ مدعی دیر کے سبب سے ناامید ہو کر دعویٰ چھوڑ بیٹھے۔

چوتھے۔ باہم مصالحہ اور رضامندی کو منظور کرنا بشرطیکہ اس سے تحلیل حرام اور تحریم حلال نہ ہو۔

پانچویں۔ متخاصمین پر سختی اور درشتی اور غصہ نہ کرنا۔

چھٹے۔ رعب قائم رکھنا مگر نہ اتنا کہ وہ منجر بہ جبر ہو اور اخلاق و نرمی کرنا مگر نہ اس قدر کہ حکومت میں سستی اور بدرعبی ہو۔

ساتویں۔ ہمیشہ عدل اور انصاف پر کرنا اور حق بہ حقدار پہنچانا۔

عدل اور انصاف پر یہاں تک حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو عمل رہتا تھا۔ کہ وہ مسلمان اور کافر میں کچھ تفرقہ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ سعید بن مسیب سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضہ کے سامنے ایک یہودی اور ایک مسلمان مخاصمہ کرتے ہوئے آئے۔ اور ان کے نزدیک حق یہودی کا ثابت ہوا۔ اسی کے حق میں فیصلہ کیا۔ وہ یہودی اس عدل کو دیکھ کر مدح و ثنا کرنے لگا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ جس طرح پر اپنے عاملوں کو تاکید کرتے تھے۔ اسی طرح پر رعایا کو بھی آگاہ کر دیا کرتے تھے۔ کہ سوائے شریعت کے احکام کے کسی اعلےٰ سے اعلےٰ حاکم کو ادنےٰ سے ادنےٰ رعیت پر کچھ اختیار نہیں ہے کہ اگر کوئی عامل کچھ کسی پر جبر و زیادتی کرے تو میں اس کو اسی طرح پر مجرم سمجھوں گا۔ جیسا کہ ادنےٰ

رعیت کو سمجھتا ہوں - اور اس کو سزا دوں گا - سب اپنی عزت اور جان اور مال میں سوائے احکام شرعی کے آزاد اور خود مختار ہیں اور حاکم اور رعیت سب برابر -

حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ اپنے عاملوں کو خود مختار اور آزاد نہ ہونے دیتے تھے - اُن کی نگرانی رکھتے - ہمیشہ اُن کی تبدیلی کیا کرتے - اُن سے اگر خطا ہو جاتی تو معزول کر دیا کرتے - جواب دہی کے لئے دار الخلافہ میں طلب کرتے بعض قصوروں میں اُن پر جرمانہ کرتے -

آٹھواں اصول - امور مملکت کے انتظام کی نظیر سے قوانین اور ضوابط جدید کا جاری کرنا اور وقتاً فوقتاً موقع اور مصلحت وقت دیکھ کر اس کی اصلاح و ترمیم کرنا بشرطیکہ کوئی نص صریح اس کی حرمت پر کتاب و سنت کی موجود نہ ہو -

آجکل کے زمانہ میں جہاں کسی نے کوئی نئی بات کی - گو اس کو ثواب اور عذاب سے علاقہ نہ ہو لوگ بدعت کہنے لگتے ہیں - اور اس کو حرام اور منع بتلاتے ہیں اور یہ نہیں بوجتے کہ جس بات کو شرع نے حرام کر دیا ہے - اس کو چھوڑ کر سب چیزیں مباح ہیں - اس لئے کہ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ اور یہ نہیں سوچتے کہ ان امور میں جو کہ متعلق سیاست تمدن اور معاشرت کے ہیں - ہمیشہ اختلاف زمانہ سے اختلاف ہوتا رہتا ہے - اور ان کا ترمیم کرنا اور اُن میں اصلاح دینا ضروری ہو جاتا ہے - ان میں اسی قاعدہ کا لحاظ کرنا چاہئے جس کا حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ نے اپنی خلافت میں کیا یعنی محرمات منصوصہ کو چھوڑ کر اُن باتوں کو اختیار کرتے ہیں جو کہ اُن کے زمانہ کے مناسب حال تھیں کچھ ذرا سا بھی تامل نہ کیا - اور کسی نے اس کو بدعت نہ کہا -

پہلا نیا کام جو حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ نے کیا وہ دفتر اور کچہری کا مقرر کرنا اور لشکریوں اور ملازموں اور روزینہ والوں کا نام لکھا جانا اور ان کی تنخواہیں مقرر کرنا ہے - قبل حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ کے جو مال غنیمت

ما۔ ویسا ہی تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نہ نام پانے والے کی نہ تعداد اس
ی جاتی تھی۔ مگر جب کہ حضرت عمرؓ کو اس قاعدہ بندی کی حاجت
ہوئی تب مشورہ کیا۔ ولید ابن ہشام نے کہا کہ میں نے بادشاہان
ہاں دیکھا ہے کہ وہ دفتر رکھتے ہیں۔ اور اس میں سب حساب کتاب
ہتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالے عنہ نے اس کو پسند کیا۔ عقیل
لب اور مخرمہ بن نوفل اور جبیر بن مطعم کو جو منشی تھے مقرر کیا۔ اور
ے نام لکھنے کا ان کو حکم دیا۔ یہ کام حضرت عمرؓ نے ۲۰ھ محرم
نے میں کیا۔

سرا کام جو انھوں نے کیا۔ وہ تاریخ ہجری کا جاری کرنا ہے۔ اس کا
پہلے رواج نہ تھا۔

را کام ان کا خزانہ کا مقرر کرنا ہے۔ جس کو ہماری اصطلاح میں بیت المال

ھا کام ان کا تقسیم اختیارات اور عہدوں کا ہے۔ اس سے پہلے جو
تھا۔ وہ ایک ہی شخص کرتا تھا۔ مگر بخیال اس کے کہ اس میں چند تباہیاں
س کو بدل دیا۔ اور تین قسم کے عہدہ دار مقرر کئے۔ ایک امیر جس کے
نظام کل امور ریاست کا ہوتا تھا۔ اور جس کے متعلق فوج رہتی
ا قاضی کا کام انفصال خصومات اور تصفیہ حقوق تھا۔ تیسرا تحویل دار
ردگی میں خزانہ رہتا تھا۔ اور ایک دوسرے کے کام سے کچھ تعلق نہ تھا
ال کام ان کا جو سننے والوں کو متعجب کرتا ہے مقرر کرنا قواعد خراج اور

ول لینے کے چند طریقے رکھے گئے تھے۔ ایک جزیہ اگر وہ برضامندی
لے کے ٹھہرتا تو اس میں کمی بیشی نہ ہوتی ورنہ بشرح مختلف لیا جاتا مگر
ی سے زیادہ نہیں۔

دوسرا محصول تجارتی پر جس کی شرح یہ تھی - ذمیوں سے پانچ روپیہ سینکڑہ اور حربیوں سے دس روپے سینکڑہ لیکن یہ محصول سالانہ ہوتا تھا - اگر وہ مال سال بھر میں چند مرتبہ آوے - تو پھر کبھی اس سے نہ لیا جاتا تھا - اور اگر کوئی تحصیل کنندہ غلطی سے لیتا تو وہ واپس کر دیا جاتا - جیسا کہ ایک عیسائی تاجر کو پھیر دیا گیا -

تیسرا محصول زمین کا - اس محصول کے اس وقت باقاعدہ مقرر ہونے پر لوگوں کو تعجب ہوگا کہ وہ فی جریب شرح مقرر پر بعد پیمائش اراضی کے اکثر جگہ لیا جاتا تھا - چنانچہ جب ملک عراق کا فتح ہوا - تو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے حکم دیا کہ اس زمین کی پیمائش کی جاوے - چنانچہ عثمان ابن حنیف اور حذیفہ ابن یمان اس کام پر مقرر ہوئے - بعد پیمائش کے معلوم ہوا کہ کل اراضی تین کروڑ ساٹھ لاکھ جریب ہے - اس پر موافق حیثیت پیداوار اراضی کے شرح مقرر کی گئی -

اور یہ صرف عراق ہیں جاری نہیں ہوا - بلکہ شام اور دیگر جزائر میں بھی اسی طور پر کیا گیا - لیکن سب ملک مقبوضہ میں اس کا رواج نہیں ہونے پایا محصول کے تحصیل کرنے میں نہایت آسانی کا حکم تھا - اور تکلیف جسمانی دینے کی سخت ممانعت تھی - چنانچہ ایک مرتبہ خود حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے وقت مراجعت سفر شام کے دیکھا - کہ ایک قوم کی قوم کو تحصیل کرنے والے محصول کے ستاتے ہیں آپ نے اُن کو چھڑا دیا - اور فرمایا کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو لوگ دنیا میں عذاب دیتے ہیں وہ قیامت میں عذاب کئے جاویں گے

جو ملک فتح کیا جاتا اور مصالحہ کیا جاتا تو یہ شرطیں عہدنامہ میں داخل ہوتیں -

اوّل - خراج کی تفصیل -

دوسرے - جو مسلمان اُن کے ملک میں گذرے اس کی تین روز تک مہمانی کرنا

تیسرے - راہ بتلانا -

چوتھے - دشمنوں سے سازش نہ کرنا -

پانچویں۔ مجرم کو پناہ نہ دینا۔

چھٹا کام اُن کا زمین کی آبادی میں سعی کرنا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ جو زمین بنجر کو مزروعہ کرے۔ وہ زمین اسی کی ہو جاوے گی۔ غرض اس حکم سے بہتیرے لوگ زراعت کرنے لگیں۔

ساتواں کام اُن کا شہروں کی آبادی تھی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس خلافت میں جمادی ... بصرہ شہر آباد ہے۔ بنیاد آباد کرنے کی ڈالی۔ اور بصرہ کو آباد کیا۔ اور وہ مقام ایسا تھا کہ یہاں جہاز اور کشتیاں بحیرہ ہند کی لنگر ... انہیں۔ بنظر حفاظت ملک کے دشمنوں سے اور بنظر تجارت کے یہ شہر آباد کیا۔ اور وہاں ایک فوج کی چھاؤنی مقرر کی۔ دوسرا کوفہ آباد کیا ہوا اُن کا سبب۔ اس کے آباد کرنے کا یہ سبب ہے۔ کہ جب مسلمان شہر مدائن میں بہت سے ہو گئے تو وہاں کی آب و ہوا بگڑ گئی۔ اور لوگ بیمار ہو گئے۔ تب سعد ابن وقاص کو عمرؓ نے زمین ریلے پر مقرر کیا۔ اور شہر کوفہ آباد کرایا۔ اس شہر میں اول کچی اینٹ کی عمارت اور پھوس کے چھپر کا حکم دیا لیکن پھر اس میں پختہ عمارت بنوانے کی بھی اجازت دی۔

آٹھواں کام اُن کا تجارت کی آزادی ہے۔ تمام لوگوں کو بلحاظ مذہب غیر مذہب کے تجارت کرنے کی اجازت تھی۔ بلکہ حربیوں کو حکم عام تھا۔ کہ وہ تجارت کے لیے دارالاسلام میں آویں۔ اور مسلمانوں سے خرید فروخت کریں۔ منبج شہر کے حربیوں نے درخواست کی کہ ہم کو عشر دے کر آنے کی اجازت ہو۔ چنانچہ اُن کو اجازت دی گئی۔

محسن الملک سید مہدی علی خاں۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد

شمس العلماء خطاب۔ محمد حسین نام۔ آزاد تخلص دلّی کے رہنے والے تھے۔ اُردو میں ان کے پائے کا دوسرا انشا پرداز نہیں ہوا اس لئے ان کی زبان کو الہامی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ آزاد کا کمال یہ ہے کہ الفاظ کی بندش، فقروں کی چستی اور مضمون کی روانی سے پڑھنے والے کو مسحور کر لیتے ہیں۔ بحیثیت ادیب آزاد میں ایک عدیم النظیر خوبی یہ تھی کہ اُن کا وہی قلم جو "آبِ حیات" اور نیرنگِ خیال لکھ کر بڑے بڑے ادیبوں کو حیرت میں ڈال سکتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور چٹکلے لکھ کر بچوں کا دل بھی خوش کر سکتا تھا۔ دنیا میں ہزاروں ادیب ہوں گے۔ مگر محمد حسین آزاد جیسا اہلِ قلم پیدا نہ ہوگا۔ ولادت ۱۸۳۲ء وفات ۱۹۱۰ء۔

بقائے دوام کا دربار

خواب میں دیکھتا ہوں۔ کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک
یدان وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں جس کی وسعت اور دلفزائی میدانِ خیال
بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں
، انہیں نہ سب فکر شمار کر سکتا ہے۔ نہ قلم تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے۔ وہاں ایک
ڑ ہے جس کی چوٹی گوشِ سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اُس کے جس
ت دیکھو ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے
حفہ بِ انسان کے ناخنِ تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ یکایک قلۂ کوہ
، ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دلکش آواز سب کو بے اختیار
طرف کھینچتی ہے لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اتنے انبوہ کثیر میں سے تھوڑے
اشخاص تھے جن کے کان اس کے سُننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق
منے تھے۔ دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحب ہمت عالی طبیعت
ے۔ غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندی کوہ پہ متوجہ ہوئے اور اس
ے سے آگے بڑھے۔ کہ بلندی کوہ پہ چڑھ جائیں۔ اس عالم خیال میں
تا ہوں کہ ایک فرشتۂ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے۔ اور مجھے
اُس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرمجوشی تمہاری ہمیں
یت پسند ہے۔ اُس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب مُنہ پہ ڈال لو۔ میں
بے تامل تعمیل کی ۔

ناگہاں ایک ایوانِ عالی شان دکھائی دیا کہ اُس کے چار طرف پھاٹک
۔ اُس پہاڑ کی چوٹی پہ دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری حُور شمائل

چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے۔ جس کے میٹھے میٹھے سُروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ یکایک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز۔ جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سُر نکلتے تھے۔ اب اُس سے ظفریابی اور مبارک بادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا۔ اور دروازے خود بخود کھُل گئے۔ اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو بتیس پریاں اُڑائے لئے آتی ہیں۔ اس پر ایک راجہ بیٹھا ہے۔ مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقہ فرقہ کے علماء اور مؤرخ لینے کو نکلے۔ مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بے قراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے۔ اور تخت سنگھاسن بتیسی ہے پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ "جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے۔ نہ آپ کا سَن مٹے گا۔ نہ سکّہ مٹے گا" پنڈت اور برہمنوں نے تصدیق کی اور انہیں نے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا ؎

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک گروہ کثیر بادشاہوں کی ذیل میں آیا۔ ہر چند ان کے جُبّے دامنِ قیامت سے دامن باندھتے تھے۔ مگر اکثر ان میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لئے منتخب ہوئے۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے اُن کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کی پتری لئے اشیرباد کہتے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا ؎

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا۔ جس کو انبوہ کثیر ایرانی۔ تورانی ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لئے آتا تھا۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اُس کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ہندو اُسے ہندو جانتے تھے۔ آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا۔ نصاریٰ اُس کو نصاریٰ سمجھتے تھے۔ اُس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبی کی شکایت کر کے

بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا۔ کہ اُس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا۔ اور وہ فتح یاب ہوتا۔ اگر چند مصنّفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا۔ نیت کا پھل ہے۔

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مؤرخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لئے تھے اور شاعر اُس کے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لئے تھے۔ جو اُس کے نام کے کتابے دکھاتی۔ اور سینکڑوں برس کی راہ تک اُس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضا مندی عام کا غلغلہ بلند ہُوا۔ اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلہ میں معزز درجہ پر ممتاز ہُوا ؛

تھوڑی دیر ہوئی تھی۔ جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا۔ کوئی گلدستہ ہاتھ میں لئے تھا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے۔ اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھنے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص منتخب ہوئے ان میں ایک شخص کو دیکھا کہ جب بات کرتا تھا۔ اُس کے مُنہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے ہوئے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودؔا تھے ؛

میؔر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور مُنہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کئے دیتی تھی۔ میر حسنؔ اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاءاللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھلاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار متقی۔ پرہیزگار۔ دم میں ڈاڑھی چٹ۔ بنگ کا سوٹا کندھے پر۔

جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔

ایک پیر مرد دیرینہ سال محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے۔ کھڑکی دار پگڑی باندھے۔ جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے آتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان کے دست و گریبان ہو ہو جاتے۔ لیکن چار خاکسار اور پانچ ان تاجداران کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امّن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور فسانۂ عجائب والے تھے۔ ذوقؔ کے آنے پر لپند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انہوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سوداؔ نے اُٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج اُن کے سر پر رکھ دیا غالبؔ اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

تختِ طاؤس اور جشنِ مہتابی

یہ نمونہ عجائبات دنیا کا تھا۔ کروڑ روپیہ کہنے کو تو دو لفظ اور ایک بات ہے مگر خیال کرنا چاہیئے کہ آج اس قدر سونے اور جواہرات کے لئے کس قدر دریا اور پہاڑ اُلٹنے پڑتے ہیں۔ پشت کا تکیہ جس پہ بادشاہ شاہجہان تکیہ لگا کر بیٹھتا تھا۔ دس لاکھ روپے کا تھا۔

بارہ مرصّع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ میناکاری کی چھت دھری تھی۔ چھت سے پائے تک خالص کندن اور آبدار جواہر سے جگ مگ کر رہا

تھا۔ اور تین سیڑھی بلند چبوترے پر یہ عالم تھا گویا ایک منارے کا نگینہ تھا کہ انگوٹھی پر دھرا ہے۔ اس کی رد کار کی محراب پر ایک درخت بھاری دھرا تھا۔ جیسے سبزہ و الماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گلرنگ کیا تھا ادھر اُدھر اُس کے دو مور زنگار رنگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے لگتے ہیں۔ چاروں طرف چاروں چتر زر نگار جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی۔ آگے ایک شامیانہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا اور ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ سونے روپے کی چوبوں پر استادہ تھا۔ گرد اس کے کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ تخت کے گرد و پاس ادب کے لئے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا ایسا خوش نما لگا تھا کہ مینا کار جالیاں مرغِ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ اقبال کا رعب و داب دیکھ کر قدرت خدا یاد آتی تھی۔ کٹہرے کے باہر اول یمین و یسار شہزادے والا تبار۔ بعد اُن کے راجہ مہاراجہ۔ ملک ملک کے حاکم۔ امیر وزیر اپنے اپنے عہدے سے لئے کھڑے مگر تمام فرمانبرداروں کی آنکھیں زمین پر۔ اور گوشِ دل اپنے فرماں روا کے حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک در میں دو دو خاص بردار مخمل کے غلاف اور بندوقیں کندھوں پر، بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لئے بُت بنے ہوئے قائم تھے۔ باہر کے دالان میں اور عہدہ دار۔ منصب دار حکم کے منتظر حاضر تھے۔ اس کے آگے دروں میں تین تین حبشی جیسے کالے پہاڑ ـ آنکھیں لال لال زربفت کی وردیاں پہنے۔ ہتھیاروں میں اونچے بنے گرز ہائے فولادی کندھوں پر۔ بادلے کی بیرقیں ہاتھوں میں ؛

تیسرے درجے میں اہلکار اور ہر کارخانے کے کاردار منشی متصدی قلمدان بغل میں لپسنے آگے رکھے موجود تھے۔ اور دروں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کئے ہوئے قدِ آدم چاندی کے کٹہرے سے لگے خاموش کھڑے تھے ؛

باہر تیس تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹہرا کھڑا کیا گیا تھا۔ اور اس کے برابر بہادر سپاہی خاص بادشاہی جن میں دائیں پر ترک۔ بائیں پر افغان۔ سامنے راجپوت اپنی اپنی وردیاں پہنے سنہری روپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لئے جمے تھے۔ یہاں سے دروازے تک سواروں کے پہرے دو رویہ آراستہ تھے ۔

جو درباری لوگ آتے پہرے پہرے پہ اپنا نام و نشان بتاتے اور آگے چلے جاتے۔ مگر دبدبے اور دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہوش و حواس کے قدم تھراتے تھے۔ دربار میں پہنچ کر تین سلام گاہوں پر تسلیم بجا لاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا کہ آداب بجا لاؤ "جہاں پناہ" "بادشاہ سلامت" "عالم پناہ" بادشاہ سلامت" تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ کٹہرے کے پاس کورنش بجا لاتے۔

عبرت

دربار میں یہ شانِ پروردگار آشکار تھی۔ کہ دفعتہً بادشاہ آبدیدہ ہوئے اور دونوں ہاتھ فاتحہ کو اُٹھائے۔ ساتھ ہی سب اہلِ دربار نے ہاتھ اُٹھائے مگر پاسِ ادب سے کوئی شخص جرأت سوال نہ کر سکا۔ بعد فاتحہ کے خود بادشاہ نے فرمایا کہ "اے بندگانِ با اخلاص! جو خیال اس وقت میرے دل میں گزرا۔ اُس کا اظہار تم پر بھی واجب سمجھتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ فرعون نے ایک آبنوس اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ کر دعوائے خدائی کا کیا تھا۔ گواہ اور آگاہ ہو کہ جس نخوت اور تکبّر سے اس نے وہ دعوے کیا تھا میں اس سے لاکھ مرتبہ عجز اور نیاز کے ساتھ عبودیت الٰہی کا اقرار کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اُٹھا اور دوگانہ شکرانے کا بجا لا کر دیر تک پیشانی کو زمینِ نیاز پر ملتا رہا۔ وقت کی تاثیر سے دربار میں سناٹے کا عالم ہو گیا۔ سب کے دِل آب ہو گئے۔ اور سینوں کے ولولوں نے دمِ گرم سے اس ایوان میں ایک گونج پیدا کی۔ شاہ جہان بادشاہ سجدے سے اُٹھ کر مسندِ دربار پہ بیٹھا۔ ملکُ الشعراء نے قصیدہ مبارک باد

کا پڑھا۔ کسی باکمال نے کبت سنائی۔ کوئی اشرفیوں میں تلا۔ کسی کا مُنہ موتیوں سے بھر گیا۔ اتنے میں غلامانِ خاص۔ جواہر کا خوان ہاتھ میں لئے آئے۔ جن کے جواہر نگار خوان پوشوں میں موتیوں کی جھالر لٹکی تھی۔ میر دربار نے اشارہ کیا۔ اور اشارے کے ساتھ ہی سونے روپے کے پھول اور جواہرات کا مینہ چھم چھم برسنے لگا۔

رات کو جشنِ مہتابی ہوا کہ تمام دیوانِ عام ایک بُقعۂ نور نظر آنے لگا۔ فرش میں سفید مخملیں۔ سفید ہی قالین۔ دیواروں پر براق اطلسیں۔ زربفت و کمخواب کے پردے مگر وہ بھی روپہلی۔ آرائش کے سامان اور روشنی کے سب لوازمات موجود۔ مگر تمام بلّور اور شیشے سفید۔ روشوں پر گھاس سفید دربار کا لباس سفید۔ یہاں تک کہ انگوٹھی بھی چاندی کی۔ اس پر بھی الماس سفید۔ غرض کہ زمین سے آسمان تک نور کا عالم تھا۔ اور دریائے مہتاب لہراتا نظر آتا تھا۔ چندرما کی تلا کے جشن میں نو دن باقی تھے۔ اس لئے نو دن تک برابر جشن کے انعام و اکرام جاری رہے۔

آزاد

رتن ناتھ سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار ایک معزز کشمیری خاندان سے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ سرشار عربی، فارسی اور انگریزی تینوں زبانیں جانتے تھے۔ انگریزی کی تعلیم کیننگ کالج لکھنؤ میں حاصل کی۔ ۱۸۷۸ء میں اخبار اودھ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اور اس میں اپنی مشہور تصنیف فسانۂ آزاد کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد گئے۔ اور وہاں مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنے کلام کی اصلاح کے لئے دو سو روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔ آخیر عمر میں سرشار کی مے نوشی حد سے تجاوز کر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے حیدرآباد ہی میں ۱۹۰۲ء میں انتقال کیا۔

سرشار کی عبارت نہایت سلیس ہوتی ہے۔ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں، ہو بہو نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف فسانۂ آزاد جہاں زبان وبیان کی دلچسپیوں کا خزانہ ہے وہاں حالات و واقعات کی دلآویز کا مجموعہ بھی ہے۔ اس کی زبان کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ سرشار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ جس قسم کے لوگوں کا ذکر کرتے ہیں۔ زبان بھی بعینہٖ اُن ہی کی لکھا کرتے ہیں جس سے کردار میں جان پڑ جاتی ہے۔ سرشار کے ہاں غضب کی کردار نگاری ہے۔ فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار کی مشہور تصانیف سیر کہسار، جام سرشار، کامنی، خدائی فوجدار، کڑم دھڑم، بچھڑی دلہن اور بھی ہیں۔

فسانۂ آزاد کا "خوجی"

میاں آزاد اور اُن کے لنگوٹیے یار میاں خوجی گھوڑوں کی باگ اُٹھائے چلے جاتے تھے۔ میاں خوجی کی ٹٹوی بھی گرمائی تو آزاد کی سمند گھوڑی سے دس پانچ ہی قدم پیچھے رہنے لگی۔ چلتے چلتے شام کے وقت ایک گاؤں نظر آیا۔ میاں آزاد نے کہا "یہیں بستر جماؤ۔ آج یہاں پڑاؤ ہو۔ کل دن دن سے لکھنؤ میں داخل ہو جائیں گے۔" رات بھر وہاں رہے۔ صبح تڑکے گھر دم چلے۔ تو کوئی تین چار کوس ہی گئے ہونگے کہ میاں خوجی ارہر کے کھیت میں گئے اور ٹٹوی کو چھوڑ دیا۔ کہ جہاں جی چاہے آزادی سے چرے۔ ٹٹوی دیکھنے میں تو دبلی پتلی تھی۔ مگر انتہا کی شریر۔ یہ ارہر کے کھیت میں ہو رہے۔ وہ سیدھی جھکے بوٹے کے کھیت میں پہنچی۔ اور لگی چرنے۔ اتنے میں کسان نے جو دیکھا تو لٹھ لے کر دوڑا۔ اور لگا برا بھلا کہنے۔ اس کی جورو بھی لپک کر پہنچی۔ اور کوسنا شروع کیا کہ "مر جائے، کیڑے پڑیں، ابھی ابھی پیٹ پھٹے اکھاس (لاش) نکلے:" اور کسان نے گالیاں دیں۔ "ارے یو ٹٹو کس کے آئے ہمرے کھیت میں؟" میاں خوجی جو باہر نکلے۔ تو دیکھا کہ ٹٹوی بھاگی جاتی ہے اور پیچھے پیچھے کسان کی جورو غل مچاتی ہے۔ اور کسان لٹھ لئے ہوئے چلا آتا ہے۔ اس نے گد سے لٹھ جمایا۔ اور پھر تان کر دوسرا دیا۔ اور پھر تیسرا جھکانے ہی کو تھا کہ میاں خوجی نے للکارا "او گیدی ابے او گیدی! خبردار! خبردار اس حرکت ناشائستہ سے باز آ۔ ورنہ فرقدان پر ایک بال باقی نہ رہے گا۔ اور ضربت پاپوش سے پلپلا جائے گا"۔

وہ گنوار بلکہ گنوار کا لٹھ، عربی ترکی تو پڑھا نہ تھا۔ اس پر جھلا کر جھپٹ پڑا۔ اور اتنے لٹھ رسید کئے کہ ہوئے کے پنجر بگڑ گئے۔ میاں خوجی میں ایک وصف تھا کہ اپنے سے دوگنا چوگنا ہو یہ جھٹ ہی جائیں گے۔ غصے کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا ہے

کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصّہ بھی نرالا تھا۔ ان کو جب غصّہ آتا تھا۔ شہ زور پر۔ جو ان کو اُٹھا کر پھینکے تو اٹھارہ لڑھکنیاں کھائیں۔ چاہے کچومر نکل جائے۔ مگر یہ بڑا انا نہیں چھوڑتے ۔

دوسرا وصف یہ تھا کہ پٹ پٹا کر جھاڑ پونچھ کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ اور ممکن کیا کہ ذرا اُف کریں۔ وہی تیور وہی دم خم، کسان نے اتنی بڑی گستاخی کی کہ ان کی ٹٹوی کو ان کے سامنے اتنا مارا کہ اس کا بھُرکس ہی نکل گیا۔ پھر بھلا ان کو تاب کہاں؟ آفتابہ پھینکا اور تڑ سے گُتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی اور انتہا کا کرارا۔ یہ دُبلے پتلے مہین آدمی ہوا کے جھونکے میں اُڑ جائیں۔ اس نے ان کی گردن دبوچی اور گد سے زمین پر پھینکا۔ پھر چھٹنے کی کوشش کی تو کسان کی جورو ان سے چمٹ گئی۔ اور لگی ہاتھا پائی ہونے۔ اس نے ایک گھونسہ جمایا اور ان کے پیٹے پکڑ کر پھینکا۔ تو چاروں شانے چت۔ دو تھپڑ رسید کئے ایک اِدھر، ایک اُدھر، اور کسان کھڑا ہنس رہا ہے کہ "ہمارو سے جیت پاوت نہیں یہ مسٹنڈوں سے کا لڑے لے بھلا۔" کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک اور پیٹ پاٹ کر چل دی۔ آپ نے پکارنا شروع کیا۔

"قسم بابا جان کی جو کہیں چھُرا پاس ہوتا تو ان دونوں کی لاشیں اس وقت تک پھڑکتی ہوتیں۔ وہ تو کہئے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میں اپنے زور میں آپ رہا۔ ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ ہات تیرے کی نابکار کھڑا تو رہ او گیدی دوزخی! اس پر گاؤں والوں نے خوب قہقہہ اُڑایا۔ اور اتنا بنایا کہ میاں خوجی جھلا کر سب کو گالیاں دینے لگے "او گیدی! تم سب پر میں اکیلا بھاری ہوں۔ پرے کے پرے صاف کر دوں۔ وہ تو کہئے چھری نہ ہوئی اس سے خیریت ہے۔" ایک نے پُوچھا "کیوں میاں صاحب! چھُری ہوتی تو کیا بھونک کر مر جاتے یا اپنے پیٹ میں لگاتے۔ آخر نتیجہ کیا ہوتا؟ اس پر میاں خوجی اور بھی آگ بھبوکا ہو گئے۔

میاں آزاد کوئی دو کوس کے پیٹے پر نکل گئے تھے۔ جب خوجی کو ساتھ نہ دیکھا تو حیرت ہوئی کہ ایں! یہ کہاں رہ گئے ہیں؟ ایک مسافر سے پُوچھا کہ "کیوں جی!

پیچھے کوئی شخص ٹٹو پہ سوار آتے دیکھا؟" اُس نے کہا۔ "جی ہاں ایک کسان سے لڑائی ہو رہی تھی۔ اُور اُس کی جورو نے ان کو خوب مارا۔ اب وہ کھیت میں پڑے قرولی ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ قرولی ہوتی تو مار ہی ڈالتا"

میاں آزاد نے باگ پھیری۔ اور دم کے دم میں ہوا ہو گئے تو کھٹ سے اس کھیت میں داخل۔

آزاد:- ارے میاں خوجی! خیریت تو ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ یہاں کھیت میں پڑے رہنے کا کیا سبب ہے۔ چلو۔ اُٹھیے! گرد جھاڑو۔ آخر کب تک پڑے رہو گے بھلا؟

خوجی:- قرولی نہ ہوئی پاس۔ ورنہ اس وقت دو لاشیں یہاں پھڑکتی ہوئی دیکھتے!

آزاد:- اجی وہ تو جب دیکھتے تب! اب تو تمہاری لوتھ دیکھ رہے ہیں"۔

پھر تو تھمبو کرکے اُٹھایا۔ اور گھوڑی پر سوار کرایا۔ چلے تو تھوڑی دُور تک میاں آزاد کا ساتھ رہا۔ پھر کوئی ایک کھیت کا فاصلہ ہو گیا۔ خوجی سے ایک پٹھان نے پوچھا۔ "کیوں شیخ جی! آپ کہاں رہتے ہیں؟"

حضرت نے کہا "ابے ہم شیخ نہیں۔ خواجہ ہیں!"

وہ شخص غصّے سے آگ بھبھوکا ہو گیا اور ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا۔ تو خوجی کھٹ سے زمین پر۔ چاہا کہ گلا گھونٹ کر مار ڈالے۔ مگر رحم آیا۔ اور چھوڑ دیا۔ کہ مفت کا خون کون اپنی گردن پر لے۔

اب ان کی سُنیے کہ ٹٹوڑی پر سے گر کر چاروں شانے چت پڑے ہیں۔ آزاد نے پیچھے پھر کر دیکھا تو ٹٹوڑی چلی آتی ہے۔ مگر خوجی غائب! سمجھے کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ پلٹے کہ دیکھیں کہ اب کیا واقعہ ہوا؟ خوجی ٹٹوڑی پر سے گر کر غل مچانے لگے کہ "نہ ہوئی قرولی ورنہ اتنی قرولیاں بھونکتا کہ یاد ہی کرتا عمر بھر!"

آزاد گھوڑی کڑا کڑاتے پاس پہنچے۔ تو دیکھا کہ پھر اسی طرح زمین پر پڑے

ہوئے قرولی کی جستجو میں ہیں۔

آزاد:- اے پھٹکار! شرم نہیں آتی۔ کمزور مار کھانے کی نشانی۔ بدن میں سکت نہیں تو پھر لڑتے کیوں۔ مرتے ہو مفت میں جوتیاں کھانا کون جوانمردی ہے؟

خوجی:- واللہ آزاد! جو کہیں قرولی پاس ہو تو بدن ہی چھلنی کر ڈالوں۔ مگر چلئے خیر گذری۔ ورنہ اس وقت اس گیدی کی تجہیز و تکفین کی فکر پڑتی۔

آزاد:- چلو اب اٹھو گے بھی یا پرسوں تک یہاں ہی پڑے رہو گے۔ یار! تم نے تو ہمارا ناک میں دم کر دیا۔ اب اسی کے ہو رہے کہ تم کو ڈھونڈنے نکلیں۔

خوجی:- اجی! ہم نہ اٹھیں گے۔ جب تک قرولی نہ لا دو۔ بس اب بنا قرولی کے نہ بنے گی!

آزاد۔ (دھپ لگاکر) بس اب بیہودہ نہ بکو۔ اٹھو۔ ورنہ ایک لات بھی جماؤں گا۔

چنانچہ آزاد نے ان کو اٹھا کر گھوڑی پر سوار کیا۔ اور راہ راہ چلے۔ خوجی صاحب اسی طرح پٹتے پٹاتے بہ ہزار دقت منزل مقصود پر پہنچے۔

لکھنؤ کے نواب

ایک دن ہمارے باغ و بہار لڑنتیے پہلوان میاں آزاد اپنے آقائے نامدار نواب گردول وقار کی کوٹھی میں دوزانو بیٹھے مصاحبین سے گپ اڑا رہے تھے کہ اتنے میں نواب صاحب نے کہا: کیوں آزاد! کبھی بٹیریں بھی لڑائی ہیں؟ نیت شب بخیر اب کی ربیع الاوّل میں وہ گھمسان کی لڑائیاں دکھائیں کہ واہ جی واہ۔

مصاحب:- میاں آزاد! تم تو اپنے آپ کو بڑا جہانیاں جہاں گشت سمجھتے ہو۔ مگر واللہ یہ لڑائی نہ دیکھی ہو گی۔ اس طرح گتھ جاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔

بٹیر کی لڑائی کے آگے تو توپ تفنگ بھی گرد ہے۔ اور پھر ہمارے نواب صاحب کے یہاں کی پالیاں۔ اُف وہ! آج ہماری سرکار میں جتنے بٹیر ہیں، اُتنے تو مٹیا برج کے چڑیا خانہ میں بھی نہ ہوں گے۔ ایک ایک بٹیر ہزار ہزار کی خرید کا۔ نوک دُم کے بنانے میں توڑے کے توڑے صرف ہو گئے۔ سیروں موتی مروارید تو میں نے اپنے ہاتھوں پیس کھلا دئے ہیں۔ کچھ دنوں روز گھرل چلتا تھا۔ مگر واللہ آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ اِس ڈیوڑھی پر اتنے دن سے ہو۔ اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھا۔ لے آؤ چلو تم کو سیر کرائیں۔"

یہ کہہ کر بٹیر خانہ لے گئے۔ میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چوطرفہ کابکیں ہی کابکیں نظر آتی ہیں۔ اور کابکیں بھی وہ بیش بہا کہ اُوہو ہو ہو، ہاتھی دانت کی تیلیاں۔ اُن پر گنگا جمنی گمندیاں اور کار چوبی چھتنیں، اور مقیش کی جھالر، اس پر کامدار مخملی غلافیں رنگ برنگ سونے چاندی کی کٹوریاں، جن میں بٹیر اپنی پیاری پیاری نکیلی چونچوں سے پانی پئیں۔ پانچ پانچ چھ چھ سو کی لاگت کی کابکیں ہر سمت ٹنگی ہیں کھوٹیاں رنگ برنگی مصاحب ایک ایک کابک اتار کر بٹیر دکھا کر تعریف کرنے لگا۔ تو پل باندھ دیئے۔ ایک بٹیر دکھا کر کہ اللہ رکھے کیا مچھولا جنوا ہے۔ صف شکن جو آپ نے سُنا ہو یہی حضرت ہیں لندن تک خبر کے کاغذ میں اس کا حال چھپ گیا ہے۔ میری جان کی قسم! ذرا اس کی آن بان کو تو دیکھئے گا (بوسہ لے کر) ہائے کیا بانکا بٹیر ہے! یہ نواب صاحب کے دادا جان کے وقت کا ہے۔ ایسے رئیس کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ دم کے دم میں لاکھوں تک دئے۔ روپیہ تو ٹھیکریاں سمجھا کئے۔ ابھی اور تو اور لونڈے جو گلی کوچوں میں لنگر اور گلے لے کر ڈور لوٹا کرتے ہیں۔ روز ڈور پیچ پیچ کر چکھوتیاں کرتے تھے۔ عیاشی میں وہ نام پیدا کیا کہ کوئی ڈوم ڈھاری غریب نظر نہ آیا۔ چانڈو کا شوق ہوا۔ تو دقیانوس کے وقت کی لگالیا

ہزاروں روپیہ کو خرید لیں۔ اور فی سبیل اللہ دو دو ڈھائی ڈھائی سو آدمیوں کو ایک دن میں چانڈو پلا دیا۔ افیم اتنی خریدی کہ ٹکے سیر سے سولہ روپے سیر بکنے لگی۔ مالوہ خالی چین کھکھل دن رات قوام کے چولھے کا منہ کالا افیم کے میت کا بول بالا۔ جب دیکھو لیمپ روشن، جاگتی جوت، مکھیاں تک فیض سے محروم نہ رہیں۔ بمبئی تک کے گنے آتے تھے۔ اور ہاتھی کے قدِ آدم چھلکوں کا ڈھیر لگ جاتا تھا۔

آزاد ۔ ہاتھی کے قدِ آدم بھی کتنا خوب ہے۔

مصاحب ۔ اللہ کی عنایت سے جو شوق کیا ایسا ہی کیا۔ پھر بٹیر بازی میں ان کے سامنے کون ٹھہرتا۔ لاکھوں روپیہ صرف کر ڈالا۔ اب یہ ایک صف شکن ان کے وقت کا رہ گیا ہے۔ یہ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بٹیر کیا ہفت خواں منازل پہلوانی ہے۔ ہفت اقلیم میں لاثانی ہے۔ ان کی وفات کو بیس تیس برس ہوتے ہوں گے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ محمد علی شاہ کے وقت میں خرید اگیا تھا۔ اب کوئی سو برس کا ہوگا دو کم یا دو اوپر۔ مگر اس بڑھوتی وقت بھی وہ بیٹے لوتھڑے ہیں کہ مرغ کو لپک کر لات دے۔ تو وہ بھی چیں بول جائے۔ جیسے باز اور پدے کی لڑائی۔ اور کیوں نہ ہو نمک کس سوُر کا کھاتا ہے، اور نواب صاحب کے جیوٹ پنے کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔ شاہی فوج میں جب دگلے والی پلٹن بگڑی تھی۔ تو ہمارے حضور ہی بھیجے گئے تھے۔ پارسال کی دل لگی سنیئے۔ نواب صاحب کے ماموں تشریف لائے۔ ان میں بھی ریاست کی بو ہے۔ کنکوا تو ایسا لڑاتے ہیں کہ میاں ولایتی ان کے آگے پانی بھریں۔ دو دو تولے افیم پی جائیں۔ اور وہی خم و دم۔ بٹیر بازی کا بھی بڑے سرے کا شوق ہے۔ آپ کا ظفر پیکر تو بلا کا بٹیر ہے۔ بٹیر کیا شیدی لندھور ہے ڈھوہ کا ڈھوہ، جلیسے خاصا چھوٹا تیتر۔ خیر آتے ہی نواب کو لے کر بٹیر دیکھنے گئے۔ میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔ کہ حضور

کو تو بٹیروں کا مدت سے شوق ہے کروڑوں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے۔
مگر صف شکن سا بٹیر تو حضور نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔

ل ۔ ہونہہ! اس کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں عقل کے ناخن لیجیے۔ بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا معنی آپ کو نوک دم بائی سے باہر کر دے۔ حوصلہ ہو تو منگواؤں۔

۔ اچھا ماموں جان! یہ کل شد ہو جائے۔ دو دو چونچیں تو ہوں۔

۔ کیا مضائقہ! مگر اپنا بٹیر آپ مفت میں کٹوائیں گے۔ آپس کی لڑائی سے فائدہ؟ اچھا کل ہو ہی جائے۔ ادھر یا اُدھر۔

الغرض دوسرے دن پالی ہوئی۔ ہزاروں آدمی جوق جوق آ موجود۔ شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکہ کی جنگ ہے۔ بھئی قسم ہے ...ق پیزیں جس نے نہیں دیکھیں اُس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں ... تو دوسرے پیر دمل کی سوگھی۔ ادھر ظفر پیکر اس ٹھاٹھ سے آیا ... میں ور میرا کلیجہ دہلنے لگا۔ مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی۔ جب اب صاحب اس کو بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ پہلے اس کو دانہ تے ہیں۔ پھر کہیں آپ کھاتے ہیں۔ ایک دن خدا جانے بٹی دیکھی یا کیا پنے آپ پھڑکنے لگا۔ نو... سمجھے کہ لوندا ہو گیا۔ پھر تو ایسے دھاروں ئے کہ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ میں نے نواب صاحب کو کبھی روتے یکھا۔ مجالس عزا میں ایک آنسو نہیں نکلتا۔ جب بڑے نواب صاحب ... ہوا تو اشک کا ایک قطرہ بھی نہ گرا۔ بھئی یہ بٹیر ہی ایسا انمول ہے۔ یوں ہے کہ اُس نے اس دن نواب کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا۔ جو کہیں گھٹ جاتا۔ تو بندہ تو جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جنگ میں آبرو تو ہے اور ہے کیا۔ خیر صاحب جیسے ہی دونوں چکھی کھا چکے۔ ظفر پیکر رح صف شکن کی طرف چلا۔ یہ لوڑی دہ گھا گر آتے ہی دبوچ بیٹھا۔ اور

ٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسی ایسی مروڑیاں دیں کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے
ی پھُر سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ نواب کا اس دم چہرہ فق ہو گیا۔ اُور کلیجہ شق،
رپر ہوائیاں چھُوٹنے لگیں۔ نصیب اعداء زہر کھانے کا وقت آن پہنچا کہ اتنے
ں صف شکن قلعی کر کے لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیرا خوب پھرا پالی بھر
ں آواز گونجنے لگی۔ کہ اہو ہو ہو۔ وہ مارا۔ ہاں بیٹے دے بڑھ کے لات۔
ب لات ایسی جمائی کہ ظفر پیکر نے منہ پھیر دیا۔ مُنہ کا پھیرنا تھا کہ صف
کن نے اُچک کر ایک جھنجھوئی بتائی، واہ وا ہوا۔ اسی مقام پر ایک لات
ر کس کر اہو ہو ہو شاباش، واہ پٹھے اہو ہو ہو۔ اتنے میں میاں ظفر پیکر
چ کر کے نوک دم پالی سے باہر، پھُر سے اُڑ گیا۔ پالی پھرتے کہا۔ وہ بھگایا۔
ہ مارا۔ چو طرفہ ٹولیاں اچھل گئیں۔ اُور زفیل بجنے لگیں۔ واہ رہے صف شکن،
فر پیکر گھٹ گیا۔ تو صف شکن کا دل اور بھی بڑھا۔ آج یہ شیر اپنا ثانی نہیں
یکھتا۔

سرشار

شمس العلماء مولوی نذیر احمد دہلوی

مولوی نذیر احمد ۱۰ر دسمبر ۱۸۳۶ء کو ضلع بجنور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں بڑے چلبلے اور شوخ تھے۔ گھڑی بھر بھی ٹک کر بیٹھ نہ سکتے تھے۔

تعلیم حاصل کرنے کے بعد قصبۂ کنجاہ گجرات (پنجاب) میں مدرس ہو گئے دو برس کے اندر اندر ملازمت ترک کر کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو کر کانپور پہنچ گئے۔ لیکن چند ہی دن بعد انگریز انسپکٹر مدارس سے بگاڑ ہوا تو استعفیٰ دے دیا۔

جن دنوں میں الہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ اس زبان میں کچھ شُد بُد حاصل ہو گئی تو ترجمے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ترجمے کا کام ہی انہیں حیدر آباد لے گیا اور وہاں معقول مشاہرے پر لگ گئے۔ حیدر آباد پہنچ کر مولانا اپنے حسنِ عمل سے برابر ترقی کرتے گئے۔ حیدر آباد کے زمانۂ ملازمت میں قرآن مجید حفظ کیا۔

زمانۂ ملازمت سے لے کر موت تک تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ جو اخلاقی اعتبار سے بہت بلند ہیں۔ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر بھی لکھی۔

۱۸۹۷ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی نے ان کو ایل ایل ڈی کی ڈگری دی اور پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی۔ او۔ ایل بنائے گئے۔

۳ر مئی ۱۹۱۲ء کو انتقال ہوا۔ مولانا بڑے سادہ مزاج تھے ہمیشہ سادگی سے رہے اور سادہ لباس پہنا۔ آپ ایک اچھے مقرر بھی تھے۔

مرزا ظاہر دار بیگ اَور کلیم

کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا ہوُا اپنے دوست مرزا کے مکان پہ پہنچا۔ ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی۔ لیکن مرزا جیسے نکتے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی تو جواب نہ دارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی کہ شاید اُس کا نانا وہ بھی حقیقی نہیں۔ ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب رزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اوّل تو عالی جاہ سرکار۔ دوسرے باعتبار منصب اردلی کا جمعدار۔ تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی اس پر خود اس کی رشوت ستانی، بہت کچھ کمایا۔ یہاں تک کہ اس کا اقتدار دہلی کے گردو نواح میں ہو گیا۔

مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے باوجودیکہ دُور کی قرابت تھی۔ حسبةً للہ اُس کا تکفل اپنے ذمّہ لے لیا۔ جمعدار اپنی حین حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کو بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہوگی لیکن جمعدار کے مرنے پر اُس کے بیٹے پوتے نواسے کثرت سے تھے۔ انہوں نے بے اعتنائی کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر کے مرے تھے۔ مگر ان کے ورثاء نے بہزار دقّت محل سرائے کے پہلو میں ایک بہت چھوٹا قطعہ ان کے رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینہ کی کرایہ کی دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔

یہ تو حال تھا کہ مرزا، مرزا کی ماں، مرزا کی بیوی تین تین آدمی اور سات روپیہ کی کل کائنات۔ اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ اس ہستی پر چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ ماہوار کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اُس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی

ان میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان، کبھی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بتاتا۔ اور وہ لوگ اس کے ادعائی رشتوں ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اُونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زبوں تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نبھتی تو کیسے نبھتی۔ دکانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بیچاری بہتیرا بکتی۔ مگر کون سُنتا تھا۔

کلیم سے اور مرزا سے محفلِ مشاعرہ میں تعارف پیدا ہُوا۔ شدہ شدہ مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے یہاں تک کہ چند روز سے تو دونوں میں ایسی گاڑھی چھننے لگی تھی گویا ایک جان دو قالب تھے۔ کلیم کو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہُوا تھا۔ مگر مرزا شام کو تو کبھی کبھی لیکن صبح تو بلاناغہ آتے۔ اور تمام دن کلیم کے پاس رہتے۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم یہی جانتا تھا کہ جمعدار کا تمام ترکہ مرزا کو ملا۔ اور وہ جمعدار کی محل سرا اور جمعدار کے دیوان خانے کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کو مرزا کے نوکر سمجھتا تھا۔ اور اسی غلط فہمی میں وہ گھر سے نکلا۔ تو سیدھا جمعدار کی محل سرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہُوا۔ بار بار کے پکارنے اور کُنڈی کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں۔ اور ان میں سے ایک نے پوچھا۔

کون صاحب ہیں۔ اور اتنی رات گئے کیا کام ہے؟

کلیم:۔ "جاؤ مرزا کو بھیج دو۔"

لونڈی:۔ "کون مرزا؟"

کلیم:۔ "مرزا ظاہر دار بیگ! جن کا مکان ہے۔ اور کون مرزا؟"

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی پھر کواڑ بند کرلے۔ کہ جلدی سے کلیم نے کہا۔

کیوں جی! کیا یہ جمعدار صاحب کی محل سرا نہیں ہے؟

لونڈی:۔ "ہے کیوں نہیں؟"

کلیم:۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں۔ کیا ظاہر دار بیگ

جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں ؟"

لونڈی :۔ "جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے مو اظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہوتا ہے ؟"

دوسری لونڈی :۔ "ارے کمبخت ! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا تھا (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نا! جن کی رنگت زرد زرد ہے۔ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دُبلا ڈیل۔ اپنے تئیں بہت بنائے سنوارے رہا کرتے ہیں ؟"

کلیم :۔ "ہاں ہاں وہی ظاہر دار بیگ !"

لونڈی :۔ "تو میاں ! اس مکان کے پچھواڑے آپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اس میں رہتے ہیں ۔"

کلیم نے وہاں جا کر آواز دی تو کچھ دیر بعد مرزا صاحب ننگ دھڑنگ جانگیا پہنے ہوئے باہر تشریف لائے۔ اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے اور بولے آہا! آپ ہیں! معاف کیجیے گا۔ میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندے کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے پہن آؤں تو آپ کے ہمرکاب چلوں ۔"

کلیم :۔ "چلیئے گا کہاں ! میں آپ ہی کے پاس تک آیا تھا ۔"

مرزا :۔ "پھر اگر کچھ دیر تک تشریف رکھنا منظور ہو۔ تو میں اندر پردہ کرا دوں ؟"

کلیم :۔ "میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں ۔"

مرزا :۔ "بسم اللہ ! تو چلئے اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے۔ میں ابھی آیا ۔"

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت پرانی چھوٹی سی مسجد ہے۔ وہ بھی ویران، وحشت ناک، نہ کوئی حافظ ہے نہ ملّا، نہ طالب علم نہ مسافر، ہزارہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں۔ کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھڑنجے کا فرش

بن گیا ہے ۔

مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کے بعد کہ کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے۔ مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے کہ بندے کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے۔ خفقان کا عارضہ اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا ہوں تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی۔ پہلے یہ تو فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب، اپنا انکار، بھائی کی التجا، ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا: پھر اب ارادہ کیا ہے؟

کلیم: سوائے اس کے کہ گھر لوٹ کر جانے کا ارادہ تو نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا: خیر نیت شب حرام۔ صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمایئے۔ میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں۔ اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم: یہ ماجرا کیا ہے۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے یہاں دوہری محل سرائیں متعدد دیوان خانے کئی پائیں باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دکانیں اور سرائیں۔ میں تو جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہوگی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک متنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے کہے ان سے ثابت ہوتا تھا کہ جمعدار کے تمام ترکہ پر تم قابض اور متصرف ہو لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا: "آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے اور آپ سے صحبت رہی مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور میری عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلافِ حالت جو آپ دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ بندے کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنیٰ کیا تھا۔ اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل رؤسا اس سے واقف اور آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندے کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے اندر باہر واویلا مچی ہوئی ہے۔ اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منائے جائیں۔"

کلیم: "لیکن آپ نے کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا!"

مرزا: "اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا۔ تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت اور حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے رہنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بچھوا دوں۔ اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔"

کلیم: "خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو بھیج دیجئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔"

مرزا: "چراغ کیا۔ میں نے تو لیمپ روشن کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہو جیئے گا۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی بہت کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنے شروع ہوں گے اور آپ کا بیٹھنا دشوار کر دیں گے۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔"

کلیم جب گھر سے نکلا۔ تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ

اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی۔ اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود ہی پوچھیں گے۔ تو کہہ دوں گا۔

مرزا کو ہرچند کھانے کے نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اوّل تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے لڑ کر نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض ہی نہ ہوا۔ اور کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ہو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا۔ اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہوا چاہتا ہے تو بیچارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ سنو یارا میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔

مرزا: "سچ کہو۔ نہیں جھوٹ بہکاتے ہو؟"

کلیم: "تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں"۔

مرزا: "مردِ خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے دکانیں سب بند ہو گئیں۔ اور جو دو ایک دکان کھلی بھی ہیں۔ تو باسی چیزیں لگائی ہوں گی جن کے کھانے سے فاقہ بہتر۔ گھر میں تو آج آگ تک نہیں سلگی۔ مگر بظاہر تم سے بھوک کی سہار ہونی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ بیٹھے بٹھائے کو زیر کرنا بڑی بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آئی ہے کہ جاؤں چھدامی بھڑبھونجے کے یہاں سے گرما گرم خستہ چنے کی دال بنوا لاؤں۔ بس ایک دھیلے کی مجھ کو اور تم کو دونوں کو کافی ہو گی۔ رات کا وقت ہے"۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے، اور چشم زدن میں چنے بھنوا لائے۔ مگر دھیلے کے کہہ گئے تھے یا تو کم کے لائے یا راہ میں دو چار پھنکے لگائے اس واسطے کہ کلیم کے روبرو دو تین مٹھی چنے سے زیادہ

نہ تھا۔

مرزا۔ یار ہو بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مِل گیا ذرا واللہ ہاتھ تو لگائیے دیکھو تو کیسے کھِلس رہے ہیں۔ اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس اور مٹی کا عطر نکالا۔ مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ کوئی فن ہو کمال بھی کیا چیز ہے۔ دیکھیے! اتنی تو رات گئی ہے مگر حمیدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سے سنا ہے کہ حضور والا کے خاصہ میں حمیدامی کی دکان کا چنا بلاناغہ طلب کر جاتا ہے۔ اور واقعہ میں ذرا آپ غور سے دیکھئے کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم! سچ کہنا۔ ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے؟ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا مذکور اور دالوں کی رنگت دیکھیے۔ کوئی بسنتی ہے کوئی پستی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اُگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سُنی ہے؟"

کلیم۔" فرمائیے!"

مرزا۔" چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے۔ فریاد لیکر گیا کہ یا حضرت! میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے کہ جیوں جیوں میں نے سرزمین سے باہر نکالا۔ تیر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں کسی پر نہیں ہوتے۔ نشوونما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بنا گئے، اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بار آور ہوا تو خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آدمی بکورے بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی تو ہولے

کرنے شروع کئے۔ پکّا تو شاخ و برگ خس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخِ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ اس کو چکی میں دلیں گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں اُبالیں گھونگنیاں پسائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی رہتی ہیں۔

چنے کا حضرتِ میکائیل کے دربار میں اس طرح بے باکانہ چڑ چڑ بولنا تھا کہ حاضرینِ دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اس کے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر بے انتظارِ حکم آخر رخصت ہوا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذّت کے بنے ہیں کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا۔ ورنہ میرے مَدّے کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں۔ غرض مرزا نے اپنی چرب زبان سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔

کلیم بھوکا تو تھا ہی۔ اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور ایک کثیف سا تکیہ بھیج دیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا اس قدر متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا تو خلوت خانے اور عشرت منزل میں تھا یا اب ایک مسجد میں آ کر پڑا۔ اور مسجد بھی ایسی جس کا حال ہم نے تھوڑا سا اوپر بیان کیا۔

گھر کے الوانِ نعمت کو لات مار کر نکلا تھا۔ تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی، نہ بہن نہ بھائی، نہ مونس نہ غمخوار نہ نوکر نہ خدمت گار مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا جیسے قید خانے میں حاکم کا گنہگار یا قفس میں مُرغِ نوگرفتار۔ اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا۔ اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجروم باپ کے ساتھ نمازِ صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھنے کو تھے۔ اُس نے رات بھر میں ایک قصیدہ تو مسجد کی ہجو میں تیار کیا۔ اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔

صبح ہونے آنکھ لگ گئی تو نہیں معلوم، مرزا یا محلّے کا کوئی اور عیّار ٹوپی، جوتا، رُومال، چھڑی، تکیہ دری یعنی جو چیز کہ کلیم کے بدن سے منفک اور اُس کے جسم سے جُدا تھی۔ لے کر چمپت ہُوا۔ یوں بھی کلیم بہت دیر تک سوکر اُٹھتا تھا۔ اور آج تو ایک خاص وجہ تھی کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرشِ مسجد پہ پڑا ہے۔ اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبھوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہُوا ہے۔ حیران ہُوا کہ قلب ماہیت ہوکر میں کہیں بھُتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا۔ اُدھر دیکھا کہیں پتہ نہیں ۔

مسجد تھی ویران اس میں پانی کہاں! صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آنکلے تو اُس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں۔ یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں ۔

اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے ایک لڑکا کھیلتا ہُوا آیا۔ جوں ہی زینہ پر چڑھا۔ تو کلیم اس سے عرضِ مطلب کرنے کے لئے لپکا۔ وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ ڈر کر بھاگا۔ خدا جانے۔ اس نے اس کو بھُوت سمجھا یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا۔ اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی۔ اور جب اندھیرا ہُوا تو اُلّو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سیدھا مرزا کے مکان پر گیا۔ آواز دی تو یہ جواب ملا کہ وہ تو بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی کو پانی مانگے۔ اور مرزا کی پھٹی پُرانی جُوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے ۔

یہ سوچ کر اُس نے کہا کہ کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں؟ اندر سے آواز آئی "ہم تمہاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام ونشان بتاؤ تو معلوم ہو۔"

کلیم "میرا نام کلیم ہے۔ اور مجھ اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بڑی دوستی ہے بلکہ میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔"

گھر والے "وہ دری اور تکیہ کہاں ہے جو رات تمہارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔"

تکیہ و دری کا نام سُن کر کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں تامّل تھا کہ اندر سے آواز آئی۔ مرزا زبردست بیگ دیکھنا! یہ مُردہ انہیں چل نہ دے۔ دوڑ کر تکیہ دری تو اُس سے لو۔

کلیم یہ بات سُن کر بھاگا۔ ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جا لیا۔

ہر چند کلیم نے مرزا ظاہردار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ثابت کئے۔ مگر زبردست کا ٹھینگا سر پہ۔ اُس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

"توبۃ النصوح"

عبدالحلیم شرر

مولانا عبدالحلیم شرر ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ اور پھر کلکتہ اور دہلی میں تعلیم کے باقی مدارج طے کیے۔

آپ اردو کے مشہور انشاپرداز، ناول نویس اور مؤرخ تھے۔ طرز جدید کی ناول نویسی کے آپ موجد ہیں۔ آپ کے ناول زیادہ تر تاریخی ہیں جن سے اردو داں طبقے میں تاریخ بینی کا ذوق پیدا ہوا۔ ایک ماہانہ رسالہ دلگداز بھی نکالتے تھے آپ کے مضامین اور تصانیف کثرت سے ہیں۔ ملک العزیز ورجنا، فردوس بریں، ایام عرب اور تاریخ سندھ وغیرہ ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ مضامین آٹھ جلدوں میں الگ شائع ہوئے ہیں۔ مولانا نے اردو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ اور یہ کہنا غیر حق بجانب نہیں کہ اردو کے شعبۂ ناول نگاری میں ان کو بہت بلند حیثیت حاصل ہے۔

پریوں کا غول

اب تو ۱۳۵۱ھ ہجری ہے۔ مگر ڈیڑھ سو سال پیشتر سے سیاحوں اور خاصتہً حاجیوں کے لئے وہ اونچی نیچی سڑک نہایت ہی اندیشہ ناک اور پرخطر ہے۔ جو بحرِ خضر (کیسپین سی) کے جنوبی ساحل سے شروع ہوئی ہے۔ اور شہر آمل میں سے ہو کے شاہنامے کے قدیم دیوستان یعنی ملک مازندراں اور علاقہ۔ ودبار سے گزرتی اور کوہسار طالستان کو شمالاً جنوباً قطع کرتی ہوئی شہر قزوین کو نکل گئی ہے۔ مدتوں سے اس سڑک کا یہ حال ہے کہ دن دہاڑے بڑے بڑے قافلے لٹ جاتے ہیں۔ اور بے گناہوں کی لاشوں کو برف اور سردی مظلومی و قتل و غارت کی یادگار بنائے سالہا سال تک باقی رکھتی ہے۔

ان دنوں ابتدائے سرما کا زمانہ ہے۔ سالِ گزشتہ کی برف پوری نہیں گھلنے پائی کہ نئی تہہ جمنا شروع ہو گئی۔ مگر ابھی تک جاڑا اتنے درجے کو نہیں پہنچا کہ موسم بہار کے نمونے اور فصل گل کی دلچسپیاں بالکل مٹ گئی ہوں۔ آخری موسم کے دو چار پھول باقی ہیں۔ اور کہیں کہیں ان کے عاشق و قدر دان بلبلِ بدخشانی بھی اپنی ہزار داستانی نغمہ سنجی کے راگ سناتے نظر آجاتے ہیں۔ یہ کوہستان عرب کے خشک و بے گیاہ پہاڑوں کی طرح برہنہ اور دھوپ میں جھلسے ہوئے نہیں۔ بلکہ ہر طرف سایہ دار درخت اور گھنی جھاڑیوں نے نیچر پرستوں اور قدرت کے حقیقی قدر دانوں کے لئے عمدہ عمدہ عزلت کدہ اور انتہائی خلوت گاہیں بنا رکھی ہیں۔ اور جس جگہ درختوں کے جھنڈ نہ تھے۔ وہاں آسمان کے نیلے شامیانے کے نیچے قدرت نے گھاس کا سبز اور مخملی فرش بچھا دیا ہے۔ جس پر بیٹھ کو کوئی شراب شیراز کا لطف اٹھانا چاہے تو یہاں نہر آکنا کے بدلے نہر دیر نجان موجود ہے۔ جو شاید ابھی پوری ڈیڑھ صدی

بھی نہیں گذرتی کہ رودِ سفید سے کاٹ کے پہاڑوں کے اندر ہی اندر مختلف گھاٹیوں میں گھومتی اور آخر شہر خرم آباد کے قریب بحرِ اخضر میں گرائی گئی ہے۔

ان ہی دلچسپیوں اور قدرت کے انہی نظر فریب منظروں نے اس کوہسار کے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیئے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنت انہیں گھاٹیوں میں ہے۔ اور بعض سمجھتے ہیں کہ قدیم دیوزادوں کو تو کیومرث و رستم نریمان کے زورِ بازو نے فنا کر دیا۔ مگر ان کی یادگار میں بہت سی پریاں آج تک ان تنہائی کے مقامات میں سکونت پذیر ہیں۔ خوش عقیدہ لوگوں میں سے اکثر نے ان پریوں کو اُڑتے دیکھا ہے اور بعض سیاحوں کو تو پریوں کے بڑے بڑے ہوشربا غول جو گھاٹیوں سے نکل پڑتے ہیں نظر آئے۔ یہ بھی سُنا جاتا ہے کہ جو کوئی یکہ و تنہا ان پریوں کے غول میں پڑ جاتا ہے فوراً مر جاتا ہے۔

مگر پریوں اور قدیم دیووں سے زیادہ ظالم ملاحدہ اور باطنیہ لوگ ہیں۔ جو اس تمام علاقہ میں آباد اور پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جو پرانے اصول و عقائد کا مسلمان اُن کے ہاتھ میں پڑ جاتا ہے۔ کسی طرح جان بر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جمادی الاول، جمادی الثانی، اور رجب کے مہینوں میں ان مظالم کی دھوم مچ جاتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ علاقہ ہائے ترکستان، کرغیز اور استراخان کے مسلمان جب حج کو جاتے ہیں۔ تو جہازوں پر بحرِ خضر سے پار ہو کے اسی علاقہ میں اُترتے اور اسی کوہسار طالستان کو طے کرتے ہوئے ارضِ عراق کو جاتے اور وہاں سے خاکِ پاکِ حجاز کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کے مظالم کی ہر جگہ شہرت ہو گئی ہے۔ اور بہت سے لوگوں نے یہ رستہ چھوڑ دیا ہے۔ مگر پھر بھی بعض بے پروا مسلمان اپنی خوش اعتقادی کے جوش میں آ نکلتے ہیں۔ علی الخصوص آمل اور اس کے مضافات کے لئے تو اور کوئی راستہ ہی نہیں۔

یہ سڑک جس کا اوپر ذکر آیا بہت دُور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر ہمارے پیشِ نظر صرف وہی حصہ ہے۔ جہاں یہ سڑک نہرو برنجان کے کنارے گذرتی ہے۔ اسی مقام سے علاقہ رودبار کے میدان ختم ہو گئے ہیں۔ اور کوہستان کے سخت

اور پیچیدہ نشیب و فراز کی ابتداء ہوتی ہے یہاں سے کچھ آگے بڑھ کر سڑک اوپر جاتی گئی ہے۔ اور نہر کوہ البرز کے دامنوں میں چکر کھا کر دشوار گزار اور پیچیدہ گھاٹیوں میں غائب ہوگئی ہے۔

شام میں شاید چند ہی گھڑیاں باقی ہوں گی۔ آفتاب سامنے برف آلودہ چوٹیوں کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس کی کمزور کرنوں میں جو تھوڑی بہت گرمی پیدا تھی مٹ گئی۔ اور ہوا کے سرد جھونکے جو بلند برفستان سے پھسلے آتے ہیں انسان کو کپکپا دینے کے لئے کافی ہیں۔

اس جگہ پر اور ایسی حالت میں شمال کی طرف دو مسافر سر سے پاؤں تک کپڑوں میں لپٹے ہوئے آہستہ آہستہ آ رہے ہیں۔ اور دونوں دو چھوٹے چھوٹے اور تھکے ماندہ گدھوں پر سوار ہیں۔ اُن کی سست روی اور مجموعی حالت سے خیال ہوتا ہے کہ کسی گاؤں کے غریب ملا یا فقیر ہیں۔ جو امارت اور سپاہیانہ دولول وصفوں سے جدا کسی دینی فرض اور تقدس کی شان سے مذہبی سفر کو نکلے ہیں۔ مگر نہیں وہ قریب آگئے اور معلوم ہوا کہ نہ ملا ہیں اور نہ مشائخ۔ بلکہ دو نوعمر شریف زادے ہیں۔ اور حیرت ہے کہ دونوں میں سے ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ ان کے لباس وضع سے چاہے نہ ظاہر ہو۔ مگر بشرے بتائے دیتے ہیں کہ کسی معزز خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ اور ممکن نہیں کہ کسی نامی اور شریف گھرانے سے ہی تعلق رکھتے ہوں۔ اس لئے کہ موٹے موٹے اور لمبے چوڑے کمبلوں کے نیچے جنہیں سر سے لپیٹ لیا ہے۔ دونوں شرفائے آمل کا لباس پہنے ہوئے ہیں"۔

مولانا شرر اس کے بعد لڑکی اور لڑکے کے لباس اور حسن خداداد کی تعریف کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"یہ دونو عمر مسافر چاروں طرف کے منظروں کو دیکھتے ہیں اور مقامی دشواریوں کی وجہ سے دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ اور خاموش ہیں۔ دن کے آخر ہو جانے کے خیال سے ان کے نازک چہرے جنہوں نے ابھی تک پختگی نہیں

حاصل کی پریشان ہونے لگے ہیں۔ مگر اس پر بھی خموشی کا قفل نہیں کھلتا۔ ناگہاں کسی وزنی جذبے سے مغلوب ہو کر نازنین لڑکی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور باریک دلفریب آواز میں پوچھا۔ آج کون دن ہے ؟"

نوجوان۔ (چپکے ہی چپکے کچھ حساب لگا کے) جمعرات "

لڑکی " (حسرت آمیز لہجے میں) " تو ہمیں گھر چھوڑے آج پورے آٹھ دن ہو گئے۔ (ذرا تامل کر کے) خدا جانے لوگ کیا کیا باتیں کہتے ہوں گے۔ اور کیسی کیسی رائیں قائم کی جاتی ہوں گی ؟"

نوجوان " یہی کہتے ہوں گے کہ حج کے شوق نے ہم سے وطن چھڑایا "

لڑکی " (پھر ایک آہ سرد بھر کر) مجھے الزام بھی دیتے ہوں گے کہ نامحرم کے ساتھ چلی آئی "

نوجوان " زمرد (اس لڑکی کا نام) اب میں نامحرم نہیں ہوں (دو ہی چار روز میں ہم قزوین میں پہنچ جائیں گے۔ اور وہاں پہنچتے ہی ہمارا نکاح ہو جائے گا "

زمرد۔ (پھر ٹھنڈی سانس بھر کر) " خدا جانے وہاں تک پہنچنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں ؟"

نوجوان " کیوں ؟"

زمرد " رستے کی دشواریاں تو مشہور ہی ہیں۔ کوئی خوش نصیب مسافر ہوگا جو پریوں کے سایہ سے بچ کر نکل جاتا ہو۔ اور ان سے بچ بھی جائے تو ملاحدہ کیوں چھوڑنے لگے ؟"

(اس مقام نے اُسے کوئی خاص بات یاد دلا دی ہے جس کی وجہ سے وہ چاروں طرف کے منظر کو ہر طرف مڑ کے دیکھ رہی ہے۔ نوجوان نے اس بات کا خیال بھی نہیں کیا۔ اور معمولی لہجے میں کہنے لگا:۔

ملاحدہ کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہے اس لئے کہ ان کے مشہور نقیب آہل۔ ملا ہیبت اللہ سے مجھے ایک خط مل گیا ہے۔ وہ خط ہمیں مجرب تعویذ کا

کام دے گا اور اس کے پیش کرتے ہی ہر قزلطی کے دستِ ستم سے نجات پائیں گے ؟"

یہ باتیں کرتے کرتے دونوں نوعمر مسافر اس مقام پہ پہنچے جہاں سے سڑک تو کوہسار کی بلندی پر چڑھنا شروع ہوتی ہے۔ اور نہر اس سے جُدا ہو کر دشوار گزار گھاٹیوں اور گھنی خاردار جھاڑیوں میں گھسنے کے لئے داہنی جانب مُڑ گئی ہے۔ نوجوان نے اپنے گدھے کو سڑک پر آگے بڑھایا ہی تھا کہ زمرد باگ روک کر کھڑی ہو گئی اور کہا۔ نہیں حسین! (یہ اس نوجوان کا نام ہے)

حسین۔ (حیرت سے زمرد کی طرف دیکھ کے) پھر کدھر؟

زمرد۔" جدھر نہر گئی ہے ؟"

حسین۔" اُدھر تو راستہ نہیں ؟"

زمرد۔" تم چلو تو سہی۔"

حسین۔" آخر قزوین چلتی ہو یا کہیں اور ؟"

زمرد۔" نہیں۔ میرا منزل مقصود قزوین نہیں مجھے تو دیکھنا ہے کہ یہ نہر کدھر گئی ہے ؟"

حسین۔" اس طرف تو پریوں کا نشیمن ہے ؟"

زمرد۔" ہونے دو ؟"

حسین۔" سنتا ہوں کوئی ادھر سے زندہ نہیں آتا ؟"

زمرد۔" یہی میں بھی چاہتی ہوں۔"

حسین نے تعجب اور حیرت سے زمرد کی صورت دیکھی۔ اور ایک متانت کی آواز سے کہا۔ اور وہ حج کی نیت کو کیا ہو گا ؟

زمرد۔" ہے مگر اپنے بھائی موسیٰ کی قبر پہ جا کے فاتحہ پڑھ لوں۔ تو مکہ معظمہ کا ارادہ کریں ؟"

حسین۔" تمہارے بھائی کی قبر۔ مگر یہ کیسے خبر کہ کہاں ہے ؟"

زمرد۔" مجھے معلوم ہے۔ رستہ بھی جانتی ہوں اور اس مقام کو بھی ؟"

حسین (حیرت سے) تم! تم کیا جانو؟"
زمرد:" خوب جانتی ہوں۔"
حسین:" کیا کبھی آئی تھیں؟"
زمرد:" نہیں۔ مگر یعقوب جو بھائی موسیٰ کے مرنے کی خبر لایا تھا۔ اُس سے پورا پتہ دریافت کر چکی ہوں۔ پہلی نشانی تو یہی ہے کہ جہاں سے نہر، سڑک سے علیحدہ ہوئی ہے۔ سڑک چھوڑ کر نہر کے کنارے کنارے جانا چاہیئے۔ اور بعد کی نشانیاں آگے چل کے بتاؤں گی۔"
حسین۔ یعقوب کو کیا معلوم؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بلند اور پیچ در پیچ پہاڑوں میں کوئی شخص کہاں اور کیونکر مارا گیا؟"
زمرد:" تم نہیں جانتے۔ بھائی موسیٰ اور یعقوب دونوں ساتھ تھے۔ اس مقام پر پہنچ کے نہر کے کنارے کچھ دُور گئے تھے کہ کوہ البرز سے پریوں کا غول اُترا۔ اُن کے ہاتھوں سے بھائی تو مارے گئے اور یعقوب غش کھا کے گر پڑا۔ دوسرے دن جب اُسے ہوش آیا۔ تو بھائی کی لاش پڑی پائی۔ انہیں دفن کیا اور پھر قبر بنا کے اور قبر کے پاس ہی ایک پتھر پر اُن کا نام کندہ کرا کے واپس آیا۔"
حسین:" مجھے تو گپ معلوم ہوتی ہے۔ آخر اس کا سبب کہ پریوں نے یعقوب کو تو زندہ چھوڑ دیا اور تمہارے بھائی مارے گئے۔"
زمرد:" اس کا سبب یہ ہوا کہ بھائی نے ایک پری کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور یعقوب بُزدل تھا۔ پریزادوں کو دیکھتے غش کھا کے گر پڑا۔"
حسین:" پھر ایسے مقام پر تو ہرگز نہ جانا چاہیئے۔"
زمرد:" نہیں! حسین میں تو ضرور جاؤں گی۔"
حسین:" فرض کرو کہ ہم وہاں پہنچے۔ اور ہمارے سامنے پریاں اُتریں تو؟"
زمرد:" میں تو اُن سے ڈرتی نہیں اگر تمہیں خوف ہے نہ چلو۔"
حسین:" تم اکیلی جاؤ اور میں نہ چلوں! میں جو تمہاری محبت میں ہر وقت جان

دینے کو تیار ہوں۔

زمرد۔ "حسین! سنو۔ میں تمہارے ساتھ نہ آتی۔ یہ مانتی ہوں کہ تم شریف ہو۔ اور اس زمانہ سے جبکہ ہم دونوں مکتب میں ساتھ پڑھتے تھے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ایک شریف لڑکی کو تم فقرہ دے کے گھر سے نکال لائے ہو۔ میں خود اپنے شوق سے آئی ہوں۔ فقط اتنی امید پر کہ بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کے دو آنسو بہاؤں گی۔ جب یہ مقصد پورا ہو لے گا۔ تو حج کو چل دوں گی۔"

حسین۔ "زمرد! اپنی جوانی اور اس کمسنی پر ترس کھاؤ۔ اور اس ارادے سے باز آؤ۔"

زمرد۔ "نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی آرزو کے لئے بے عزتی گوارا کی۔"

حسین۔ (مایوسی کی آواز سے) "خداوندا! اگر جان بھی جائے۔ تو پہلے میں مارا جاؤں۔ زمرد! تیری مصیبت ان آنکھوں سے نہ دیکھی جائے گی!"

زمرد۔ (مسکرا کے) "گھبراؤ نہیں۔ ہم دونوں کی کشش ایک دوسرے کو کھینچ لے گی۔ مارے گئے۔ تو دونوں مارے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر زمرد نے اپنے گدھے کو نہر دیرنجان کی طرف موڑا۔ دو ہی قدم چلی ہو گی کہ حسین نے پھر روک کے کہا۔ "زمرد! ذرا صبر کرو۔ چلنا ہے تو کل چلنا۔ اب شام ہوا چاہتی ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔"

زمرد۔ "بس اب چلے ہی چلو۔ کہیں آبادی ملنے کی امید نہیں۔ اور جب جنگل ہی میں ٹھہرنا ہے۔ تو یہاں وہاں دونوں جگہ برابر ہے۔"

حسین سے کسی طرح انکار کرتے نہ بن پڑی۔ چل کھڑا ہوا۔ اور دل میں پس و پیش کرتا ہوا زمرد کے ساتھ کوہ البرز کی تیرہ و تاریک گھاٹی میں گھسا۔ اب آہستہ آہستہ دونوں چلے جاتے ہیں۔ اور اس سنسان مقام کا رعب دلوں پر اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ بالکل خاموش ہیں۔ جوں جوں آگے بڑھتے ہیں۔ جنگل گھنا ہوتا جاتا ہے۔ سردی ساعت بساعت بڑھ رہی ہے۔ سناٹے نے نہر

کے بہنے کی آواز زیادہ تیز کردی ہے جس سے اس مقام کے وحشت ناک منظر میں ہیبت بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اب رستہ دشوار ہے۔ گدھوں سے اُترنا پڑا۔ دونوں آگے پیچھے اپنے گدھے کے دہانے ہاتھ میں پکڑے، چٹانوں سے بچتے اور جھاڑیوں میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ آخر دیر کے سکوت کے بعد حسین نے مرعوب ہو کے کہا "بے شک! دیو، پری ایسے ہی سناٹے کے مقام میں رہتے ہیں۔ انسان کیا معنی یہاں تو جانور کا بھی پتہ نہیں۔"

زمرد "ہاں۔ اور سُنتی ہوں کہ اس نہر میں اکثر جگہ پریاں نہاتی اور بال کھولے ہوئے آپس میں کھیلتی اور چھینٹیں اُڑاتی بھی نظر آ جایا کرتی ہیں۔"

حسین۔ (چونک کر) "ایں! یہ سنسنانے کی آواز کیسی تھی۔ جیسے کوئی چیز سن سے کانوں کے پاس سے آگے نکل گئی؟"

زمرد "یہ تو مشہور بات ہے کہ پریوں کے تخت چاہے اُڑتے نظر نہ آئیں۔ مگر ان کے سن سے نکل جانے کی آواز ضرور سُنائی دیتی ہے۔"

حسین "یہ بھی ممکن ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی جانور تھا۔"

زمرد "جانور ہوتا تو دکھائی دیتا۔"

حسین۔ "اگرچہ ابھی آفتاب نہیں غروب ہوا مگر تم یہاں دیکھ رہی ہو کہ شام سے بھی زیادہ اندھیرا ہے۔ ایسے دھندلکے میں بعض اوقات اُلو یا بڑے بڑے چمگادڑ بھی اسی طرح سناٹے کی آواز سے اُڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔"

زمرد "لیکن اصل میں یہ بھی پری زاد ہیں۔ جو مختلف جانوروں کی صورت میں رات کو نکلتے ہیں۔"

حسین "ہوگا۔"

اتنا کہہ کے اُس نے گرد کے سین کو وحشت اور بُزدلی کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور نہایت پریشانی کی آواز میں کہا "شام ہوا چاہتی ہے اور تمہارے بھائی کی قبر کا کہیں پتہ نہیں۔"

زمرد "مگر میں تو بھائی کی قبر تک پہنچے بغیر دم نہ لوں گی۔"

یہ کہتے ہی ایک تاریک گھاٹی نظر آئی جس میں نہر تو گئی ہے۔ مگر دونوں جانب ایسی چکنی اور کھڑی چٹانیں ہیں کہ انسان کا گزرنا بہت دشوار ہے۔ اس گھاٹی کی صورت دیکھتے ہی زمرد ایک شوق دار بے خودی کی آواز میں چلا اٹھی:-

"ہاں! دیکھو۔ یہ دوسری علامت ہے۔ اسی میں سے ہو کے رستہ گیا ہے"

حسین "مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ ادھر سے ہم جائیں گے کیونکر"

زمرد۔ "جس طرح بنے گی۔ جاؤں گی"

حسین "اور یہ گدھے"

زمرد۔ "ان کو یہیں چھوڑ دو۔ واپس آ کے لے لینا"

حسین نے اس مستقل مزاجی اور دھن پر زمرد کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر گدھے درختوں سے باندھے۔ اور دونوں چٹانوں سے چمٹتے اور ہاتھوں سے پتھروں کے سروں اور درختوں کو پکڑتے ہوئے آگے کو روانہ ہوئے۔ کوئی دو گھڑی کی محنت کا سفر کیا ہوگا کہ گھاٹی ختم ہو گئی جس سے نکلتے ہی دونوں نے حیرت سے دیکھا کہ نہر ویرخان اس گھاٹی سے گزر کر یکایک ایک نہایت فرح بخش مرغزار میں بہنے لگی۔ یہ عجیب لطف کا مقام تھا۔ قدرت نے خود ہی چمن بندی کر دی تھی۔ شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کے تختے دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ نغمہ سنج طیور بھی یہاں کثرت سے نظر آئے۔ جو ہر طرف شاہدان چمن کے حسن و جمال پر صدقے ہوتے پھرتے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ اور یہ جوش میں ابھرے ہوئے عاشقان شاہد گل اپنے معشوقوں کو آخری الوداع کہہ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھتے ہی زمرد نے خوش ہو کے کہا۔ "اب ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ اسی وادی میں بھائی موسیٰ مارے گئے۔ اور یہیں کہیں اُن کی قبر بھی ہوگی!"

یہ کہہ کر زمرد ایک نازک بدن اور چست و چالاک ہرنی کی طرح چاروں طرف دوڑی۔ اور ایک بڑے پتھر کے پاس ٹھہر کے چلائی۔

"آہ! یہی میرے بھائی کی قبر ہے!"

اس آواز کے سنتے ہی حسین بھی ادھر دوڑ گیا اور دیکھا کہ ایک چٹان پر موسیٰ نام کھدا ہوا ہے۔ اور اس کے قریب ہی چند پتھروں کو برابر کر کے ایک قبر کی صورت بنا دی گئی ہے۔ دونوں نے یہاں کھڑے ہو کے فاتحہ خوانی کی۔ مگر زمرد کے دل پر حسرت و اندوہ کا اس قدر غلبہ ہوا کہ فاتحہ کے ختم ہونے سے پہلے ہی گر پڑی۔ اور قبر سے لپٹ کے زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بہت کچھ تسلی دی۔ نہر سے پانی لا کے منہ دھلایا۔ اور رات کے اندھیرے میں اپنی حور وش معشوقہ کو اپنی گود میں لے کے بیٹھا اور سمجھانے لگا۔

زمرد۔ (ہچکیاں لے لے کے) حسین! مجھے اپنی زندگی کی امید نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مروں گی۔ ہاتھ پاؤں سنسنا رہے ہیں۔ کلیجے میں میٹھا میٹھا درد ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ مگر مرنے سے پہلے ایک وصیت ہے۔ مر جاؤں تو میری لاش کو بھی انہیں پتھروں کے نیچے دبا دینا۔ جن کے نیچے بھائی موسیٰ کی ہڈیاں ہیں۔"

حسین۔ (نہایت مستقل مزاجی سے۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پی کر) "یہ وصیت اگر پوری ہونے والی ہو گی۔ تو کسی اور ہاتھ سے یہ وصیت پوری ہو گی۔ میں تمہارے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس کے ہاتھ سے یہ وصیت پوری ہو گی۔ وہ تمہارے ساتھ میری ہڈیوں کو بھی ان ہی پتھروں کے نیچے دبائے گا۔"

زمرد۔ (خوشامد کے لہجے میں) "نہیں حسین! ایسا نہ کرنا۔ تم کو ابھی نہیں معلوم کہ مجھے کیا چیز یہاں کھینچ لائی ہے۔ نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ بھائی کی محبت ہے اور نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یعقوب کے بیان میں کوئی جادو تھا۔ مگر جس روز اس نے بھائی موسیٰ کی حسرت نصیب داستان سنائی۔ اس کے دوسرے دن میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے بھائی اس وادی میں کھڑے ہیں۔ خواب ہی میں انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بلایا اور

تاکید کرکے کہا۔ کہ میری قبر پر آکر فاتحہ پڑھا! مرحوم بھائی نے کچھ ایسی پُرشوروضع سے بلایا تھا کہ ان کی اُس وقت کی صورت اس وقت تک میرے سامنے پھر رہی ہے۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں یہاں بھائی کی بلائی ہوئی آئی ہوں"۔

حسین۔ (دونوں کریہ ہے بے اختیار ہوکر اور ایک بے انتہا خوشی کے ساتھ) خیر! تمہیں تو انہوں نے خواب میں فقط بلایا تھا اور مجھے تم خود اپنے ساتھ لائی ہو"۔

زمرد۔ "ہاں! میں تم کو ساتھ لائی ہوں۔ اور اسی سبب سے کہ اس دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ میری تمنا اور آرزو یہ ہے کہ تمہارے پہلو میں تمہاری آنکھوں کے سامنے جان دوں۔ اس کے بعد تم گھر جاؤ اور وہاں عزیزوں اور شہر کے دیگر شرفا کے نزدیک جو کچھ بے عزتی ہوئی ہے اس کو دور کر دو۔ اور میری خبر مرگ کے ساتھ ساتھ جا کے بتا دو۔ کہ میں نے کیوں اور کہاں جان دی۔ اور مرتے دم تک ایسی پاک دامن تھی (گلے میں باہیں ڈال کے) حسین! میری آرزو ہے کہ تم زندہ رہو۔ اور میرے دامن سے بدنامی کا دھبہ دھوؤ"!

حسین۔ "(ایک نالہ جانکاہ کے ساتھ) خدا نہ کرے کہ میں تمہاری خبر مرگ لے جاؤں"!

ناگہاں ایک پہاڑی کی ڈھالو سطح پر کچھ روشنی نظر آئی جس پر پہلے زمرد کی نظر پڑی۔ اور اس نے چونک کے کہا "یہ روشنی کیسی"!

حسین نے بھی اس روشنی کو حیرت سے دیکھا اور کہا "خدا جانے کیا بات ہے۔ اور دیکھو! ادھر بڑھتی چلی آتی ہے۔ اس وقت کی تاریکی میں یہاں آنے والے کون ہو سکتے ہیں"؟

از فردوس بریں

راشد الخیری

وطن دلّی ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ آبا و اجداد میں کوئی مولانا ابوالخیر خیر اللہ تھے۔ ان ہی کی نسبت سے خیری کہلائے۔ ناول نگاری میں ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے رنگ کا تتبع کیا۔ مگر ان سے بہت آگے بڑھ گئے۔ ٹریجڈی یعنی المیہ ناول اور افسانہ لکھنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کی عبارت میں درد اور سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ دلّی کی نکھری اور ستھری زبان لکھتے ہیں ہر لفظ اثر میں ڈوبا ہوا اور درد و غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اور قصے کا انجام اس قدر دردناک دکھاتے ہیں کہ سخت سے سخت دل انسان کی آنکھوں سے بھی بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ تمام تصانیف عورتوں کی اصلاح کے موضوع پر ہیں۔ صبح زندگی، شام زندگی وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا۔

مسلمان عورت کی کشتی

مجھے ایک عرصہ دراز کے بعد اس ہفتہ میں چند حضرات کے اصرار پر ایک نکاح میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ۔ مکان مہمانوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ اور مسلمانوں کی مختلف مذاق کی ٹولیاں اپنی اپنی بحثوں میں مصروف تھیں مگر ہر شخص کی زبان پر مسلم قوم کا رونا تھا تعجب یہ ہے کہ معائب و نقائص کے اس قدر عام احساس کے بھی گو لکچرار کا لکچر مولوی کا وعظ نامہ نگار کا مضمون شاعر کی نظم حدیہ ہے۔ قوال کی غزل بھی اسی تان پر ختم ہوتی ہے۔ رونا روز بروز زیادہ اور حالت لحہ بہ لحہ ابتر ہو رہی ہے اسی صورت کو سامنے رکھ کر میں ہمیشہ یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر ہر مسلمان صرف اپنا فرض اسلامی اتنا سمجھ لے کہ خود مسلمان ہو جائے تو وہ موجودہ دنیا کا بہترین مسلمان ہوگا کاش یہ حضرات جو قوم کا رونا روتے ہیں اس طرف توجہ فرماتے اور دوسروں کو مسلمان بنانے سے پہلے خود مسلمان ہو جاتے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ خطبہ نکاح پڑھا گیا۔ اور نکاح ختم ہوا دلی میں روایات قدیمہ روز بروز مٹ رہی ہیں پہلے یہ دستور تھا کہ ادھر دعا ختم ہوئی اور شہدوں کی جماعت نے مبارک بادیں دینی شروع کیں ان شہدوں کو جو کچھ ملتا تھا وہ مفت نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ان کی خدمات کا معاوضہ ہوتا۔ جہیز کی ہر شئے اُن کی سپرد ہوتی تھی اور یہ تل تل اور تار تار دولھا کے گھر پر پہنچانے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ پلنگ اور چھپر کھٹ کو کندھوں پر اٹھانے والی جماعت یہی ہوتی تھی اور ان کی وجہ سے تمام اشیاء اطمینان سے پہنچ جاتی تھیں۔ اب جہیز کی حیثیت میں چونکہ تغیر ہو گیا ہے۔ اس لئے لوگوں کی

صورتیں بھی کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ ہاں قوال اور بھاٹ وغیرہ غزلیں اور گیت گا کر مجلس کو محظوظ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ المختصر دُعا ختم ہوتے ہی آواز آئی ـــــ "ہریالے بنے ہووے مُبارک شادی"

مُبارک باد کے یہ الفاظ مجلس میں گونج رہے تھے دولھا دولھن کے متعلقین علیٰ قدر تعلق خوش تھے اور مُبارک اور سلامت کی دھوم دھام ہو رہی تھی مگر مجھے اس مُبارک باد میں کچھ اور دکھائی دے رہا تھا۔ نکاح اندر دالان میں تھا۔ مہمان بڑے وسیع صحن میں دُور تک بیٹھے ہوئے تھے بھاٹ کی مُبارکباد نے خطبہ کے ختم اور نکاح کی تکمیل کا اعلان کیا۔ مجھے اپنی حالت پر افسوس ہوا اور دِل پر ملامت کرنے لگا کہ یہ ایسے موقعوں پر بھی جب ہر متنفس شاد ہے اور شادی رَچ رہی ہے تو رونا ہوا ہی دکھائی دیتا ہے میں نے ہر چند کوشش کی کہ قلبِ بدبخت کو راہ راست پر لاؤں لیکن جتنا سمجھاتا تھا اتنا ہی ہاتھ سے نکلتا جاتا اور کہتا تھا۔

اس مبارک باد کی تہ میں تعزیت کی صدائیں موجود ہیں۔ اس مسرت میں آفت اس راحت میں مصیبت اور اس شادی میں بربادی پوشیدہ ہے مُبارکباد سُننے خوش ہونے اور مگن پھرنے والے آج ہی کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کے سامنے کل نہیں ہے۔ یہ مستقبل سے اغماض اور انجام سے لاپرواہی کر رہے ہیں یہ اعلان کس بات کا ہے ؛ اس لڑکی کی آزادی سلب ہو چکی۔ اس کا اطمینان ختم اور اس کا زمانۂ بہار فنا ہو گیا۔ آج سے یہ ایک ایسے شخص کی جو اسلامی تہذیب اور انسانی جوہروں سے محروم ہے لونڈی بن گئی نوشہ مُبارک باد کا مستحق ہے کہ مسلمانوں کے رواج نے گھر بیٹھے ایک ماما دیدی جس پر رات دِن حکومت کرے گا اور ہر خلاف مزاج بات پر طلاق کی لکڑی سنبھال لیگا۔

یہ اس قوم کا ایک فرد ہے جس کے آقا نے اسلام کے زبردست محسن فاروق اعظم رضؓ کی اس درخواست کے جواب میں کہ آپ اور نکاح کر سکتے

ہیں اُم المومنین بی بی سلمہؓ کے یہ الفاظ جائز خیال فرمائے تھے۔

"عمر ہمارے معاملہ میں دخل دینے والا کون ہے"

یہ اس انسان کامل کی سُنّت سے فائدہ اٹھا رہا ہے جس کے آخری الفاظ یہ تھے، کہ

"تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی سے اچھا ہے" یہ اس طبقہ کا پڑھنے والا ہے جس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ عورت کی توہین رہ کرتے ہیں جو پاتی ہیں"

یہ اس صدا پر ایمان لایا ہے جس نے عورت کو مساوات کے لباس سے آراستہ کیا اور مرد کے برابر پہنچا کر دُنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ لیکن اب یہ دولھا کیا کرے گا۔ اور دولھن کی حیثیت کیا ہوگی؟

شوہر کی غلط خواہش کے مقابلہ میں بیوی کو اپنے صحیح جذبات فنا کرنے پڑینگے اس کی مرضی پر اپنی خوشی قربان کرنی پڑے گی۔ اور جہاں لونڈی ماما نوکر اتنا اختیار سے پیچھا چھڑا سکتے ہیں وہاں اس کا فرض ہوگا کہ تعمیل کرے اور ہاں میں ہاں ملائے۔ یہ جان سے اُکتا جائے۔ مظالم سے پریشان ہو جائے۔ لیکن اس کا چھٹکارا نہیں ہو سکتا اور جب زندگی کے بدترین ظلم کا شکار ہو جائے اور شوہر دوسرا نکاح کرے تو شوہر کے ساتھ سوکن کی رضامندی بھی اس کا فرض ہو، لاچار پریشان ہو اُکھبرا کر اور اُکتا کر جب سوسائٹی کی پناہ میں جانا چاہے تو کونسی سوسائٹی توحید کی معترف اور رسالت کی مقر جس کا ارکان قرآن وحدیث تو اس کے رہنما نعوذ باللہ من ذٰلک ہر ظلم کو سنت فرمائیں اور ہر ستم کو جائز قرار دیں۔ اسلام نے اس کی شخصیت علیحدہ قرار دی تھی لیکن اس نکاح سے اس کی ذات شوہر میں جذب ہوتی ہے اس کی کوئی رائے ہوگی نہ قیاس۔ شوہر کی رائے پر اپنا سر جھکا دینا ہوگا۔ اور اس کی جائداد اس کی ملکیت اس کے نیچے غرض ہر شئے ذی رُوح اور غیر ذی رُوح دیکھنے اور سُننے کو اس کی لیکن حقیقتاً شوہر کی ہوگی اور ان تمام خدمات کا صلہ یہ ہوگا کہ نوشہ جس وقت قانون اور اختیار کی کرسی پر

تشریف فرما ہوں گے اور دوسروں کے طفیل عورت کے حق کو کوئی آواز بلند ہوگی تو سب سے پہلے اس آواز کو ٹھکرا دینے اور اس مطالبہ پہ ناک بھوں چڑھانے والے بھی ہمارے نوشہ ہوں گے۔

جب یہ دولھا میاں عورت کی شخصیت کو فنا فرما کر اسلام کی تحقیر پر فخر کریں گے اس وقت دولھن کے دولھا نہیں بیٹیوں کے باپ بھی ہوں گے۔ اور بیوی پر حکومت کا چسکا ایمان اور انصاف کو اتنا مجروح کرے گا کہ جن معصوم روحوں کو پال پوس کر جوان کیا ہے جو کلیجہ کے ٹکڑے اور آنکھوں کی ٹھنڈک میں ان کے جائز حقوق کو اپنی نفسانیت اور حکومت پر قربان کرنے میں ذرّہ بھر تامل نہ ہوگا۔ میں نے خاں صاحب یعنی دولھن کے باپ سے عرض کیا کہ حضرت مبارکباد تو بعد میں دوں گا۔ یہ تو فرمایئے آپنے اس بچی کے حقوق کا کیا تحفظ کیا یا سوسائٹی کے رواج پر ایک بھینٹ اور چڑھا دی۔ اس کا جواب خاں صاحب کے چہرہ پر تو مسکراہٹ تھی لیکن ایک صاحب نے فرمایا خاں صاحب کے ہاں لڑکیوں کو ترکہ پدری ہی نہیں دیا جاتا۔ تحفظ حقوق تو اس کے بعد ہے۔

تخیل تو کیا ایک دیوانگی تھی جس نے مٹھائی اور چھوہاروں سے محروم کیا۔ اسی ادھیڑ بن میں منہمک گھر چلا آیا۔ اور سوچتا رہا کہ کولھو کے بیل کی طرح قریب قریب چالیس سال حقوق نسواں کے گرد چکر لگائے۔ مگر اب بھی جہاں سے چلا تھا وہیں ہوں۔ اس مدت میں اگر بنجر سے بنجر زمین میں بھی تخم ریزی کرتا تو غنچہ ہو جاتی کس قدر مستحق آفرین ہے وہ قوم جو اپنے سیاسی حقوق کے مطالبات میں دنیا بھر کے جتن کر ڈالے اور چیختے چیختے اپنا گلا اور دوسروں کے کان پھاڑ دے مگر خود غصب شدہ مال کے دینے کا وقت آئے تو اس کان سننے اور اس کان اڑا دے !!

میں ان ہی خیالات میں محو تھا دفعتاً ایسا معلوم ہوا کہ دنیائے اسلام کا وہ بدبخت گروہ جو مسلمان لڑکیوں کے نام سے موسوم ہے اور جن پر جفاکار

مرد احکام کے فرضی جھنڈے ہاتھ میں لئے لاٹھی چارج کر رہے ہیں سامنے موجود ہے ان میں بشاش سے بشاش اور شاداں سے شاداں لڑکی بھی اس حق سے محروم تھی جو مذہب مقدس نے اس کو عطا کیا تھا۔ ان کے دلوں میں پھوڑے تھے ان پھوڑوں میں چپکیں تھیں ان چپکوں میں ٹیسیں تھیں۔ اس اذیت نے ان کی جان پر بنا دی تھی ان کی آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ میں نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرے۔ ان کے بالوں کو سر پر رکھا اور ان کی فریاد دل کو سینہ سے لگا کر کہا،

پیاری بچیوں مرد نے تمہاری تحقیر و تذلیل میں کبھی کسر نہ چھوڑی دنیا ان مظالم کی شاہد ہے جو اس بندۂ نفس کے ہاتھوں تمہارے نازک قلب پر ٹوٹے۔ انسانی آبادی کا کوئی حصہ کسی حال میں اس جور سے خالی نہیں مرد کے سنگ دل جذبات نے مرتے مرتے تمہاری زندگیاں تباہ کیں، روم کی چشم بینا کو آج بھی تمہاری مظلومیت پر روتا نظر آ رہا ہے۔ انگلستان کی زمین یونان کا آسمان اور عربستان کا ریت اب بھی تمہارے سوگ میں مرثیئے پڑھ رہا ہے۔ تمہاری لاچاری اور بے کسی پر تمہاری مصیبت اور آفت پر ایک آنکھ تمہارے زخموں پر رونے والا ایک دل تمہاری مظلومیت پر رحم کھانے والا ایک انسان تمہاری معصومیت کی قدر کرنے والا ایک شخص خاک عرب سے پیدا ہوا جس نے تم کو سب کچھ دیدیا اور جو دنیا تم کو ٹھکرا رہی تھی اسی کی آنکھوں میں تم کو بیش بہا جوہر بنا دیا۔ مگر اس کی آنکھ بند ہوتے ہی اسی کا نام جپنے والے تمہارے پیچھے پڑ گئے اور احکام کو بالائے طاق رکھ کر تم پر حکومت شروع کردی۔ مگر وہ نبض شناس مرد کی فطرت سے آشنا تھا۔ اس لئے اس نے تمہارے واسطے ایک دوسرا راستہ پیدا کر دیا۔ میری بچیوں اور حوا کی بیٹیوں شیطان نئے نئے سوانگ بھر کر تمہارے سامنے نمودار ہو رہا ہے۔ یہ آزمائش کا وقت اور امتحان کا موقعہ ہے۔ تمہاری موجودہ زندگی اپنے ساتھ

یک اور زندگی بھی لئے ہوئے ہے یہ فانی ہے وہ باقی، یہ عارضی ہے وہ ابدی،
ان اعمال کی جزا ان بیجوں کا پھل۔ اس کھیتی کی پیداوار اور اس امتحان کا نتیجہ
وہ ساعت ہے جو بعد الموت نمودار ہوگی۔ قصرِ شاہی میں عیش و عشرت کی راتیں
گذار دینے والیاں اور ٹوٹی جھونپڑی میں دن بسر کرنے والیاں دونوں نہیں
ہیں۔ مگر ان کے اعمال موجود ہیں۔ قصرِ زبیدہ جس کے مینار آسمان سے باتیں
کرتے تھے فنا ہو چکا لیکن نہرِ زبیدہ اپنی بیگم کے نام کی قیامت تک آبیاری
کرے گی۔ بچیو! تم اُن ماؤں کی بیٹیاں ہو۔ جنہوں نے سخت سے سخت اذیت
اور بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی شوہروں کی رفاقت سے مُنہ نہ موڑا۔
سرزمین ہندوستان ابھی ان ستونتیوں کی ہڈیاں گود میں لئے ہوئے ہے۔
جن کی قبروں پر فرشتے نور برسا رہے ہیں یہ وہ زندگیاں ہیں جن پر دُنیا فخر
کرے گی اور جو مرنے کے بعد بھی ایسے کام اور نام چھوڑ گئیں جو مدتوں فنا نہ ہونگے۔

میری بچیو! ہم مسلمان ہیں اور ہمارا ایمان دنیا کا وہ بہترین انسان
ہے جس کے نام پر ہم ہزار بار قربان ہو جائیں۔ وہ حقیقی محسن و سچا آقا وہ پاک
ہادی وہ مبارک رہبر میاں بیوی کے تعلقات کا ایک موقعہ پر اس طرح فیصلہ
فرماتا ہے۔

ٹھیک دوپہر کا سنسان وقت ہے، لُو کے جھکڑ چل رہے ہیں اور
آفتاب کی آتش غضب چاروں طرف آگ برسا رہی ہے مدینہ منوّرہ کی
مشہور عطر فروش جو اس لئے اور بھی مشہور تھی کہ جس راستہ سے نکل جاتی ہوا
اس کے لباس کی خوشبو سے مہک جاتی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضا
کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ میں اپنے شوہر کو رضامند کرنے کی
ہر ممکن کوشش کر چکی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ اب میرے واسطے کیا حکم ہے۔
ام المومنین خاموش تھیں کہ شہنشاہ دو عالم تشریف لے آئے، حولا کی خوشبو
سے دماغ مبارک معطر ہوا تو خود ہی فرمایا۔ کیا حولا آئی ہے ام المومنینؓ نے

عرض کیا ہاں۔ اس کے بعد حولا نے اپنی درخواست دوہرائی۔ ہمارے آقا اور خدا کے محبوب نے فرمایا۔ اپنی کوشش اس وقت تک جاری رکھ جب تک موت تجھ کو تیرے شوہر سے جدا نہ کر دے اور اگر تجھ کو اس حالت میں موت آگئی تو میں تجھ کو اپنے ساتھ لے کر جنت میں داخل ہوں گا۔

چند ہی روز ہوئے میں نے ایک مضمون میں مسلمان خواتین سے کہا تھا کہ وہ بیٹیوں کی شادی کے وقت اگر حالات اجازت دیں تو ان کے شوہروں سے حقوق کی تفصیل تحریری طے فرما لیا کریں مگر میں جانتا تھا کہ موجودہ معاشرہ ان کو اس کی اجازت نہ دے گی اور مجبور ہوں گی آج جب کہ مجھ جیسے بڈھے ان غریب اور قابل رحم لڑکیوں کے حقوق اپنے نفس پر قربان کر چکے اور گھر کی ملکہ کو بازار کی لونڈی بنا دیا ہیں تو عمر افراد سے ان کی انسانیت کا واسطہ دے کر درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کٹھن منزل میں خود ہی قدم رکھیں۔ ان کا نفس اور ان کا ایمان ان کو بتا دے گا ان کا یہ فعل کس قدر تعریف کا مستحق ہے۔ یہ ان کا وہ ایثار ہوگا جس پر اسلام کی بنیادیں قائم ہیں ہیں۔ اپنے بچوں کو یقین دلاتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کا نام جپنے والی مسلمان لڑکیوں میں ایک فی صدی بھی مشکل سے ایسی نکلے گی جو ان کے اس کرم سے غلط فائدہ اٹھائے۔ اگر چند نکاح بھی ایسے ہو گئے جن میں شوہروں نے اس رواج کو مٹا کر جو کمزور عورت کی گردن پر طاقتور مرد کی چھری ہے اس کا وہ حق عطا فرمادیا جس کی وہ شرعی مالک ہے تو دامن اسلام سے یہ ایک ایسا داغ دور ہو جائے گا جس پر اغیار ہنس رہے ہیں اور جو ان نفس پروروں کی زیادتی ہے جو اسلام کے جانی دشمن ہیں۔

مجھے امید ہے کہ وہ دولھا جو زرق برق لباس سے جگمگا کر دلھن کے گھر پر نکاح کے واسطے آتا ہے قبل از نکاح اس پر غور کرے گا کہ نکاح ایک معاہدہ ہے نہ کہ عورت کے واسطے زنجیر غلامی وہ ظاہری لباس و آرائش کو چھوڑ کر

جب اپنے ضمیر پر نظر ڈالے گا تو اسلام کی کامیابی کا ایک ایسا سہرا اپنے سر پر دیکھے گا۔ جس کے پھول مدۃ العمر تر و تازہ رہیں گے۔ اس کا یہ حسن سلوک بظاہر ایک غیر لڑکی کے ساتھ ہوگا مگر حقیقتاً ان بچیوں کے ساتھ ہوگا جن کا وہ خود باپ ہونے والا ہے اور جو اس کے اپنے کلیجہ کے ٹکڑے ہیں۔

وقت کا بڑا حصہ گذر چکا تھا۔ اور اب میری زبان پر صرف یہ الفاظ تھے۔

"مسلمان عورت کی کشتی نوعمر افراد کے ہاتھ میں ہے۔"

خواجہ حسن نظامی

خواجہ حسن نظامی دہلی کے رہنے والے تھے ۲۵ دسمبر ۱۸۷۰ء کو بستی درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین صاحب اولیاؒ میں پیدا ہوئے خواجہ صاحب کا طرزِ تحریر نادر اور اچھوتا ہے۔ سادگی اور البیلے پن سے الفاظ میں انسانی جذبات کی تصویر خوب کھینچتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصورِ فطرت کہلاتے ہیں آپ نے اردو زبان میں چٹکلوں کا مزہ پیدا کیا۔ عنوان قائم کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ چنانچہ بہ حسا ”یزید“ ”سیپارۂ دل“ ”بیگمات کے آنسو“ اور اسی قسم کی بیسیوں کتابیں آپ کے قلم سے نکل چکی ہیں۔ تحریر میں ایک خاص جاذبیت اور دلکشی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے بعض مضمون بالکل معمولی ہوتا ہے۔ مگر اپنی جادو بیانی سے اس میں دلکشی اور رنگینی پیدا کر دیتے ہیں۔

خواجہ صاحب کی عبارت کی دلکشی کا راز یہ ہے کہ یہ تصنع اور آورد سے بالکل پاک اور ان کے دلی جذبات کی ترجمان ہوتی ہے اسلئے دل پر اثر کرتی ہے۔

یتیم شہزادہ کی ٹھوکریں

ماہِ عالم شاہ عالم بادشاہ دہلی کے نواسوں میں تھا۔ غدر میں اس کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی شہزادہ ماہ عالم کے باپ مرزا "نوروز حیدر" بہادر شاہ کی سرکار سے سَو روپے ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ غدر پڑا تو ماہ عالم کی والدہ بیمار تھیں۔ اسی بیماری میں اس روز جب کہ بہادر شاہ قلعے سے نکلے۔ اور شہر کی رعایا پریشان ہو کر بھاگنے لگی۔ ماہِ عالم کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ایسے موقع پر سب کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ اس موت نے عجیب پ ہراس پیدا کر دیا۔ اس وقت نہ کفن کا سامان ممکن تھا نہ دفن کا۔ نہ غسل دینے والی عورت میسّر آ سکتی تھی۔ نہ کوئی مُردے کے پاس بیٹھنے والا۔ غدر کی عالمگیر مصیبت کے سبب کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو تجہیز و تکفین کی خدمت انجام کو پہنچاتا۔ گھر میں دو لونڈیاں تھیں۔ لیکن وہ بھی مُردے کو نہلانا نہ جانتی تھیں ۔۔

القصّہ ان لوگوں کو اسی پریشانی میں گھنٹے گذر گئے۔ اتنے میں سُنا کہ انگریزی لشکر شہر میں گھس آیا ہے۔ اس خبر سے مرزا کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ جلدی سے لاش کو نہلانا شروع کیا۔ نہلایا کیا بس پانی کے لوٹے بھر بھر کر اوپر ڈال دیئے۔ کفن کہاں سے ملتا۔ شہر تو بند تھا پلنگ پر بچھانے کی دو اُجلی چادریں لیں اور ان میں لاش کو لپیٹ دیا۔ اب یہ فکر ہوئی کہ دفن کہاں کریں۔ اسی سوچ میں تھے کہ گوروں اور سکھوں کی فوج کے چند سپاہی گھر میں آ گئے۔ اور آتے ہی مرزا اور ان کے لڑکے ماہ عالم کو گرفتار کر لیا۔ گھر کا سامان لوٹا۔ صندوق توڑ ڈالے۔ الماریوں کے کواڑ اکھیڑ دئیے۔ کتابوں

کو آگ لگا دی۔ اگرچہ فوجیوں کو لاش کا حال معلوم ہوگیا تھا مگر انہوں نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ اور برابر لوٹ مار کرتے رہے۔ آخر قیمتی سامان کی گٹھڑیاں لونڈیوں، ورخود مرزا نوروز حیدر اور اُن کے لڑکے ماہِ عالم کے سر پر رکھیں اور بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے گھر سے باہر لے چلے۔ اس وقت مرزا نے اپنے لٹے ہوئے گھر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اور اپنی بیوی کی بے گور و کفن لاش کو اکیلا چارپائی پر چھوڑ کر ظلمی سپاہیوں کے ساتھ کوچ کیا۔

لونڈیوں کو تو بوجھ اُٹھانے اور چلنے پھرنے کی عادت تھی۔ مرزا نوروز حیدر بھی قوی اور توانا تھے۔ مگر غریب ماہِ عالم کی بُری حالت تھی، اوّل تو اس کے سر پر بوجھ اس کی بساط اور عمر سے زیادہ تھا۔ دُوسرے شہزادہ نہایت نازک اور کمزور واقع ہُوا تھا۔ اس پر ماں کے مرنے کا غم خالی ہاتھ چلنے سے بھی چکّر آتے تھے۔ کجا یہ نوبت کہ سر پر بوجھ۔ پیچھے سنگینیں ہولی۔ تلواریں اور جلدی چلنے کی قہرناک تاکید۔ بیچارے کے پاؤں لڑکھڑاتے تھے۔ بدن پسینے پسینے ہوگیا تھا۔ آخر نہایت مجبوری کی حالت میں باپ سے کہا۔ "ابّا حضرت! مجھ سے تو چلا نہیں جاتا۔ گردن بوجھ کے مارے ٹوٹی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو گر پڑوں"۔ باپ سے اپنے لاڈلے اکلوتے بچّے کی یہ مُصیبت بھری باتیں نہ سُنی گئیں ـــ اُس نے مڑ کر سپاہی سے کہا۔ "صاحب! اس بچّے کا اسباب بھی مجھے دے دو۔ یہ بیمار ہے"۔ گورا مرزا کی زبان بالکل نہ سمجھا۔ اور اس طرح ٹھہرنے اور بات کرنے کو گستاخی سمجھ کر دو تین مکّے کمر میں مارے اور آگے دھکا دے دیا۔ مظلوم مرزا نے مار کھا کر بھی لڑکے کا بوجھ بغل میں لے لیا۔ گورے کو یہ حرکت بھی پسند نہ آئی۔ اور اُس نے جبراً مرزا سے گٹھڑی لے کر ماہِ عالم کے سر پر رکھ دی۔ اور ایک گھونسہ اس بیکس و ناتوان کے بھی مارا۔ گھونسہ کھا کر ماہِ عالم آہ کہہ کر گرا اور بیہوش ہوگیا۔ مرزا نوروز اپنے لختِ جگر کی حالت دیکھ کر جوش میں آگئے۔ اور اسباب پھینک کر ایک گھمسّا گورے کے کلّے پر رسید کیا۔ اور پھر فوراً ہی دُوسرا گھونسہ اس کی ناک پر

جو مارا تو ناک کا بانسہ پھٹ گیا۔ خون کا فوارہ چلنے لگا۔ سکھ سپاہی دوسری طرف چلے گئے تھے۔ اس وقت فقط دو گورے ان کے ساتھ تھے۔ دوسرے گورے نے اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر مرزا کے ایک سنگین ماری۔ مگر خدا کی قدرت وار اوچھا پڑا۔ تیموری شہزادے نے اس موقع کو غنیمت جانا اور لپک کر ایک مُکا اس گورے کی ناک پہ بھی مارا۔ یہ مُکا بھی ایسا کاری پڑا کہ ناک پچک گئی۔ گورے یہ حالت دیکھ کر پستول کرچ تو بھول گئے، اور ایکبارگی دونوں کے دونوں مرزا کو چمٹ گئے اور گھونسوں سے مارنے لگے۔ لونڈیوں نے جو یہ حالت دیکھی تو اسباب پھینک رستے کی خاک مٹھیوں میں بھر کر گوروں کی آنکھ میں جھونک دی۔ اس ناگہانی آفت سے گورے تھوڑی دیر کے لئے بیکار ہو گئے اور ان کی کرچ مرزا کے ہاتھ آ گئی۔ مرزا نے فوراً کرچ گھسیٹ ایک ایسا بھرپور ہاتھ مارا۔ کہ کرچ نے شانے سے سینے تک چیر ڈالا۔ اس کے بعد دوسرے گورے پر حملہ کیا اور اُسے بھی ذبح کر دیا۔ ان دونوں کو ہلاک کر کے ماہِ عالم کی طرف متوجہ ہوئے وہ بالکل بیہوش تھا۔ باپ کے گود میں لیتے ہی آنکھیں کھول دیں۔ مرزا اسی حالت میں تھے کہ پیچھے سے دس بارہ گورے اور سکھ سپاہی آ گئے۔ انہوں نے دو ساتھیوں کو خون میں نہایا دیکھ کر مرزا کو گھیر لیا اور لڑکے سے جُدا کر کے حال پوچھا۔ مرزا نے سارا واقعہ سچ سچ کہہ دیا۔ سنتے ہی گوروں کی حالت غصّے سے غیر ہو گئی۔ انہوں نے پستول کے چھ فیر یکدم کر دئے۔ جن سے مرزا آناً فاناً تڑپ کر مر گئے۔ مرزا نوروز کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور ماہ عالم کو لونڈیوں سمیت کیمپ میں لے گئے ؟

مچھّر کا اعلانِ جنگ

یہ بھنبھناتا ہُوا ننھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام ہو گئی ہے، ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، سب بالاتفاق اس سے نالاں ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلہ کے لئے مہمّیں تیار ہوتی ہیں جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں۔ مگر مچھّروں کے جرنیل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوتی چلی آئی ہے ۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھنگے پر قابو نہیں پا سکتا۔ طرح طرح کے مسالے بناتا ہے۔ کہ ان کی بُو سے مچھّر بھاگ جائیں لیکن مچھّر اپنی یورش سے باز نہیں آتے ہیں۔ اور بگل بجاتے ہوئے آتے ہیں۔ اور بےچارا آدم زاد حیران رہ جاتا ہے ۔

امیر، غریب، ادنےٰ، اعلیٰ، بچّے، بوڑھے عورت مرد کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی اس کے ساتھ ایذا دیتا ہے مچھّر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا ۔

آدمیوں نے بھی مچھّروں کے خلاف شورش کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھّروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر مچھّر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا ۔

طاعون نے گڑبڑ مچائی۔ تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھّر اور پسّو کے ذریعے سے پھیلتا ہے۔ ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہولناک بلا دُور ہو جائے گی۔ ملیریا بخار پھیلا۔ تو اس کا الزام بھی مچھّر پر عائد ہوا۔ اس سرے سے اُس سرے تک کالے

گورے آدمی تُل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹا دو۔ مچھروں کو کچل ڈالو۔ مچھروں کو تہس نہس کر دو۔ اور ایسی تدبیریں نکالیں۔ جن سے مچھر کی نسل ہی منقطع ہو جائے ٭

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھتا ہے اور سُنتا ہے۔ اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے پانیر کو پڑھتا ہے۔ تو اپنی بُرائی کے حروف پر بیٹھ کر اس پہ خون کی ننھی بوندیں ڈال جاتا ہے۔ جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔ گویا اپنے قاعدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا ہے کہ میاں! تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے ٭

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے کوڑے کرکٹ میں کیچڑ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور بُزدلی تو دیکھو۔ اس وقت حملہ کرتا ہے۔ جب کہ ہم سو جاتے ہیں۔ سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چرکے لگانا، مردانگی نہیں انتہا درجہ کی کمینگی ہے۔ صورت تو دیکھو۔ کالا بھجنا، لمبے لمبے پاؤں بیڈول چہرہ، اس شان و شوکت کا وجود، آدمی جیسے گورے چٹے خوش وضع، پیاری ادا کی دشمنی بابے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں ٭

مچھر کی سُنو۔ تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ "جناب! ہمت ہے تو مقابلہ کیجئے! ذات صفات نہ دیکھئے۔ میں کالا سہی، بدرونق سہی، نیچ ذات اور کمینہ سہی، مگر یہ تو کہئے۔ کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں، اور کیسا آپ کا ناک میں دم کر دیا ہے ؟"

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں۔ اور سوتے میں ستاتا ہوں۔ یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر بے انصافی کرتے ہو۔ حضرت! میں تو کان میں آکر الٹی میٹم دیتا ہوں۔ کہ ہوشیار ہو جاؤ۔ اب حملہ ہوتا ہے تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور؟ زمانہ خود فیصلہ کر دے گا کہ میدانِ جنگ میں کالا بھجنا لمبے لمبے پاؤں والا، بے ڈول فتحیاب ہوتا ہے یا گورا چٹا۔ اچھی آن بان والا!

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں۔ کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا

جوہر دکھائے ہیں۔ اپنے بھائی نمرود کا قصہ بھول گئے۔ جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا۔ کس نے اس کا غرور توڑا۔ کون اس پر غالب آیا۔ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی۔ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجئے۔ یا مجھ سے سنئے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا۔

اور تم ناحق بگڑتے ہو۔ اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کئے بیٹھے ہو۔ میں تمہارا مخالف نہیں ہوں۔ اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کر لو۔ دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔ کل ایک شاہ صاحب عالم ذوق میں اپنے ایک مرید سے کہہ رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بیچارا خلوت خانے میں رہتا ہے۔ رات کو جو خدا کی یاد کا وقت ہے۔ باہر نکلتا ہے۔ اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں۔ تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دئے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کریں۔ اور حمد و شکر کے گیت گائیں۔ اس لئے پہلے اس کے کان میں جا کر کہتا ہے کہ اٹھو میاں اٹھو جاگو! جاگنے کا وقت ہے اور سونے اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے۔ مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے۔ تو مجبور ہو کر غیظ و غضب میں اس کے چہرہ اور ہاتھ پاؤں پر نشتر چبھوتا ہے۔ پروا رے انسان! آنکھیں بند کئے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بیہوشی میں بدن کو کھجلا کر پھر سو جاتا ہے۔ اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارے مچھر کو صلواتیں سناتا ہے۔ کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جناب عالی! کے سیکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے؟" شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سن کر میرے دل کو بھی

تسلی ہوئی۔ کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں۔ بلکہ میں دل ہی دل میں شرمایا کہ کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ یہ شاہ صاحب مصلّے پر بیٹھے بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں۔ اور میں اُن کے پیر کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت ایسی اچھی اور نیک رائے دیں۔ اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑا ہی ہے۔ قدم چومتا ہے۔ اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوئی۔ اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے ؂

بہرحال اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کرلیں جیسا کہ صوفی صاحب نے کہا تو یقین ہے کہ ہماری قومِ انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے لطف سے نہ جینے دُوں گا۔ اور بتا دوں گا کہ کمین اور نیچ ذات اعلیٰ درجہ والوں کو یوں پریشان اور بے چین کرسکتی ہے۔

آغا حشر کاشمیری

آغا محمد حشر صاحب امرتسر میں پیدا ہوئے۔ نہایت ذہین اور ذکی الحس انسان تھے۔ انہیں اردو ڈرامے کا باوا کہتے ہیں بلکہ ان کے ہاں مار و کا رنگ بہت زیادہ نمایاں ہے۔ ان کے جذبات بہت گہرے ہوتے ہیں۔ شہید ناز، مرید شک، اسیر حرص، ترکی حور، اور صید ہوس وغیرہ اس کے مشہور ڈرامے ہیں۔

آغا صاحب کا وجود اردو ڈرامے میں بہت بلند ہے۔ آخری عمر میں لاہور چلے آئے تھے۔ اور یہیں وفات پائی۔

King Lear
Shakespea

سفید خون

خاقان بادشاہ کی تین لڑکیاں ہیں۔ بڑی کا نام مہ پارہ منجھلی کا دل آرا اور سب سے چھوٹی کا زہرہ۔

بادشاہ بہت بوڑھا ہوگیا۔ اس نے چاہا کہ اپنی زندگی میں سلطنت اپنی تینوں بیٹیوں میں تقسیم کرکے آرام کرے۔ اس مطلب کے لئے وہ تینوں کو بلاتا ہے۔ سب سے پہلے ماہ پارہ سے پوچھتا ہے کہ بیٹی! بتا تجھ کو مجھ سے کس قدر محبت ہے؟ وہ ظاہرداری سے جواب دیتی ہے کہ "مری محبت کا اظہار الفاظ نہیں کر سکتے۔ آپ مجھے آنکھوں کے نور، جان سے اور آزادی سے بڑھ کر پیارے ہیں"۔ یہ سن کر خاقان بہت خوش ہوتا ہے۔ اور اپنی سلطنت کا تیسرا حصہ ماہ پارہ اور اس کے خاوند کو بخش دیتا ہے۔ پھر یہی سوال وہ دل آرا سے کرتا ہے۔ وہ ظاہرداری سے کہتی ہے کہ "باجی جان کی محبت میری محبت کے آگے ہیچ ہے رائی اور پہاڑ کا مقابلہ ہے"۔ بادشاہ خوش ہو کر ایک تہائی سلطنت اس کو بخش دیتا ہے۔ پھر تیسری زہرہ کی باری آتی ہے۔ وہ بہنوں کی جھوٹی خوشامد سے بیزار ہو رہی ہے۔ اور کہتی ہے ابا جان! میرا فرض ہے کہ میں آپ سے محبت کروں۔ لیکن میری بہنیں یہ بتائیں کہ اگر وہ سوائے آپ کے کسی کو نہیں چاہتیں تو انہوں نے شادیاں کیوں کیں۔ مجھے نصف محبت آپ سے اور نصف اس شخص سے ہو گی جس سے میری شادی ہو گی"۔

یہ سن کر بادشاہ بڑا خفا ہوتا ہے۔ اور زہرہ کو محروم کرکے نصف سلطنت ماہ پارہ اور نصف دل آرا کو دے دیتا ہے۔ اور یہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک سو شہسوار اس کے جلو میں رہیں گے اور وہ باری باری ایک ایک ماہ کے لئے اپنی دونوں بیٹیوں کا مہمان ہوا کرے گا۔

جب دونوں بہنیں نصف نصف سلطنت کی مالک بن جاتی ہیں۔ تو ان کی بدکاری اور شیطانی خصلت رنگ لاتی ہے۔ بروئے تجویز خاقان کو پہلا مہینہ ماہ پارہ کے ہاں بسر کرنا تھا۔ وہ باپ کو اس قدر دق کرتی ہے کہ وہ خفا ہو کر قبل از وقت دل آرا کے گھر چلا جاتا ہے۔ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ماہ پارہ بھی وہاں جا پہنچتی ہے۔

دل آرا کا محل

خاقان:- ہمارے آنے کی خبر پائی نہ کسی نوکر کو بھیجا۔ نہ خود آئی :

ایک شہسوار:- بے شک یہ برتاؤ خلافِ تہذیب ہے !

خاقان:- اچھا۔ تم جاؤ۔ اور میری بیٹی کو بُلا لاؤ :

شہسوار:- حضور والا !

خاقان:- کیا وہ بھی نہیں آتی۔ کیا وہ بغاوت دکھاتی ہے۔ جاؤ جا کر کہو کہ بڈھا باپ اپنی بیٹی سے ملنا چاہتا ہے اور اُسے بُلاتا ہے :

(دل آرا داخل ہوتی ہے)

دل آرا:- میں بہت خوش ہوں کہ آپ نے مجھ پر کرم فرمایا :

خاقان:- تم ضرور خوش ہوگی۔ اگر میرے آنے پر رنج ہوتا۔ تو میں یہی کہتا کہ تمہاری والدہ کی قبر میں میری بیوی نہیں بلکہ وہ عورت دفن ہے جس نے سانپ کے بچوں کو اپنی اولاد کر کے پالا ہے :

دل آرا:- جناب والدہ مرحومہ کی شان میں ایسے الفاظ استعمال نہ کیجئے۔ مگر یہ تو فرمایئے کہ آپ باجی جان کے پاس سے کیوں چلے آئے ؟

خاقان:- کیوں آیا ہوں۔ نصیب کا ستایا ہوں۔ کبھی لوگ میرے پاس فریاد لاتے تھے۔ آج میں تیرے آگے فریاد لایا ہوں :

دل آرا:- کیا آپ کا اشارہ باجی جان کی طرف ہے ؟

خاقان:- ہاں ــ

جو بہ شعار ستم کیش اہل کیں نکلی
پلی تھی گود میں پر مارِ آستین نکلی

دل آرا:۔ آپ کا اشارہ باجی جان کی نسبت غلط ہے۔ آپ کے لئے بہتر ہے کہ ان کے پاس پھر چلے جائیں "

خاقان:۔ کیا میں اس کے پاس پھر جاؤں! گڑگڑاؤں اور کہوں کہ خدا کے لئے اس بوڑھے باپ پر رحم کرو۔ میں صرف سونے بیٹھنے کی جگہ اور ایک روٹی کے ٹکڑے کا خواستگار ہوں۔

دل آرا:۔ قبلہ! آپ بھی عجب باتیں کرتے ہیں۔ جو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ عقل سے کام لیجئے۔ اور یہی بہتر ہے کہ باجی جان کے پاس چلے جایئے "

خاقان:۔ ہرگز نہیں۔ تو مجھے اس کے پاس جانے کو کہتی ہے۔ جو محسن کش ہے۔ جو محسن کش اور دغا باز ہے اور سانپ کی طرح ڈسنے والی ہے۔ اور درندوں کی طرح نوچ کر کھانے والی ہے — "

دل آرا:۔ خدا بچائے۔ میں سمجھتی ہوں کہ آپ خفا ہو جائیں گے تو مجھ پر بھی لیں ہی لعنت کے تیر برسائیں گے۔

خاقان:۔ نہیں۔ دل آرا نہیں۔ میں اپنی زبان کاٹ اور ہونٹ سی لوں گا۔ مگر تجھ جیسی نیک لڑکی کے حق میں کبھی ایسی بد دعا نہ کروں گا۔ تو حق شناس اور عالی ہے۔ اس کی آنکھیں خوفناک اور تیری تسلی دینے والی ہیں۔ وہ عیش و آرام کی شریک اور تو غم و آفت کی ساتھی ہے۔ وہ میرے جسم کا پھوڑا ہے اور تو مرہم لگاتی ہے۔ وہ آنکھیں پھوڑتی ہے۔ اور تو آنکھیں بچھاتی ہے "

دل آرا۔ بس کیجیے سرکار۔ آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں (ماہ پارہ کو آتے دیکھ کر) وہ دیکھئے۔ آپا جان بھی تشریف لے آئیں "

(ماہ پارہ سے ہاتھ ملاتی ہے)

ش۔ اے خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں دل آرا! کیا تجھے میرے روبرو

اس نابکار سے ہاتھ ملاتے شرم نہیں آتی ؟

ماہ پارہ ۔ (ہنس کر) بڑھاپے اور حماقت کی نظر والا یں اخلاق کی رسم بھی خلاف تہذیب ہے ؛

دل آرا :۔ سچ کہتی ہو۔ کیوں صاحب! گلے ملنا بھی کوئی قصور ہے ؛

خاقان :۔ ہے اور ضرور ہے۔ تم۔ اس سے ڈرا یہ عورت نہیں بلکہ شرارت کا وہ اوزار ہے جس سے شیطان اپنا مطلب نکالتا ہے۔ اس کے سینے میں دل نہیں بلکہ وہ پتھر ہے کہ جو اس پر گرتا ہے اس کو توڑ ڈالتا ہے۔ اور جس پہ وہ خود گرتا اُس کو پیس ڈالتا ہے ؛

دل آرا :۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ بہن کو بہن کی محبت چھوڑ دینی چاہیئے ؛

خاقان :۔ جو دانت ناک اور کان کو کاٹے سب سے پہلے اس کو توڑ دینا چاہیئے ؛

دل آرا :۔ تو جناب! مجھے اس ارادے سے انکار ہے ؛

خاقان :۔ اری تو ناتجربہ کار ہے۔ سودائی! کہاں بہن اور بھائی۔ یہ مثل مشہور ہے کہ آنکھ اور ابرو ساتھ ساتھ رہ کر ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے ؛

دل آرا :۔ یہ تو باتیں ہیں جناب والا !

خاقان :۔ اس ---- اس ---- ، ہی کو دیکھ جس کو میں نے بڑی گود میں پالا۔ دن کو رات اور رات کو دن کر ڈالا۔ آج یہ خدا کو بھولی ہے۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ خاقان کس باغ کی مولی ہے ؛

ماہ پارہ :۔ یہ میرا قصور نہیں۔ یہ آپ کا پرجوش غصہ ہے ----

خاقان :۔ بیٹی! اب مجھ کو پاگل نہ بنا ---- جا مجھ کمبخت کو اپنی زندگی کسی طرح گزار لینے دے۔ پیاری دل آرا! کیا تو اپنے بوڑھے باپ اور اس کے سو نوکروں کا خرچ برداشت کرے گی ؟

(ماہ پارہ ہاتھ کی اُنگلی سے بہن کو منع کرتی ہے)

دل آرا :۔ اوّل تو آپ کو باجی کے ہاں جانے سے انکار ہے۔ دوسرے جب

میرے پاس ہزاروں نوکر ہیں۔ تو آپ کو سو آدمی رکھنے کی کیا ضرورت ہے ؟"

خاقان :- "اچھا تو میں پچاس پر ہی قناعت کروں گا "

دل آرا :- "یہ بھی زیادہ ہیں "

(دل آرا پھر باجی کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ آنکھ کے اشارے سے منع کرتی ہے)۔

خاقان :- "اچھا چالیس، تیس، بیس۔ دس ؟"

ماہ پارہ :- "ابی ایک آدمی کافی ہے اور بس "

دل آرا :- "بس "

ماہ پارہ :- "سچ پوچھو۔ تو ایک کی بھی کیا ضرورت ہے ؟"

خاقان :- "اے خدا! اگر تیری یہی مرضی ہے کہ میں ان لڑکیوں کے سامنے ذلیل ہوں تو مجھ کو صبر کا سہارا دے ___ ادنا خلف عورتو! کیا تم سمجھتی ہو کہ ظالم مظلوم کو ستا کر چل پاتا ہے۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ دھوکا نہ کھاؤ۔ خدا ٹھٹھوں میں اڑایا نہیں جا سکتا۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اس کی چکی چلنے میں سست اور پیسنے میں تیز ہے۔ میں اُس کے پاس اپنی فریاد لے کر جاؤں گا۔ میں اپنی چیخوں سے اس کے قہر کو جگاؤں گا۔ وہ بولے گا۔ میں بلاؤں گا۔ وہ سُنے گا۔ میں سناؤں گا۔ بلکہ اپنے دل کے ٹکڑے دکھاؤں گا۔"

(خاقان اپنا سینہ چیرنا چاہتا ہے۔ شہسوار روکتے ہیں۔ بادشا بیہوش ہو جاتا ہے)۔ ڈراپ

مولانا ظفر علیخاں

۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مشن سکول وزیر آباد میں پائی۔ اور علی گڑھ کالج سے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ کچھ مدت نواب محسن الملک کے سیکرٹری رہے پھر دارالترجمہ حیدر آباد میں شامل ہو گئے۔ اور ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ سیکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ کے عہدہ پر پہنچے۔ حیدر آباد سے واپس وطن آنے کے بعد مولانا نے لاہور سے روزنامہ "زمیندار" جاری کیا جو اپنے وقت کا نہایت وقیع اور موقر روزنامہ تھا۔ اور اب تک جاری ہے۔

مولانا بہت بڑے شاعر، زبردست مقرر اور زبردست انشاء پرداز تھے۔ تقریر اور تحریر میں زور اور روانی بہت تھی۔ مولانا کی سب سے بڑی خوبی ترجمے میں نئے نئے الفاظ کی تخلیق ہے۔

مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ سیاسیات میں گزرا معرکہ مذہب و سائنس، غلبہ روم منظوم ڈرامہ، جنگ روس و جاپان مولانا کی مشہور تصانیف ہیں۔

مرحوم کا کلام بھی "بہارستان" اور "نگارستان" کے نام سے چھپ چکا ہے۔
مولانا کا ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

سکندر اور ٹالیمی

جب اس علاقہ کی طرف سے جو پشت پہ واقع تھا۔ ہر طرح اطمینان ہو چکا تو سکندر نے شام کی طرف مراجعت کی اور اپنے لشکر کو کہ جس میں اب پچاس ہزار جنگ آزمودہ سپاہی موجود تھے۔ لے کر مشرق کی جانب بڑھا۔ دریائے فرات سے پار اتر کر بہت زیادہ تر جنوبی میدانوں کی سخت گرمی سے بچنے کے لئے اس نے کوہستان میسیا کے دامن دامن سفر کیا۔ اس طور پر رسالہ کے گھوڑوں کے لئے چارہ بھی با فراط بہم پہنچتا رہا۔ دجلہ کے بائیں کنارے پر اربیلا[۱] کے نزدیک اس کا مقابلہ اس گیارہ لاکھ کے عظیم الشان لشکر سے ہوا جسے کو دارا بابل سے جمع کر کے لایا تھا۔ شہنشاہ ایران شکست کھا کر مارا گیا۔ اور اب مقدونوی سپہ سالار اس تمام علاقہ پر قابض ہو گیا۔ جو دریائے ڈینیوب اور دریائے انڈس کے درمیان واقع تھا۔ بالآخر سکندر نے اپنی فتوحات کو آب گنگ تک وسعت دی۔ تسخیر شدہ ممالک میں جو خزانہ اس کے ہاتھ آیا۔ وہ حساب و شمار سے باہر ہے۔ مورخ ایرئین کہتا ہے کہ ایک فقط سوسا[۲] ہی میں اس کو پچاس ہزار ٹیلنٹ کی رقم ملی

---

۱ آج کل اردبیل کے نام سے مشہور ہے۔ اور موصل سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر جانب شمال و مشرق واقع ہے۔ یہ وہی اردبیل ہے جس کا ذکر سعدی اس شعر میں کرتا ہے

؎ یکے آہنیں پنجہ در اردبیل ہمے بگذرانید بیلک زبیل

۲ فارسی میں سوس کے نام سے مشہور ہے۔ ایران قدیم زمانہ کا پایہ تخت تھا۔ اب اس کے صرف کھنڈر رہ گئے ہیں۔ جو بغداد سے ڈھائی سو میل کے فاصلہ پر

فن سپاہ گری نے موجودہ مبصرین اس حیرت انگیز فوج کشی اور کشورکشائی کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ۲ بنانے دار دانیال کا عبور۔ رود گرینیکس سے باوجود غنیم کی مزاحمت کے پار اترنا۔ مفتوحہ ایشیائے کوچک کے سیاسی نظم ونسق کے لئے موسم سرما بسر کرنا۔ میمنہ وقلب فوج کا بحر روم کے ساحل شام کے کنارے کنارے آگے بڑھنا۔ ٹائیر کے محاصرہ کے وقت انجنیری کی گوناگوں مشکلات پر غالب آنا۔ غزہ کا محاصرہ اور تسخیر۔ یونان سے ایران کی علیحدگی۔ بحر روم سے ایران کی بحری قوت کا کامل اخراج۔ اہل ایتھنس یا اسپارٹا کو رشوت دے کر اپنے ساتھ حسب سابق ملا لینے کے متعلق ایران کی سازشوں کا توڑ۔ مصر کی فتح اور اس کے ملکی انتظام کی تکمیل کے لئے ایک اور موسم سرما گزارنا۔ آئندہ موسم بہار میں تمام فوج کا بحیرۂ اسود اور بحیرۂ قلزم کی طرف سے اکر جزیرہ کے شورہ زار میدانوں پر آپس میں مل جانا۔ تھپساکس کے ٹوٹے ہوئے پل پر بید مجنوں کے گھنے جھنڈوں میں سے رود فرات سے گزرنا۔ دجلہ سے پار اترنا۔ اربیلا کی عظیم الشان اور مشہور ومعروف لڑائی کے شروع ہونے سے پہلے رات کے وقت طلایہ گری کرنا۔ میدان جنگ پر نقل وحرکت کرتے وقت ترچھی سمت اختیار کرنا۔ دھاوا کر کے غنیم کے قلب پر جا پڑنا۔

(بقیہ نوٹ) جانب جنوب ومشرق ایک ندی کے کنارے پائے جاتے ہیں سکندر اور اس کے جانشینوں نے جب اپنا پایہ تخت بابل قرار دیا۔ تو سوس کی عظمت وذقعت گھٹنی شروع ہوگئی۔ لیکن ساتویں عیسوی کے وسط تک پھر بھی اس کی آبادی اور رونق کی یہ کیفیت تھی کہ جب حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمانوں نے ایران کو مسخر کیا۔ تو اہل سوس نے بہ سرکردگی ہرمزان مسلمانوں کا جان توڑ کر مقابلہ کیا ؛

(جنگ آسٹرلٹز[1] کے موقع پر کئی صدیوں کے گزر جانے کے بعد یہی چال کام آئی) فرمانروائے ایران کے تعاقب میں سرگرمی و استقلال سے کام لینا۔ یہ تمام ایسے کارنامے ہیں کہ زمانہ مابعد کا کوئی سپہ سالار ان میں سکندر پر سبقت نہیں لے گیا۔

یونانیوں کی عقل و ادراک کی قوتوں کو اس طور پر بہت بڑی تحریک پہنچی مقدونیوی فوج کے ساتھ بہت سے ایسے لوگ تھے جنھوں نے ڈینیوب سے نیل اور نیل سے گنگا تک کشور نوردی کی تھی۔ اور زمانہ کا سرد گرم سب دیکھا تھا۔ بحیرہ اسود کے اس پار کی پرغبار ہواؤں سے ٹھٹھرے تھے۔ اور صحرائے مصر کے ریگ آلود طوفاں اور آتش افشاں بادِ سموم نے ان کو جھلسا تھا۔ اہرام مصر جن کو کھڑے کھڑے اس وقت بھی بیس صدیاں گزر چکی تھیں۔ لکسار کے مخروطی مینار جن پر خطِ تصویر[2] میں کتبے کندہ تھے۔ گزرگاہیں جن میں عورت جیسے سر اور شیر جیسے بدن والے جانوروں کے خاموش و پُراسرار بُت کھڑے تھے۔ اور ان فرمانرواؤں کے سنگین دیو ہیکل مجسمے جن کی حکومت کا پھریرا دنیا کے سپیدہ سحری میں اُڑتا ہوگا۔ ان کی نظر سے گزرے تھے۔ اسرا ہدان[3] کے محل میں قدیم سلطنت

---

[1] آسٹرلٹز ملک آسٹریا کا ایک قصبہ ہے۔ اور پایہ تخت وائنا سے جانب شمال مغرب ۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی شہرت کا باعث یہ ہے کہ ۱۸۰۵ء میں یہاں وہ بڑی جنگ ہوئی جس میں ایک طرف نپولین بوناپارٹ تھا اور دوسری طرف روس و آسٹریا کی متفقہ فوجیں۔ نپولین کو پوری فتح ہوئی اور روس و آسٹریا کے تیس ہزار سپاہی کام آئے۔

[2] خط تصویر میں نے لفظ (ہائی روگلفک) کا ترجمہ کیا ہے۔ جس سے مراد ہے قدیم مصر کی تحریر جو بجائے حروف کے تصاویر کے ذریعے لکھی جاتی تھی۔

[3] اسرا ہدان دولت اسیریا (جس کا زمانہ محققین نے سنہ ۶۷۳ء قبل مسیح سے سنہ ۶۵۸ قبل

اسیریا کے پرسطوت شاہنشاہوں کے تخت جن کے محافظ پر دار سانڈ تھے۔ انہوں نے خود کھڑے ہو کر دیکھے تھے۔ بابل کی چار دیواری جس کا دور کسی زمانہ میں ساٹھ میل سے بھی زیادہ تھا ابھی تک تین صدیوں کی دستبرد اور تین حملہ آوروں کی غارت گری کے باوجود قائم تھی اور بلندی میں اسی فٹ سے بھی بڑھ کر تھی ۔ بعل کے سربفلک کشیدہ مندر کے کھنڈر ابھی تک باقی تھے جس کی چوٹی پر وہ رصدگاہ قائم تھی ۔ جہاں کالدیہ کے سحر ساز ہیئت دان اجرام فلکی کے ساتھ مراسم شبانہ کے ادا کرنے میں مصروف ہوا کرتے تھے۔ ان دو محلوں کے آثار ابھی تک موجود تھے۔ جن کے معلق باغوں میں عظیم الشان درخت بین الارض والسما اگا کرتے تھے ۔ اور جن کو دریا سے پانی پہنچانے کی کلیں جو علم آب کے صنائع کی زندہ تصویریں تھیں اب تک ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی ہیں۔ بابل کی آب رسانی کے لئے جو مصنوعی جھیل تیار کی گئی تھی۔ اور جس کے ساتھ نہروں اور راج بہوں کا ایک وسیع سلسلہ قائم تھا۔ اس میں کوہستان آرمینیا کی پگھلی ہوئی برف پانی کا ذخیرہ بہم پہنچاتی تھی۔ اور اس برفانی سیلاب کو شہر میں سے گزرتے وقت فرات کے پشتوں نے سمیٹ رکھا تھا ۔ لیکن شاید سب سے زیادہ عجیب وغریب وہ سرنگ تھی جو دریا کی تہ کے نیچے کھودی گئی تھی ۔

اگرچہ کالدیہ ۔ اسیریا اور بابل کی سلطنتوں کے آثار قدیمہ زمانہ تاریخ کی شبہائے تار میں جا کر غائب ہو گئے تھے ۔ لیکن دولت ایران بھی

(بقیہ نوٹ) مسیح تک قرار دیا ہے۔) کے فرمانروایان طبقہ اخیر میں سے تھا ۔ ۶۰۴ قبل مسیح سے ۵۶۱ قبل مسیح تک اس نے حکومت کی اور دس مرتبہ فوج کشی کر کے اسیریا کے حدود میں عرب و مصر شامل کر لیا جس محل کا یہاں ذکر ہے اس کی تعمیر کے لئے بائیس بادشاہوں تا جداروں نے اپنے اپنے علاقہ سے مصالحہ بھیجا ۔

ملہ زمانہ حال کے ماہرین آثار قدیمہ نے اندازہ لگایا ہے کہ سلطنت کالدیہ کا زمانہ

عجائبات کے لحاظ سے جن کا تعلق بعد کے زمانہ سے تھا۔ کچھ کم ممتاز نہ
پرسیپوس (اصطخر) کے پیلپاؤں والے محلوں میں صنعت و ہنر
کرشموں کی کچھ کمی نہ تھی۔ منبت کاری۔ سنگ تراشی اور میناکاری
نوادر۔ سنگ مرمر کے کتب خانے۔ مخروطی مینار۔ عورت جیسے سر اور
بر جیسے بدن والے جانوروں کی مورتیں۔ دیو پیکر سانڈوں کے بت
بھی کچھ موجود تھا۔ اکتباناٰ جس کی خوش گوار اور ٹھنڈی آب و ہوا میں
بادشاہان ایران جاکر گرمی کا موسم بسر کیا کرتے تھے۔ خوبی و لطافت
جواہر ریزہ تھا۔ اس کے گرداگرد صاف تراشی ہوئی سلوں کی سات
متوازی چار دیواریاں قائم تھیں۔ اندر کی ہر دیوار باہر کی دیوار کی بہ نسبت
بدرجہ بلند ہوتی گئی تھی اور ساتوں دیواروں کے رنگ سات سیاروں
ہیئتی مطابقت کے لحاظ سے جدا جدا تھے۔ بادشاہ کے محل کی چھت
اینٹیں چاندی کی تھیں۔ اور شہتیروں پہ سونے کے خول چڑھے
ہوئے تھے۔ آدھی رات کے وقت جب اس محل کے دیوان خانوں میں
جن نفتا سے جلنے والے قمقموں کی قطاریں روشن کی جاتی تھیں۔ تو ایسا

۳۴ء قبل مسیح سے شروع ہو کر ۲۷۳ء قبل مسیح میں ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد دولت اسیریا قائم ہوئی ہے۔ اور ۵۳۸ء قبل مسیح تک رہی۔ اس سال میں کیخسرو شہنشاہ ایران نے بابل کو فتح کیا۔ اور بابل ایران کا ایک صوبہ ہوگیا۔ ۳۲۳ء قبل مسیح میں جب سکندر نے ایران کو فتح کیا۔ تو بابل اس کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد اہل روما اس پر مسلط ہوئے ۶۵۰ء میں عربوں نے اسے مسخر کیا اور ۱۶۳۸ء سے ترکوں کے زیر نگیں ہے۔

ہمدان یہ اس مقام پر واقع تھا جہاں آج کل ہمدان ہے۔ متن میں جس بیرونی شہر پناہ کا ذکر ہے اس کا دور پورے ۸۰ میل تھا۔ آج کل کے بعض محققین کا خیال ہے کہ اکتبانا دو تھے۔ ایک تو موجودہ ہمدان کے موقعہ پہ اور دوسرا تخت سلیمان واقع صوبہ آذربائیجان کے قریب +

معلوم ہوتا تھا گویا سورج نکلا ہوا ہے۔ وسط شہر میں ایک پُر فضا باغ جو تا جدارانِ مشرق کے لوازم عشرت میں سے شمار ہوتا ہے۔ لگایا گیا تھا۔ غرض کہ دولت ایران آبنائے درہ دانیال سے لے کر دریائے اندس تک حقیقت میں گلزار دنیا بن رہی تھی۔

میں نے ان حیرت انگیز مہمات کا ذکر کسی قدر تفصیل سے اس لئے کیا ہے کہ ان کی وجہ سے جن فوجی قابلیتوں کو تحریک پہنچی۔ وہ اسکندریہ کے مہندسانہ اور تجربہ آموز دار العلموں کے قیام کا باعث ہوئیں۔ جو علوم و فنون کا اصل سرچشمہ ہیں۔ ہم جب اپنی عمل صحیح اور یقینی معلومات کا سراغ لگاتے ہیں تو اس کا مبداء سکندر کی فوج کشی قرار پاتی ہے۔ ہمبولٹ[1] نے کیا خوب کہا ہے۔ کہ جب انسان قدرت کی نئی اور عظیم الشان چیزوں کو دیکھتا ہے تو اس کا دائرۂ خیال وسیع ہو جاتا ہے۔ سکندریہ کے لاؤ لشکر اور سردارانِ فوج کو قدم قدم پر مناظرِ قدرت کی نیرنگیاں اور رعنائیاں دیکھنے کا اتفاق پیش آیا۔ اور چونکہ یونانی قوم کی قوت مشاہدہ بہت بڑھی ہوئی تھی۔ لہٰذا جو کچھ انھوں نے دیکھا۔ اس کا ان پر نہایت گہرا اور نہایت جلد اثر ہوا کہیں ریگستانوں کی وسعت کی یہ کیفیت تھی۔ کہ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی تو وہاں ریگ کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور کہیں کوہستانوں کی بلندی

---

[1] ایک بہت بڑا جرمن عالم اور سیاح ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۹ء میں انتقال کر گیا۔ اپنی عمر کا ایک حصہ اس نے دنیا کے سفر میں صرف کیا۔ اس کا خیال تھا کہ انسانی معلومات اور انسان کے عقلی نشوونما کی ایک بسیط تاریخ لکھی جائے۔ چنانچہ جو تجربہ اس نے حاصل کیا۔ وہ کئی کتابوں میں محفوظ ہے جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب "کاسماس" (کائنات) ہے۔ ہمبولٹ کا اپنے تجربہ کے لحاظ سے یہ پایہ ہے کہ اسے ارسطوئے زمانہ حال کا لقب دیا گیا ہے۔

کی یہ حالت تھی کہ چوٹیاں بادلوں میں پہنچ کر چھپ گئی تھیں۔ صحراؤں میں سے ان کا گزر ہوا تو سراب کا موجیں مارتا ہوا دریا ان کو دکھائی دیا اور پہاڑوں کے دامن سے ہو کر نکلے تو جھومتے بادلوں کے سائے انھوں نے جنگلوں پر منڈلاتے دیکھے انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسے ملک میں پایا جہاں عنبریں رنگ کی کھجوریں۔ صنوبر و شمشاد۔ جھاڑ۔ حنا اور کیوڑے کے درخت بافراط موجود تھے ار بیلا میں ان کا مقابلہ ہندوستان کے سدھے ہوئے ہاتھیوں سے ہوا تھا بحیرۂ خضر کے سواحل کی جھاڑیوں میں وہ شیر نیستان سے دوچار ہوئے تھے۔ گینڈے اور شیر دریائی اور اونٹ اور نیل اور گنگا کے مگرمچھ غرضیکہ ایسے ایسے جانوروں کے دیکھنے میں آئے تھے۔ جو یورپ کے جانوروں کے مقابلے میں نہ صرف عجیب الخلقت بلکہ عجیب الجثہ تھے۔ میدان کارزار میں ان سے ایسی ایسی قومیں آکر لڑی تھیں جو رنگ اور لباس کے لحاظ سے بالکل جدا جدا تھیں۔ سانولے شامی۔ گندم گوں ایرانی اور سیاہ فام حبشی یہ سب ان کے خلاف معرکہ آرا ہوئے تھے۔ خود سکندر کی نسبت یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب اس کا وقت قریب آپہنچا۔ تو اس نے اپنے امیر بحر نیارکس کو بلا بھیجا۔ تاکہ اس کے سرہانے بیٹھ کر عجیب و غریب واقعات کے تذکرے سے اس کا جی بہلائے جو دریائے انڈس سے روانہ ہو کر خلیج فارس کے سفر کے اثنا میں اس کو (نیارکس کو) پیش آئے تھے فاتح اعظم نے سمندر کے مدوجزر کو استعجاب کی راہ سے دیکھا تھا۔ اور یہ بھی خیال کہ بحیرۂ خضر اور بحیرہ اسود کسی بڑے سمندر کی اسی طرح خلیجیں ہوں گی جیسا کہ نیارکس نے خلیج فارس اور بحیرہ قلزم کو پایا۔ اس نے بحیرہ خضر کی تحقیقات کے لئے جہاز بنوائے تھے۔ ساتھ ہی اس نے یہ قصد کیا تھا۔ کہ اس کا بیڑہ افریقہ کے گرداگرد سفر کر کے جبرالٹر میں سے ہو کر بحیرہ روم میں پھر آداخل ہو۔ کیونکہ بیان کیا جاتا تھا کہ فراعنہ مصر کے زمانہ میں ایک

وغیرہ بحری کارنامہ انجام پا چکا ہے۔

سلطنت مفتوحہ میں نہ صرف یونان کے بڑے بڑے سپہ سالاروں بلکہ مشاہیر فلاسفہ نے بہت سی ایسی باتیں دیکھیں جن کا خواہ مخواہ ان کو معترف ہونا پڑا۔ کیلستھینیز[1] کو بابل میں کالدیہ کے ہیئت دانوں کے مرتب کئے ہوئے ہیئتی نقشوں کا ایک سلسلہ دستیاب ہوا جس میں ۱۹۰۳ برسوں کے رصدی نتائج مندرج تھے۔ یہ نقشے اس نے ارسطو کے پاس بھیج دیئے۔ چونکہ یہ نقشے اینٹوں پر کندہ تھے۔ اس لئے ممکن ہے کہ ان کے مثنٰے تحقیقات زمانہ حال کی مساعی کی بدولت شاہان اسیریا کے خشتی کتب خانوں سے برآمد ہوں۔ مصر کے مشہور ہیئت دان بطلیموس کے پاس علمائے بابل کی تیار کی ہوئی کسوف و خسوف کی جدولیں موجود تھیں جن میں مسیحی سال سے ۷۴۷ برس پہلے تک کی کیفیت مندرج تھی۔ ان ہیئتی نتائج کی تحقیق کے لئے جن میں سے بعض ہم تک پہنچے ہیں۔ ضرور ہے کہ مدید و متصل رصد بینی سے کام لیا گیا ہو۔ مثلاً ہیئت دانان بابل نے سال استوائی[2] کی جو مدت مقرر کی تھی۔

---

[1] ارسطو کا بھتیجا اور شاگرد اور سکندر کا ہم سبق تھا۔ سنہ ۳۶۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۳۳۴ میں سکندر کے ہمراہ ایران و ہندوستان کی مہم پر گیا۔ چونکہ اکھڑ اور درشت مزاج تھا اور سکندر کے آسمانی نژاد ہونے کے دعویٰ کی اس نے تحقیر کی تھی۔ لہذا سکندر نے اسے قید کر دیا اور اس قید میں اس نے وفات پائی۔ اس کی تصانیف ہم تک نہیں پہنچیں۔

[2] سال استوائی (TROPICAL YEAR) اس زمانہ کا نام ہے جو تاریخ الشمس کے کسی نقطہ معینہ سے زمین کے روانہ ہونے اور پھر اسی نقطہ پر پہنچنے کے درمیان منقضی ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ۳۶۵ء ۲۴۲۲۶ دن ہے

اس میں اور صحیح مدت میں ۵۳ سکنڈ کا فرق ہے۔ اور سال کوکبی کی مدت کا جو اندازہ انھوں نے لگایا وہ اصلی مدت سے صرف دو منٹ بڑھ کر ہے۔

نقاط اعتدال لیل و نہار کی ترقی معکوس[2] کی حقیقت سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ کسوف و خسوف کے اسباب کا ان کو علم تھا اور اپنے دور کی مدد سے جس کا نام سیراس تھا وہ پیشین گوئی کر سکتے تھے کہ سورج یا چاند کو کب گہن لگے گا۔ اسی ہندسی دور کی مدت میں جو ۶۵۸۵ دن سے کچھ اوپر تھا۔ اور صحیح مدت میں ساڑھے انیس منٹ کا فرق تھا۔ اُن واقعات سے اس امر کا قطعی ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ مسوپوٹیمیا (جزیرہ) میں علم ہیئت کو ترقی دینے میں نہایت دقت نظر اور استقلال سے کام لیا گیا تھا۔ اور باوجود ناکافی ذرائع اور آلات کے اس فن میں بہت کچھ کمال حاصل کیا گیا تھا۔ ان قدیم ہیئت والوں نے ستاروں کی زیچیں تیار کی تھیں۔ منطقۃ البروج

---

[1] سال کوکبی (SIDERIAL) اس زمانہ کا نام ہے جو زمین اور سورج اور کسی ستارہ معینہ کے ایک برج میں جمع ہوکر دوبارہ اسی برج میں جمع ہونے کے درمیان گزرتا ہے۔ اس زمانہ کی اوسط مدت ۳۶۵٫۲۵۶۳۸ دن ہے۔

[2] نقاط اعتدال لیل و نہار کی ترقی معکوس اس واقعہ کا نتیجہ ہے کہ زمین پوری طرح گول نہیں ہے۔ زمین جس فرضی خط کے گرد گھومتی ہے۔ وہ اس خط کی طرف جھکا ہوا ہے جس پر وہ سورج کے گرد گردش کرتی ہے۔ اور اس لئے وہ دائرے جو خط استوا اور خط طریق الارض سے متحیز ہیں ایک دوسرے کو دو نقطوں پر قطع کرتے ہیں۔ ان دو نقطوں کا نام نقاط اعتدال لیل و نہار ہے۔ چونکہ کرۂ زمین قطبین کی بہ نسبت خط استوا پر زیادہ اُبھرا ہوا ہے۔ لہٰذا سورج اور چاند اس ابھرے ہوئے مادے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں جس کی وجہ سے نقاط اعتدال لیل و نہار آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف ہٹتے جاتے ہیں۔ اسی حرکت کا نام نقاط اعتدال لیل و نہار کی ترقی معکوس ہے۔

کو بارہ برجوں میں تقسیم کیا تھا۔ اور دن رات کے بارہ بارہ گھنٹے مقرر کئے تھے
ارسطو کہتا ہے کہ ایک عرصہ دراز تک ان کا یہ مشغلہ رہا کہ اس واقعہ کو بغور
مشاہدہ کیا کریں کہ چاند کن کن ستاروں کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔
نظام شمسی کی ترتیب کے متعلق ان کی رائے صحت پر مبنی تھی۔ سیاروں کے
تغیرات کی ترتیب سے وہ باخبر تھے۔ سورج گھڑیاں۔ پانی گھڑیاں۔ اصطرلاب
اور مقیاس الماء وہ بخوبی بنا سکتے تھے۔

چھاپے کا جو طریقہ ان علماء نے ایجاد کیا تھا۔ وہ ہمارے لئے ابھی تک
دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک گھومنے والے بیلن پر مختلف حروف ہیں وہ اپنی
یادداشتیں کندہ کرتے تھے۔ اور اس بیلن کو گوندھی ہوئی نرم مٹی کی تختیوں
پر پھیرنے سے غیر ممکن المحو نقوش اُٹھا لیتے تھے۔ ان کے ان تختیوں کے کتب خانوں
میں ابھی تک علمی و تاریخی حقائق کے انمول موتی ہم کو ڈھونڈنے پر ملتے ہیں
علم مناظر و مرایا سے بھی وہ بے خبر نہ تھے۔ بابل کے آثار میں جو محدب شیشہ
برآمد ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے آلات کی حقیقت ان کو معلوم تھی۔
جو چیزوں کو بڑا کر کے دکھاتے ہیں۔ علم ہندسہ میں ان کو اکائی دہائی کی حسابی
قیمت کا راز معلوم ہو گیا تھا۔ اگرچہ ہندوستان کی عظیم الشان ایجاد صفر کی حقیقت
ان پر آشکار نہ ہوئی تھی۔

اس طور پر اگرچہ اہل یونان کے عقلی نشو و نما کا باعث ایک حد تک
یہ تھا کہ حقائق قدرت کے متعلق ان کا دائرہ نظر زیادہ وسیع ہو گیا۔ لیکن اس
نشو و نما کو اُن معلومات نے بہت بڑی زبردست تحریک پہنچائی۔ جو
ممالک مفتوحہ کے مذہب کے متعلق ان کو حاصل ہوئیں۔ یونان کی بت پرستی
کو ایران نے ہمیشہ تنفر کی نظر سے دیکھا تھا۔ چنانچہ جب کبھی فرمانروایانِ ایران
یونان پر حملہ آور ہوئے تو اُنھوں نے ہمیشہ وہاں کے بتکدوں کو برباد کیا۔
اور ناپاک یونانی دیوتاؤں کے مندروں کی طرح طرح سے بے عزتی کی۔ اہلِ یونان

پر اس واقعہ نے کہ ان کے دیوتاؤں کی اس طرح بے حرمتی ہو اور بے حرمتی کرنے والے دیوتاؤں کے قہر و غضب سے بچ جائیں بہت گہرا اثر کیا۔ اور مقامی مذہب کی بنیاد بہت کچھ متزلزل ہو گئی لیکن اولمپس کے ان ناپاک معبودوں کی پرستش کرنے والے جن کی عیاشانہ زندگیاں ہر متقی و پرہیزگار شخص کی رُوح پر صدمہ پہنچاتی ہوں گی۔ ایک ایسے عظیم الشان۔ پُرتمکین اور غیر متناقض مذہب سے آکر دوچار ہوئے جس کی بنیاد فلسفہ پر تھی ایران نے ان تمام سلطنتوں کی طرح جن کی عمریں بڑی ہوتی ہیں۔ متعدد مذہبی قالب بدلے تھے۔ ایک عرصہ تک ایرانی قوم زردشت کی تعلیم وحدانیت کی پیروِ رہی۔ اس کے بعد اس نے دوئی کو اپنا مسلک قرار دیا۔ اور کچھ زمانہ کے بعد اس کو بھی چھوڑ کر مجوسیت اختیار کی۔ جس وقت سکندر حملہ آور ہوُا تو اہل ایران کا مذہب یہ تھا کہ ایک عقل کل ایسی موجود ہے۔ جو تمام چیزوں کی خالق، سب کی نگہبان اور ہر شے پر حکمران ہے۔ اور جو حق کا پاک ترین جوہر اور مبداء ہمہ خیر ہے۔ اس ہستی کاملہ کو کسی مورت یا تصویر کے ذریعہ ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ اور چونکہ اس عالم سفلی میں ہم ہر ایک شے کو دو متقابل قوتوں کے عمل باہمی کے نتیجہ کی شکل میں پاتے ہیں۔ لہٰذا ہستی موصوف کے تحت میں دو برابر کی ازلی و ابدی طاقتیں پہلو بہ پہلو قائم ہیں۔ جن کو نور و ظلمت سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ یہ طاقتیں غیر متناہی کشاکش میں مصروف ہیں۔ دنیا ان کا میدان کارزار اور انسان ان کا مورد نزاع ہے۔

دوئی کی قدیم روایتوں میں مذکور ہے کہ طاقتِ شر نے ایک سانپ کو اس بہشت کے برباد کرنے کی غرض سے بھیجا جس کو طاقتِ خیر نے بنایا تھا۔ ان روایتوں کا بنی اسرائیل کو اس زمانہ میں علم ہوا۔ جب وہ بابل میں قید تھے۔

جس طرح نور کے وجود کے ساتھ سایہ کا وجود وابستہ ہے اسی طرح

طاقت خیر کا موجود ہونا اس امر کا مستلزم ہے کہ ایک طاقت شر موجود ہے اس طور پہ دنیا میں جس کا خالق اور حاکم منتہائے خیر ہے۔ شر کے وقوع کی توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ نور و ظلمت یعنی ارمزد و اہرمن میں سے ہر ایک کے ماتحت اپنے اپنے فرشتے اپنے اپنے مشیر و ندیم اور اپنی اپنی فوجیں تھیں۔ نیک آدمیوں کا فرض ہے کہ حق پژوہی۔ پاک بازی اور ریاضت کو اپنا شعار بنائیں۔ اس زندگی کے ختم ہونے پر وہ ایک دوسری دنیا میں ایک نئی زندگی بسر کرنے کی امید رکھ سکتے ہیں اور ان کو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ مرنے کے بعد وہ اسی جسم سے اٹھیں گے۔ ان کی روح کو بقائے ابدی حاصل ہو گی اور ان کی آنے والی زندگی مدرک و خبیر ہو گی۔

دولتِ ایران کے دورِ آخر میں مجوسیت کے اصول زردشتی عقائد پر بتدریج غالب آگئے تھے۔ مجوسیت حقیقت میں عناصر کی پرستش تھی۔ جن میں سے آگ کو بزرگ و برتر کا سب سے زیادہ موزوں قائمقام سمجھا جاتا تھا۔ قربان گاہوں پر جو معبدوں کے بجائے آسمان کے زبرجدی شامیانہ کے تلے تعمیر کی جاتی تھیں۔ دائمی آگ چلائی جایا کرتی تھی اور آفتاب بحالت طلوع انسان کا سب سے بڑا معبود تصور کیا جاتا تھا۔ اہل ایشیا کے نزدیک شہنشاہ کے حضور میں کوئی شے سوائے ذاتِ شہنشاہ کے نظر نہیں آ سکتی۔ اسی طرح صحن فلک میں سلطان خاور کے ہوتے ہوئے دوسری اشیاء غائب ہو جاتی ہیں۔

سکندر کے بہت سے منصوبے ابھی تکمیل طلب تھے۔ کہ اپنی عمر کے تینتیس ۳۳ سال کے پورے ہونے سے پہلے ۳۲۳ قبل مسیح میں بمقام بابل اس کا قبل از وقت انتقال ہو گیا۔ لوگوں کو شبہ ہوا کہ اس کو زہر دے کر مار ڈالا گیا۔ اس کی طبیعت ایسی بے قابو اور اس کے جذبات ایسے تند ہو گئے تھے کہ اس کے سردارانِ فوج یہانتک کہ اس کے بے تکلف

دوست اس کی طرف سے ہر وقت خوف میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کو جس کا نام کلائٹس تھا۔ اس نے غیظ وغضب کی حالت میں جگر میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ کیلسنیھیز کو جو اس کے اور ارسطو کے درمیان واسطہ تھا۔ اُس نے سولی دلوا دی۔ ممکن ہے کہ سازش کنندوں نے اپنے بچاؤ کے لئے اس کے قتل کا عزم کیا ہو۔ لیکن ارسطو پر جو اس سازش میں شریک ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے محض افترا پردازی ہے۔

سکندر کے بعد کئی سال تک ابتری اور خون ریزی کا ہنگامہ برپا رہا۔ اور اس وقت بھی فرو نہ ہوا جبکہ مقدونوی سردارانِ فوج نے سلطنت کے حصے بخرے کر لئے۔ اس دورِ انقلاب میں صرف ایک واقعہ ایسا ہے جو ہماری توجہ کا محتاج ہے۔ ٹالیمو جو ارسینو نامی ایک حسینہ و جمیلہ خواص کے بطن سے شاہ فیلقوس کا بیٹا تھا۔ اور جسے باپ نے ناراض ہو کر سکندر کے ساتھ لڑکپن میں جلا وطن کر دیا تھا اور جو اکثر معرکوں اور تمام مہموں میں سکندر کے ساتھ رہا تھا۔ مصر کا حاکم اور بالآخر بادشاہ ہو گیا۔ جزیرہ روڈس کے محاصرے کے وقت ٹالیمی باشندگانِ روڈس کے اس قدر کام آیا کہ فرطِ احسان مندی سے انھوں نے اس کی تعظیم میں ربانی مراتب داخل کئے۔ اور سوٹر (نجات دہندہ) کا اس کو لقب دیا۔ اس لقب کی وجہ سے وہ بعد کے مقدونوی فرمانروایانِ مصر سے ممتاز ہے۔

ٹالیمی سوٹر نے اپنا پایۂ تخت اسکندریہ میں قائم کیا۔ جب مقدونوی فاتح جوپیٹر امن دیوتا کے مندر کو جاترا کے لئے گیا تو یہ پیش بندی کر کے کہ اس شہر کو ایشیا اور یورپ کا تجارتی گودام بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے اسکندریہ کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ امر خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ نہ صرف خود سکندر نے بہت سے یہودیوں کو فلسطین سے لاکر بسایا تھا اور ان تمام

دیوں کو وہی حقوق عطا کئے گئے - جو مقدونیوں کو حاصل تھے - ان کو یونانی
اسرائیل کا امتیازی لقب دیا گیا - علیٰ ہٰذا القیاس تالیمی سوٹر کی عدل
ستری کا شہرہ سن کر بہت یونانی بھی مصر میں آ پناہ گزین ہوئے -

یونانی کاری گروں اور معماروں نے اسکندریہ کو دنیائے قدیم کا
ب سے زیادہ خوبصورت شہر بنا دیا تھا - بڑے بڑے عالیشان محل اور
مدہ اور تماشا گاہیں ان کی صناعیوں کا زبان حال سے اعتراف کرتی
یں - شہر کے وسط میں ان دو بڑے بازاروں کے نقطہ تقاطع پر جو
ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ بناتے ہوئے قطع کرتے تھے - باغوں
ر فواروں اور مخروطی میناروں سے گھرا ہوا وہ مقبرہ کھڑا تھا جس میں
سری دستور کے موافق سکندر کی حنوط آلودہ نعش دفن تھی - دو سال کے
نی سفر کے بعد یہ لاش بابل سے بصد تزک و احتشام یہاں لائی گئی تھی -
بوت اول طلائے خالص کا تھا - مگر چونکہ نباشوں کی طماعی مقبرے کی
حرمتی کا باعث ہوئی - لہٰذا سونے کے بجائے تابوت سنگِ مرمر کا
دیا گیا - فیراسی کا عظیم الشان روشنی کا مینار دنیا کے سات عجائبات میں
ار ہوتا تھا - یہ مینار سفید سنگِ مرمر کی سلوں سے بنایا گیا تھا - اور اس
ر بلند تھا کہ جو الاؤ ہر وقت اس کی چوٹی پر جلتا رہتا تھا - وہ سمندر
ں کئی میل سے نظر آتا تھا - لیکن فنِ تعمیر کے یہ تمام حیرت انگیز صنائع
الغ ایسے نہیں کہ ہماری توجہ ہمہ تن ان میں محو ہو جائے - مصر کے
ندونوی فرمانرواؤں کا سب سے بڑا کارنامہ اور سب سے زیادہ عظیم الشان
گار عجائب خانہ ہے جس کے اثرات اس وقت بھی قائم رہیں گے - جبکہ
رام مصر بھی مٹ گئے ہوں گے -

اسکندریہ محض مصر ہی کا پایہ تخت نہیں تھا - بلکہ دنیا کا عقلی دار الخلافہ
ا - اسکندریہ کی نسبت یہ قول بالکل درست ہے کہ یہاں مشرق و مغرب

نقلیں آپس میں آکر ملتی تھیں۔ دنیائے قدیم کا یہ پیرس اہل دول کی عشرت پرستی اور اربابِ تحقیق کی تشکیک کا عالمگیر مرکز بن گیا۔

عجائب خانہ اسکندریہ کے قیام میں ٹالیمی سوٹر اور اس کے بیٹے فلیڈ لفس کے پیش نظر تین مقاصد تھے :۔

۱۔ بقائے علوم مروجہ

۲۔ ان کی ترقی اور

۳۔ ان کی اشاعت

سید سجاد حیدر یلدرم

سید سجاد حیدر نام۔ اصل وطن نہٹور ضلع بجنور۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں علی گڑھ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کی ملازمت کے سلسلے میں تین سال تک بغداد بھی رہے جہاں آپ نے ترکی زبان سیکھی اور اس میں کافی دستگاہ حاصل کر لی۔ بغداد سے واپس آنے کے بعد ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔ انگریزی، عربی، فارسی اور ترکی لٹریچر کے وسیع مطالعے نے اُن کی انشاپردازی کو انہی کے لئے مخصوص کر دیا۔ آپ لوگوں کو افسانوں کے ذریعے حقائق زندگی سے روشناس کرتے ہیں خاص ملکہ رکھتے تھے ان کی تصنیفات میں خیالستان اور حکایات و احتسابات بہت مشہور ہیں۔ حال ہی میں آپ کا انتقال ہوا ہے۔

یلدرم کی زبان اور خیال دونوں میں ایک خوشگوار ندرت پائی جاتی ہے۔ انہوں نے اُردو میں بعض ایسی نادر تراکیب اور بندشوں کا اضافہ کیا جن سے زبان ان سے قبل ناآشنا تھی

کوسم سُلطان

(تاریخ عثمانی کا ایک ورق)

وہ ایک شاہانہ کمرے میں رہتی تھی، جس کا سازوسامان جس کے مفروشات جس کے پردے قیمتی بھاری اور ریشمی تھے۔ وہ بہ نسبت صنعت کارانہ ہونے کے زیادہ محتشم تھے۔ اس نظر فریب نمائش، اس رنگین دبدبہ میں تنہا، سادہ جو ہستی نظر آتی تھی وہ اس محلسرا کی حقیقی حاکمہ، تمام ملک عثمانی کی حقیقی ملکہ

کوسم سلطان تھی۔ وہ میانہ قد، نحیف و نازک عورت تھی، اُس کے پژمردہ ضعیف مگر کتابی چہرہ میں، اس کے خشک رخساروں میں اُس کی اوڑھنی کے نیچے نہایت احتیاط سے باندھے ہوئے گہرے رنگ کے بالوں میں جن میں کہیں کہیں سفیدی آنی شروع ہوگئی تھی، اس کی ستواں لمبی ناک میں جس کے نتھنے اکثر متحرک رہتے تھے۔ اس کے باریک ہونٹوں میں اگر کوئی یہ ڈھونڈتا کہ مشرق کا وہ اسرار انگیز حسن و ادا نظر آئے جس نے صدہا سال اپنے باریک پردوں سے عالم او بیات میں لوگوں کے تخیل پر اک خواب کا سا اثر ڈالا ہے۔ تو وہ وہاں نظر نہ آتا۔ اس کی آنکھیں گہری۔ اور اثر ڈالنے والی تھیں۔ جن کو نہ اس کے سن و سال نہ اس کی لمبی اور پُرخطر واقعات سے مملو زندگی نے بگاڑا تھا۔ اُن آنکھوں سے ایسی تیز اور ضیا بار شعاعیں نکلتی تھیں جو اپنے مخاطب کے سب سے زیادہ پوشیدہ، سب سے زیادہ تاریک افکار کو روشنی میں لے آتی تھیں۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کی پلکوں سے چھن چھن کر جو روشنی نکل رہی ہے۔ اس میں فتنہ و فساد یا وہم ہوس و احتراص کا عنصر زیادہ ہے۔

غرضکہ وہ اپنی معظم و شاہانہ ہیئت مجموعی، اپنے باریک مگر حاکمانہ ابرووں اور ارادہ و حیات پرور آنکھوں کی وجہ سے اک فقیر کے جھونپڑے سے نکل کر اس پرشان و شوکت محلسرا میں پہنچی۔ اور وہاں پہنچ کر اُس نے خاقان مرحوم کی روح کی گہرائیوں میں گھر کر لیا تھا۔ کہ وہاں سے کسی کے نکالے نہ نکلی۔ اُن دیوان خانوں میں جن کے کونے کونے دلیر و دل ربا کوہ قاف والیوں کے پرعظمت ناز و ادا سے بھرے پڑے تھے۔ اس نے پہنچ کر زندگی کی چہل پہل کو ہزار گونہ زیادہ کر دیا۔ وہ ہمیشہ اوپر جانے کی کوشش کرتی تھی۔ اور اپنی ذکاوت و فراست سے اس نے صرف سب سے زیادہ محبوب اور سب سے محترم ملکہ کا درجہ ہی حاصل نہیں کر لیا۔ بلکہ اس کے اثر نے رفتہ رفتہ محلسرا سے نکل کر ریاست میں ملک کے امور داخلی و خارجی میں، ثروت و اقتصادیات میں

غرضکہ ہر شے میں نفوذ کرنا شروع کر دیا تھا۔

مگر ایک دن اُس نے دیکھا کہ اُس کی فرماں روائی جسے وہ اب اپنا حق سمجھنے لگی تھی، اور اس کا اثر سب سرنگوں تھے۔ اور اور عورتیں اس کی حکمرانی میں شریک تھیں۔ آج وہ دوسرے درجے پر تھی۔ شاید کسی درجے پر نہ تھی۔ کیا یہ ہی ہونا تھا۔؟

اور پھر اپنے ہی بیٹے کے سامنے، اور بیٹا بھی کون بیٹا سلطان ابراہیم۔ محلسرا کے بھاری ریشم کے پردے ہوا سے خاموشی سے ہل رہے تھے۔ ان پردوں نے صدیوں سے حشمت مآب سلاطین کے وقار حکمرانی کو گویا وہاں مس کیا تھا وہ ان کی ہم آہنگ ہو کر خاموشی سے اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اُس کی کامدار پاپوش سے قالین کے اوپر کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ اس کے اعضا سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک چیتا ہے جو حملہ کرنے سے پہلے خاموشی سے آمادۂ جست ہے اور فاصلے کو جانچتا ہے۔ اس کی آنکھوں کی سُرخی زیادہ ہوگئی ہے۔ ہاتھ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خوفناک اور بارد تبسم ہے۔ جو اس کے شدتِ فکر کو ظاہر کر رہا ہے۔

آج وہ اپنے تئیں نہایت شدید بحران و ہیجان میں پاتی ہے۔ بیٹا اور سلطنت مگر اُس کے دل کے باریک ترین تاروں میں اس کی ہستی کے پوشیدہ ترین عنصر میں، یہ نہ خیال کیجئے گا کہ کوئی معمولی، کوئی قدرتی آرزو پوشیدہ ہے۔ اُس کا مرحوم شوہر، اس کا بیٹا، محل شاہی حتیٰ کہ ایک عظیم الشان ملک و ملت اس کی طاقت و قدرت کے زیادہ کرنے کے وسیلوں کے علاوہ اور کچھ نہ تھے قدرتی طور پر اُسے جس چیز سے سب سے زیادہ مربوط ہونا چاہئے تھا۔ وہ ترک قوم تھی، جس سے نکل کر وہ اس درجہ پر پہنچی تھی۔ وہ اس سے مربوط تھی۔ مگر یہ رابطہ کس قدر ہلکا، کس قدر نامحسوس تھا! تخت ٹکرے ٹکرے ہوئے انقلابات سیاسی کا ظہور ہوا۔ خون کے دریا بہے۔

وہ متاثر نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ اس کے بچوں کی مصیبت بھری زندگی بھی اُسے ٹھیس لگائے بغیر گزر گئی۔ اب اُس نے معلوم کیا کہ خاندان شاہی کے منظم سلسلے میں کوئی رسی انسان کو باندھ نہیں سکتی۔ ماں کا درجہ بھی یہاں ہیچ ہے۔ مگر اس دبدبہ و احتشام میں تنہا زندگی بسر کرنے والی عورت نے چاہا کہ ایک سلطنت کے اوپر سلطنت قائم کرے اور اس میں وہ کامیاب ہوئی۔

آج وزیر اعظم احمد پاشا قتل ہو چکا تھا۔ ینی چریوں کی بغاوت کا ظہور ہو چکا تھا۔ بازاروں میں، سڑکوں پر اختلال تھا۔ اور ملک سانس لینے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس بات کا منتظر تھا کہ کوئی مہم موقع پیدا ہو۔ ہر شخص اس کے لئے چشم براہ تھا۔ اس انتظار میں کوسم سُلطان بھی ملک کی شریک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ آخری فجیعہ[۱] قطعی طور پر زمام حکومت اس کے ہاتھ میں دیدے گا۔ یہ عورت حکومت و قوت کو عزیز ترین خون سے زیادہ چاہتی تھی۔ اور اپنے بیٹے کو بھی اقتدار و اختیار کے مقابلہ میں قربان کرنے کے لئے حاضر تھی۔

نہیں، نہیں ؟ حکومت و جبروت جس کی وہ اس قدر عادی ہو گئی تھی جس قدر انسان سانس لینے کا۔ اُس میں گھر کی ایک لونڈی مداخلت کرے یہ ہماشا، یہ بنی سنوری لونڈی۔ جو سلطان ابراہیم کو اپنی چھوٹی انگلیوں پر نچا رہی تھی۔ جو اپنی نیلی فام آنکھوں کی لمبی نگاہوں سے ملک کے سب سے زیادہ قیمتی مقامات کو دشمن کے ہاتھ میں بے پروایانہ طریقے سے سلطان سے دلوا رہی تھی۔ جو اپنی معمولی سے معمولی خواہش کے لئے نہایت مجنونانہ ذریعوں سے ایک عظیم الشان سلطنت کو برباد کر رہی تھی۔ یہ چرکس لونڈی ! اس بارود خون والی عورت، یعنی کوسم سلطان میں اس دوسری کے مقابلہ میں اس قدر طفلانہ تہوّر تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو قتل کرنے کے لئے حکم دینے سے نہیں جھجکی۔ اس لونڈی کے مقابلہ میں جس نے ایک بڑی

---

۱ حادثہ

کے اندر اس قدر قدرت و اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس کا دل نفرت و حسد سے لبریز تھا۔ یہ لونڈی، اور اس لونڈی کی خواہشیں! یہ دلبر مخلوق جو شہزادیوں سے خدمت لے رہی تھی۔ مگر جو اپنی تمام دلربائی و فسوں گری کے باوجود عقل و ذکا سے کس قدر بے بہرہ و عاری تھی۔

جس طرح شہد کی مکھیوں کا چھتا شہد سے خالی کر دیا جائے تو مکھیاں ایک شدید بھنبھناہٹ کے ساتھ غصے سے وہاں سے روانہ ہوتی ہیں۔ کوسم سلطان کو دور سے ایک ایسی آواز سنائی دی تھی، جو محل سلطانی کے آہستہ آہستہ قریب ہوتی جاتی تھی۔ ہماشاہ جس کا لقب طرحدار لونڈی پڑ گیا تھا، اس آواز کو نہیں سن رہی تھی۔ لیکن کوسم سلطان اس آواز کو سن کر اس سے اور بھی زیادہ نفرت کر رہی تھی۔ یہ چرکس عنصر جو اس کا سراسر ضد تھا۔ یہ ہستیاں جن کا سارا جادو! ان کے گورے شانوں، ان کی ہیکل تمثال گردنوں ان کے ریشمی بالوں میں پنہاں تھا۔ کوسم سلطان ایک ایسی سریع اور تیز ذکاوت و عقل طبعی کی مالک تھی جس پر کوئی حسن یا جذبہ غلبہ نہ پا سکتا تھا اور اس وجہ سے : بنے سلطان ابراہیم کو وہ ناقابلِ عفو خیال کرتی تھی۔ جو ہماشاہ کے نرم گورے بازوؤں اور شانوں کے سامنے ایک ذلیل غلام بن کر رہ گیا تھا۔ کاش تھوڑے وقت کے لئے بھی حکومت اُس کے ہاتھ میں ہو تو یہ جو ہنس کے انداز سے جواہرات سے لدی ہوئی گردن پھرا رہی ہے۔ اسے کس طرح ایک چمڑے کی رسی سے کھنچوائے گی! وہ حسین مرمر کی طرح سفید شانوں پہ لہراتے ہوئے بال جس نے اسے طرحدار لونڈی کا لقب دیا ہے۔ وہ زلف زرتار کیچڑ میں گھسٹوائے گی! غضب خدا کا ملک کی یہ حقیقی ملکہ بادشاہوں کی والدہ ان لہراتے ہوئے زرد بادلوں ان نیلی نشیلی آنکھوں کے حکم سے قریب تھا کہ جلاوطن کر دی جائے۔

وہ شور آہستہ آہستہ محل شاہی کے قریب ہوتا آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں

شائد دس ہزار دلوں سے ضربۂ بغاوت کی دہشت ناک آواز محلسرا کے دریچوں کے نیچے سے بلند ہوئی۔ غیر منتظم قدموں کی آوازیں، ہتھیاروں کی جھنکاریں۔ تہدید آمیز شکایتیں سنائی دے رہی تھیں۔ گویا ایک موج شکایت تھی جو انسانوں کے سمندر سے اُمڈ رہی تھی۔ جس طرح لڑائی کا گھوڑا جسے لڑائی کی تعلیم دی گئی ہو دھادے کے بگل کی آواز کو سن کر اپنی تمام قوتِ اشتیاق کے ساتھ ہنہنا کر جواب دیتا ہے۔ کوسم کا تمام جسم بھی ایک پُرشور ہیجان سے کانپ رہا تھا۔ وہ ان نشانیوں سے واقف تھی۔ ترک قوم کی طغیان وغلیان میں، وہ قوم کے ساتھ شریک ہوگئی۔ وہ ترک قوم جو بردبار صبور ہونے کے باوجود آخر تنگ آکر کبھی کبھی اپنے حق کا مطالبہ کر ہی بیٹھتی ہے۔ کوسم سلطان باوجودیکہ ایک شہری عورت تھی لیکن وہ عقل سے زیادہ حِس فطری سے پہچان جاتی تھی۔ کہ کون سی بغاوت اس کے خلاف ہے۔ اور کون سی شورش اس کے حق میں۔ وہ جو ہر شے سے زیادہ اپنی عظمت کی دل دادہ تھی اس جوشش وغلیان ملی کو اپنی تیز ذکاوت سے اس طرح استعمال کرتی تھی۔ کہ وہ ہمیشہ اُس کے عظمت و اقتدار کے بلند کرنے ہی کو ایک آلہ ہو جاتے تھے۔ چاہے جوشش قومی ہو یا محلسرا کی سازش وہ ہمیشہ اُنھیں اپنے حق میں مفید طریقے سے استعمال کرتی تھی۔

شورش میں زیادتی ہوئی۔ اب محل کے شہ نشینوں میں، دیوان خانوں میں، دالانوں میں بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دبی دبی چیخیں نکلنے لگیں۔ دروازے کھلنے لگے۔ بند ہونے لگے۔ زینوں پر بھاگڑ کی آواز آنے لگی۔ ہر طرف ڈرپوک طریقہ سے سرگوشیاں ہونے لگیں۔ غرضکہ فضا میں ایک پریشانی انگیز انتظار محسوس ہوتا تھا۔ کہ آخرکار ایک بڑے خوفناک دھماکے سے محل شاہی کا بڑا پھاٹک نیچے گرتا ہوا سنائی دیا۔ اس کے بعد دیکھا گیا کہ سیڑھیوں سے انسانوں کا ایک اژدحام جو غصّے سے پاگل ہو رہا تھا، اوپر چڑھ رہا تھا۔

کوسم اپنے کمرے سے تیزی کے ساتھ باہر نکلی اس نے اپنے خواجہ سرا ریحان کو اشارہ کیا اور اسے ساتھ لے کر ایسی عظمت و وقار کے ساتھ جو بادشاہوں کی ماؤں کے شایاں ہے، آگے بڑھی۔ اُس کی طبیعت میں اگر قیامت بھی ہو جاتی تو کوئی گھبراہٹ نہ پیدا ہوتی۔ اُس کے نازک کتابی چہرے اور سر کے اوپر ایک سیاہ لمبی اوڑھنی پڑی تھی۔ اپنے چہرے میں چھپانے، لیکن دوسروں کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ جانے کی کامل قدرت کے ساتھ وہ آگے بڑھی۔ اُس کے شباب سیر فکر نے ایک منٹ میں اپنے خطِ حرکت کو تعین کر لیا۔ وہ جانتی تھی۔ کہ خوفناک سیلابِ ملت کو قوم کے سرکردہ اکابر و اعیان کو وہی روک سکتی ہے۔ اور اس کی ہی عقل و ذکا ایسی ہے کہ اُن کے خطِ حرکت کو جس طرف چاہے موڑ دے۔ وہ آگے بڑھی۔ انسانی چہروں کا یہ سیلابِ عظیم جو ایک دوسرے کو دھکیلتا ہوا حرم کی دہلیز کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کی نظر محتشم کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے رک گیا۔ ان میں سفید ریش سے مزیّن چہرے، بھاری عماموں سے آراستہ سر تھے۔ یہ وہ مستحکم اور قومی آلہ ہائے انقلاب تھے جنھوں نے فاجعہ انگیز قدرت و یک دلی سے اپنے ارادے کو پورے کرنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ مگر اُن کی آتشیں، محترم آنکھیں متردد و محجوب ہو کر زمین پر گڑ گئیں۔ مصلح الدین آغا کا سفید معزز سر جھک گیا۔ اُس کے وفادار مگر جسور چہرے پر ایک سُرخی پھیل گئی۔ مراد آغا بھی جس کی آنکھیں لمبی سیاہ ابروؤں کے نیچے خوفناک چمک سے چمک رہی تھیں، خاموش ہو گیا۔

کوسم سلطان نے ان کو اتنا موقع نہ دیا کہ وہ اپنے خیالات کو مجتمع کر سکیں اور ایک تیز مگر باوقار آواز سے کڑک کر کہا۔ "کیا تم بھول گئے۔ کہ تم اس خاندانِ عالی کے پروردہ احسان ہو؟"

اس فقرے نے وفا شعار مصلح الدین آغا کے دل پر نشتر کا کام کیا اس مستقیم بڈھے نے اپنی شخصی وفاداری کو ملت کی رفاہ و سعادت پر فدا کر دیا تھا۔

مگر وہ اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ اور نم ناک آنکھوں سے اس نے گفتگو شروع کی۔ اولاً اس نے کانپتی ہوئی بڈھی آواز سے یہ کہا کہ اُن کی موجودہ حرکات میں شخصی منفعت کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں "میں خاندانِ شاہی کا نمک پروردہ ہوں اور میرا بال بال احسان سے جکڑا ہوا ہے۔ ایک سُرخ پھٹی عبا سے کر میں آیا تھا۔ اور اب اس مرتبے پر مراحم خسروانہ ہی کے طفیل میں پہنچا۔ کاش کہ میں یہ دن نہ دیکھتا!" یہ کہتے وقت اس کی سفید داڑھی سے رنج و ندامت کے آنسوؤں کے گرم قطرے ڈھلک رہے تھے۔ اپنے حسیات وجذبات کو ندامت کے درجے تک لاکر وہ رُکا۔ اپنے چاروں طرف کے آدمیوں میں جو سکوت طاری تھا۔ اُسے دیکھ کر متاثر ہوا اور اُس کے دل میں محبت وطن وملت پھر جوش زن ہوئی اور پھر اس نے حرارت آمیز طریقے سے گفتگو شروع کی۔ اب اس نے ملک کے اوپر جو کچھ گزر گیا، ایک ایک کر کے گنانا شروع کیا۔ "دشمن سرحد سے گزر کر ملک میں داخل ہوچکا ہے۔ آبنائے میں اعداء کے فوجی جہازوں کا بیڑا پھیلا ہوا ہے" یہ کہتے کہتے اس کی آواز کی نرماہٹ غائب ہوگئی اور ایک بڈھے شیر کی طرح گرجنے لگا "ملک میں بدامنی اور ظلم پھیلا ہوا ہے۔ ناحق گلے کٹ رہے ہیں۔ بے گناہ سزائیں پا رہے ہیں۔ رعایا کو مال وجان کی امنیت نہیں" یہ کہتے کہتے اُس کی آواز میں ایک غمگین، مگر دین دارانہ صمیمیت قلب کی رقّت پیدا ہوئی اور اُس نے کہا "احکام شرع کی پابندی ہونی چاہیئے" والدۂ سلطان اپنی متانت کو قائم رکھے ہوئے تھی۔ کبھی ان کو اب تک کے سکوت پر سرزنش کرتی تھی۔ اور کبھی قطعی دلائل سے انھیں خاموش کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب اس ازدحام میں بے صبری کی علامتیں نمودار ہونے لگیں۔ بھیڑ ایک دوسرے کو دھکیلتی ہوئی آہستہ آہستہ ایک ایک قدم آگے ہوتی جاتی تھی اور اور لوگ بھی باتوں میں دخل دینے لگے تھے۔ کبھی کوئی اکھڑ جاہل ینی چری

کبھی کوئی باوقار مگر پُرجوش عالم۔ شیخ الاسلام عزیز آفندی باری باری سے کوسم سلطان سے مباحثہ کرتے۔ مگر کبھی کسی کے ذہن میں اتنی جرأت کا خیال نہ پیدا ہوتا تھا کہ بارعب و معظم والدۂ سلطان کے آگے سے نکل جائے۔ جاہل و عالم، افسر و سپاہی سب اُس کے سامنے اپنے سینوں پر ادب سے ہاتھ باندھے ہوئے اُس سے عرض حال کرتے تھے۔ اور اپنے حالات و خیالات کے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ جماعت جو انقلاب و اختلال کے لیے نکلی تھی، ان کی حرکات میں ایک وقار تھا جو مغربی ممالک کی انقلاب انگیز جماعتوں کی شدت و ہیجان کے مقابلے میں اُن کو ممیز کرتا تھا۔ آخر کار ایک بے صبر آتشیں عمامہ پوش عالم جو ابھی اپنی جلاوطنی سے واپس آیا تھا حنفی آفندی اس مباحثے میں داخل ہوا۔ اور اس نے اپنی پوری قدرت استدلال اور طلاقتِ لسانی سے اس بغاوت کے حق و عدالت پر مبنی ہونے کو ثابت کرنا شروع کیا۔ دیوان خانوں میں بھگدڑ پڑی ہوئی تھی۔ اور وہ اس بغاوت کے اسباب کو ایک ایک کرکے قطعی اور مکمل فقروں سے جتا رہا تھا۔ اس کی آواز سے محل سرا کی غم آلودہ نیم تاریکی میں عکس صدا پیدا ہو رہا تھا۔

"دشمن نے ہر طرف ہم کو گھیر لیا ہے۔ رشوت، بے ایمانی سے نظامِ سلطنت تباہ و برباد ہو گیا۔ ناقوس اور گھنٹوں کی آوازوں سے مؤذن کی آواز دب گئی۔ عباد اللہ کے مال و جان کی امنیت ضائع ہو گئی۔ خود والدۂ سلطان پر بھی ظلم کیا جا رہا ہے حضور آپ اس ملّت کی والدہ ہیں۔ آپ حقیقی معنوں میں ام المومنین ہیں۔ اسی لئے ہم آپ کے پاس فریاد لے کر آئے ہیں"

اس کے بعد سب نے ایک زبان و یک دہان ہو کر کہنا شروع کیا "شہزادے کو ہمیں دیجئے اور للہ اس قوم کے نجات حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ پیدا کیجئے" کوسم سلطان نے محسوس کیا کہ اس کا ضعیف جسم۔ اُس کے بیٹے اور سلطنت کا یگانہ محافظ ہے۔ کیا، اگر اُن کی خواہش پوری کرے تو یا انہیں لوٹا دے تو

اُس کے بیٹے کے نزدیک اُس کو اپنی پرانی قوّت مِل جائے گی ؟ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ محلسرا کے غم آگین سکون میں ایک خوف آمیز آواز سنائی دی۔ ہما شاہ کی خزینہ دار بزم عالم کہہ رہی تھی " خدا کے لیئے حضرت ملکہ ہما شاہ کو بچائیے "
اُس وقت کو سم سلطان جو اپنے بیٹے کے سقوط و تباہی کے مقابلہ میں ایک سدّ آہنی کھڑی تھی۔ ہٹ گئی اور اُس نے کہا : -

" لو میں جاتی ہوں شہزادے کو باندھ کر لاتی ہوں " اور اس ماں کا جس نے وقتِ ضرورت وسعتِ ملّت کو تخت اوندھا کرنے سے نہ روکا عمیق صمیمی دعاؤں اور تحسین کے نعروں نے دیوان خانے تک تعاقب کیا۔

سیّد سجاد حیدر یلدرم

مُنشی پریم چند

منشی پریم چند آنجہانی چھوٹے چھوٹے قصّے لکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ ان کا اصلی نام دھنپت رائے تھا مگر پریم چند کے نام سے مشہور ہوئے ان کے قصّے بے حد دلچسپ اور سبق خیز ہوتے ہیں۔ منشی صاحب کے قصّے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے قصّے میں آورد کا کہیں نام نہیں ——— آمد ہی آمد ہے۔ زبان بھی نہایت صاف اور شستہ ہے۔ دیہاتی زندگی کی تصویر کھینچنے میں ان کو کمال حاصل ہے۔ ظرافت بھی نہایت سنجیدہ ہے۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ جن میں پریم پچیسی پریم بتیسی وغیرہ چھوٹے چھوٹے قصّوں کے مجموعے مشہور اور بہت خوب ہیں۔ پریم چند اس اصول کو سامنے رکھ کر کہانی لکھتے تھے۔ کہ انسان فطرتاً نیک ہوتا ہے اور انھوں نے اپنے افسانوں میں فطرت انسانی کے حسن کے مرقعے پیش کئے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

قہر خدا کا

شام کو جب دینا ناتھ نے گھر آ کر گوری سے کہا، مجھے ایک دفتر میں پچاس روپلے کی جگہ مل گئی ہے تو گوری کا ایک ایک عضو شگفتہ ہو گیا۔ آنکھیں چمکیں، ہونٹ کھلے چہرہ دمک اٹھا، دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور مضبوط ہو گیا ادھر ایک سال سے ان غریبوں کا بُرا حال تھا۔ نہ کوئی روزی نہ روزگار، گھر میں جو تھوڑے بہت گہنے پاتے تھے وہ کب کے بک چکے تھے، جن دوستوں سے قرض مل سکتا تھا، سب سے لے چکے تھے۔ جن بنیوں سے ادھار چیزیں مل سکتی تھیں۔ ان سے آنکھیں چراتے پھرتے تھے۔ اب یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ کئی مہینہ کا مکان کا کرایہ سر پہ لدا ہوا تھا۔ گوالے نے تقاضا سے تنگ آ کر دودھ بند کر دیا۔ اور بچّہ دن بھر دودھ سے بلکتا رہتا۔ ایک وقت کسی طرح کھانا میسّر ہو جاتا۔ تو اُسے کھینچ تان کر دو تین وقت چلاتے تقاضوں کے مارے دینا ناتھ کا گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ گھر سے نکلے نہیں کہ چاروں طرف سے جھاڑ پڑ جاتی۔ واہ بابوجی واہ، دو دن کا وعدہ کر کے سودا لے گئے، اور آج دو مہینہ سے صورت نہیں دکھائی۔ ایسے دس پانچ گاہک اور مل جائیں۔ تو دیوالہ ہی نکل جائے۔ واہ بھائی صاحب! یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ اپنی ضرورتوں کا تو آپ کو خیال رہے۔ لیکن دوسروں کی ضرورت کی طرف سے آنکھیں بند کر دیں۔ اسی لئے بزرگوں نے کہا ہے دشمن کو چاہے قرض دے دو، مگر دوستوں کو کبھی مت دو۔ قرض دیا اور دوست دشمن ہوا۔ دینا ناتھ کو یہ فقرے تیروں سے زیادہ لگتے تھے۔ اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اس زندگی کا خاتمہ کر دے۔ مگر بے زبان عورت اور بے سمجھ بچّہ کا مُنہ دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ جاتا۔ بارے آج ایشور نے اس پر رحم کیا۔ اور مصیبت کے ایّام کٹ گئے۔

گوری نے خوش ہو کر کہا۔ میں نہ کہتی تھی کہ ایشور سب کی سُدھ لیتا ہے۔ اور

کبھی نہ کبھی ہماری سُدھ بھی لے گا۔ مگر تمہیں یقین نہ آتا تھا اب تو ایشور کی رحیمی کے قائل ہوئے؟

دینا ناتھ نے ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کہا یہ میری دوا دوش کا نتیجہ ہے ایشور نے کیا کیا۔ ایشور کو تو جب مانتا کہ کہیں سے چھپر پھاڑ کر بھیج دیتے۔

ایشور جب دیتا ہے کسی نہ کسی حیلہ سے دیتا ہے سنا نہیں ہے۔ جیسے روزی، بہانے موت!

- جب تک یہ دنیا کا نظام قائم ہے، مجھے ایشور پر وشواش نہیں آنے کا۔

لیکن منہ سے چاہے جو کہے اس میں شک نہیں کہ اس کے دِسر کھڑ میں بھی اعتقاد کے بیج پڑ چکے تھے۔ اور اس میں اکھوے بھی نکل آئے تھے۔

دینا ناتھ کا آقا نہایت کج خلق آدمی تھا۔ اور کام میں بڑا چُست، اس کی عمر پچاس سے زیادہ تھی اور صحت بھی رخصت ہو چکی تھی۔ ساگودانہ کے سوائے اور کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی۔ پھر بھی دفتر میں سب سے زیادہ جفاکش تھا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی ملازم ایک منٹ کی بھی دیر کرے یا ایک منٹ بھی وقت معین سے پہلے چلا جائے۔ خود نہ جانے کب آتا تھا اور نہ جانے کب جاتا تھا۔ عملے والے جب دفتر آتے تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آتا۔ اور جب جاتے، تب بھی وہ اپنی جگہ پر موجود رہتا۔ لوگ اس کے سامنے جاتے ایسا ڈرتے تھے گویا کاٹ کھائے گا۔ دس منٹ تک کلیجہ ضبط کرتے۔ اور فراغت پاتے ہی ایسا بگٹٹ بھاگتے۔ گویا قید سے چھوٹے ہوں، ہلنے کی تو کسی کو مہلت نہ تھی۔ بس اپنی جگہ پر بیٹھے لوگ اس کی نقلیں کیا کرتے۔ نہ جانے اس کے کتنے نئے نئے نام رکھ لئے گئے تھے۔ اس کے حرکات وسکنات کی تضحیک کرنا ہی لوگوں کی دلچسپی کا مشغلہ تھا۔ صرف ایک بجے عملہ کو ۱۵ منٹ کا وقفہ ملتا تھا۔ اس میں جس کا جی چاہے پان کھائے، سگریٹ پیئے یا چائے پیئے۔ اس کے بعد ایک منٹ کا بھی موقع نہ ملتا تھا، قاعدہ کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی۔

اور حالانکہ تنخواہ پہلی تاریخ کو ملتی تھی۔ تعطیلوں میں دفتر بند رہتا۔ اور مقررہ اوقات سے زیادہ ایک منٹ بھی کام نہ لیا جاتا۔ سب کو بونس ملتا تھا۔ اور پراویڈنٹ فنڈ کی بھی سہولت تھی۔ پھر بھی کوئی آدمی خوش نہ تھا۔ کام کی کثرت یا پابندی اوقات کی کسی کو شکایت نہ تھی۔ شکایت تھی صرف مالک کے تھوتھے پن کی۔ کتنا ہی دل لگا کر کام کرو، جان ہی کیوں نہ دے دو۔ شکریہ کا ایک لفظ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی اس شخص کے منہ سے نہ نکلتا۔

مگر اور لوگ چاہے کتنے ہی شاکی ہوں دینا ناتھ کو مالک سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اس فاقہ کشی کے مقابلہ میں اس روکھے پن یا ترش روئی کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ وہ گھرکیاں اور پھٹکار پاکر شاید حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ تضحیک اور تفضیح میں وہ شریک نہ ہوتا۔ احسان سے اس کا ایک ایک رؤاں گرانبار ہو رہا تھا۔ سال بھر میں ہی اپنی کفایت شعاری کی بدولت اُس نے سب قرضے چکا دئے۔ اور کچھ پس انداز بھی کر لیا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو تھوڑے میں خوش رہ سکتے ہیں۔ اگر وقت معین پر ملتا جائے۔ چار روپے روز میں شاید وہ برکت نہ ہوتی جو پچاس روپے ماہوار میں تھی۔ ضروری مصارف کی مدیں قائم ہو گئی تھیں۔ زندگی کی ایک لکیر بن گئی تھی اور اس پر وہ آنکھیں بند کرکے بے کھٹکے چلا جاتا تھا۔ غیر معین آمدنی میں وہ بجٹ کیسے بناتا، کیسے اس کی پابندی کرتا۔ کبھی ایک چیز آتی۔ تو دوسری چیز کم پڑ جاتی دوسری آتی تو تیسری کا رونا ہوتا۔ کمرے میں مستقل روشنی چاہے دھندلی ہی ہو اس بجلی کے لیمپ سے بہتر ہے جو کبھی جلے اور کبھی بجھ جائے۔ کبھی گھی گھنا کبھی مٹھی بھر چنا والی زندگی اُسے مطلق پسند نہ تھی۔ مقررہ خرچ کے علاوہ ایک روپیہ بھی کسی خاص کام کے لئے خرچ کرنا پڑتا تو میاں بیوی میں گھنٹوں بحث و تمحیص ہوتی اور بڑی جھاؤں جھاؤں کے بعد کہیں منظوری ملتی تھی۔ بل گوری کی طرف سے پیش ہوتا تو دینا ناتھ مخالفت کرتا۔ دینا ناتھ کی طرف سے ہوتا تو گوری اس کا بخیہ ادھیڑتی۔ بل کو پاس کرا لینا مجوز کی لیاقت اور وکالت پر منحصر تھا۔ سرٹیفائی کرنے والی کوئی

تیسری طاقت نہ تھی۔

دینا ناتھ اب پکا خدا پرست ہوگیا تھا۔ ایشور کے رحم اور انصاف میں اب اُسے کوئی شک نہ تھا۔ روز سندھیا کرتا اور بلا ناغہ گیتا پڑھتا۔ ایک دن اس کے ایک منکر دوست نے جب ایشور کی مذمت کی تو اُس نے کہا بھائی صاحب اس کا تو آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ایشور ہے یا نہیں۔ منکر ہے یا موحد دونوں کے پاس فولاد کی سی دلیلیں موجود ہیں۔ لیکن میرے خیال میں موحد رہنا منکر رہنے سے کہیں زیادہ مصلحت آمیز ہے۔ اگر ایشور کا وجود ہے تب تو منکروں کو دوزخ کے سوا اور کہیں ٹھکانا نہیں موحد کے دونوں ہاتھوں میں لڈو ہیں۔ ایشور ہے تب تو پوچھنا ہی کیا ہے اس کے لئے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایشور نہیں تب بھی اس کا کیا بگڑتا ہے۔ دو چار منٹ کا وقت ہی تو جاتا ہے۔ منکر دوست اس کی اس دورخی دلیل پر منہ بنا کر چلا گیا۔ ایسوں کے لئے اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دیوالی کا دن تھا گوری نے اب کے ایک ہزار چراغ جلانے کا بندوبست کیا۔ دس سیر تیل لیا اور سارے دن بیٹھی بتیاں بناتی رہی۔ شام کو جب دینا ناتھ دفتر سے آئے اور یہ تیاریاں دیکھیں تو چیں بجبیں ہوکر بولے تمہیں بھی سنک سوار ہوگئی بل پیش کرنے کے پہلے ہی اس پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ اتنا تیل جلانے سے فائدہ؟ آٹھ آنہ کے تیل میں کیا کام نہ چل سکتا تھا؟

گوری مسکراتی ہوئی بولی (اسے کبھی غصہ نہ آتا تھا) کام کیوں نہ چل سکتا تھا۔ پچھلے سال تو دھیلے کا تیل بھی نہیں آیا تب کام نہیں چلا؟

"میں یہ تو نہیں کہتا کہ تیل لیا ہی کیوں، یہی کہتا ہوں کہ اتنا زیادہ تیل کیوں لیا؟ یہ فضول خرچی ہے۔"

"میرا جی آج فضول خرچی ہی پر مائل ہے۔ سوچو ایک دن وہ تھا کہ دیوالی کے دن گھر میں اندھیرا پڑا رہا۔ ایک دن آج ہے کہ ہم ایک ہزار چراغ جلانے کے

لائق ہیں کیا جب بھگوان نے ہنسنے کا موقع دیا ہے تب بھی روئے جائیں یہ کتنی بڑی ناشکری ہے ؟

"اچھا یہ خیال ہے تب ضرور جلاؤ تمہارا بل پاس ہوگیا"

ایک دن دینا ناتھ شام کو دفتر سے چلنے لگے۔ تو سیٹھ جی نے انہیں اپنے کمرہ میں بُلا بھیجا اور بڑی خاطر سے کُرسی پر بٹھا کر بولے۔ تمہیں یہاں کام کرتے کتنے دِن ہوگئے۔ سال بھر تو ہوگیا ہوگا ؟

دینا ناتھ نے ادب سے کہا جی ہاں تیرھواں مہینہ چل رہا ہے۔

"آرام سے بیٹھو، اس وقت گھر جاکر کچھ چائے وائے پیتے ہو"

"جی نہیں۔ میں چائے کا عادی نہیں"

"پان وان تو کھاتے ہی ہوگے۔ جوان آدمی ہوکر اتنا پرہیز"

یہ کہہ کر سیٹھ جی نے گھنٹی بجائی اور اردلی سے پان اور کچھ مٹھائیاں لانے کو کہا۔ حالانکہ دینا ناتھ برابر انکار ہی کرتا رہا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آج یہ غیر معمولی خاطر داری کیوں ہو رہی ہے کہاں تو حضرت سلام ہی اسے نہ لیتے تھے۔ کہاں آج مٹھائیاں اور پان سبھی کچھ منگایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میری خدمات سے خوش ہوگئے ہیں۔ اس خیال سے انہیں اپنے اُوپر کچھ اعتماد پیدا ہُوا۔ اور ایشور کی یاد آگئی۔ پرماتما ضرور حاضر و ناظر ہے۔ ورنہ مجھے کون پُوچھتا۔ دفتر میں میرا عہدہ بھی تو اونچا نہیں"۔

اردلی پان اور مٹھائیاں لایا۔ دینا ناتھ اصرار سے مجبور ہوکر مٹھائیاں کھانے لگا۔

سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تم نے مجھے بہت خشک اور بے مروت پایا ہوگا۔ میرے ملازمین کو مجھ سے یہ عام شکایت ہے مگر میں مجبور ہوں۔ ہمارے یہاں ابھی لوگوں میں اپنی ذمہ داری کا اتنا کم احساس ہے کہ افسر ذرا بھی نرم پڑ جائے تو لوگ اس کی شرافت اور انسانیت سے ناجائز فائدہ اُٹھانے لگتے ہیں۔ انہیں اپنے کام کی اتنی پرواہ نہیں رہتی جتنی اپنے افسر کی خوشامد اور مصاحبت کی، کچھ

ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نوکروں سے میل جول بھی رکھتے ہیں۔ ان سے ہنستے بولتے بھی ہیں۔ ان کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں پھر بھی نوکروں کو ان سے زیادہ بے تکلف ہونے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اور بھی تن دہی سے اپنا کام کرتے ہیں مالک سے انہیں ہمدردی ہو جاتی ہے۔ میں ایسا خوش نصیب نہیں ہوں مجھ میں وہ فن نہیں ہے اس لئے میں اپنے آدمیوں سے کھچے۔ رہنے ہی میں خیریت سمجھتا ہوں۔ اور اب تک اس طرزِ عمل سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن آدمیوں سے علیحدہ رہ کر بھی میں ان کے رنگ ڈھنگ دیکھتا رہتا ہوں اور ان کی فطرت کا امتحان لیا کرتا ہوں۔ میں نے اب تک تمہارے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ تم وفادار اور با اصول آدمی ہو۔ اور میں تمہارے اوپر اعتبار کر سکتا ہوں۔ اس لئے میں تمہیں زیادہ ذمہ داری کا کام دینا چاہتا ہوں جہاں تمہیں خود بہت کم کام کرنا پڑے گا۔ صرف نگرانی کرنی پڑے گی۔ تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ اور اختیارات بڑھ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے اب تک جس تندہی سے تم نے کام کیا ہے آئندہ اس سے بھی زیادہ توجہ اور خلوص سے اپنا کام کرو گے۔

دینا ناتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حلق کی مٹھائی کچھ نمکین ہو گئی۔ جی میں آیا آقا کے قدموں پر سر رکھ دے۔ اور عرض کرے آپ کی خدمت کے لئے میری جان حاضر ہے۔ آپ نے میری جو عزت افزائی کی ہے اور مجھ پر جو اعتبار کیا ہے میں اس کے لائق بننے کی کوشش کروں گا۔ آواز قابو میں نہ تھی۔ جذبات اس پر حاوی ہو گئے تھے۔ صرف احسانمند نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ مگر ان خاموش نظروں نے جتنا اظہار کیا شاید وفاداری اور تشکر کے مرصع الفاظ نے نہ کیا ہوتا۔ تب سیٹھ جی نے ضخیم لیجر نکال کر اس کے اوراق الٹتے ہوئے کہا۔ میں ایک ایسے کام میں تمہاری مدد چاہتا ہوں جس پر اس کاروبار کا سارا مستقبل اٹکا ہوا ہے۔ اتنے آدمیوں میں میں نے تمہیں کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور مجھے

یقین ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گے یہ سال گذشتہ کا لیجر ہے۔ اور اس میں کچھ ایسے اندراجات ہیں جن کے مطابق کمپنی کو کئی لاکھ کا نفع ہوتا ہے لیکن حقیقت حال سے تم واقف ہو ہم کئی مہینہ سے خسارہ اٹھاتے جا رہے ہیں۔ جس کلرک نے یہ لیجر لکھا تھا اس کی تحریر تمہاری تحریر سے بالکل ملتی ہے۔ اگر دونوں تحریریں آمنے سامنے رکھ دی جائیں تو کسی ماہر فن کو بھی ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تم ان اعداد کے مطابق ایک نیا صفحہ لکھو۔ اور اس صفحہ کو لیجر سے نکال کر نیا ورق چسپاں کر دو۔ میں نے صفحہ کا نمبر چھپوا لیا ہے۔ ایک باہر کا دفتری بھی ٹھیک کر لیا ہے۔ جو راتوں رات لیجر کی شیرازہ بندی کر دے گا۔ کسی کو پتہ نہ چلے گا ضرورت صرف یہ ہے کہ تم وہ نیا صفحہ ان اعداد کے مطابق نقل کر دو ۔

دینا ناتھ نے اس تجویز کے خطرہ سے متاثر ہو کر کہا اگر مجھے اعداد کی نقل کرنا ہے۔ تو نیا صفحہ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟

سیٹھ جی اس کی سادگی پر ہنس کر بولے تو کیا تم سمجھتے ہو اس صفحہ کی بجنسہٖ نقل کرنی ہو گی۔ میں کچھ نئے اعداد دوں گا جنہیں تم نشان کردہ رقموں کی جگہ درج کر دو گے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں محض اس دفتر کی بہتری کے خیال سے یہ کارروائی کر رہا ہوں اگر یہ رد و بدل نہ کیا گیا تو اس دفتر کے ایک سو آدمیوں کی روزی خطرہ میں پڑ جائے گی یہاں کچھ پس و پیش کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ ایک سو ملازموں اور کم سے کم پانچ سو مرد و زن کی روٹیوں کا معاملہ ہے تم بہت زود نویس ہو اور تمہارے لئے یہ محض آدھ گھنٹہ کا کام ہے۔

بڑا مشکل مسئلہ تھا یہ ظاہر تھا کہ اسے صریح جعل سازی کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اس کے پاس اس حقیقت کو دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ سیٹھ جی نے جو تجویز پیش کی ہے اس میں ان کی ذاتی غرض شامل ہے یا صرف دفتر کے آدمیوں کی بہتری کا خیال ہے لیکن بہرحال ہے یہ تحریف اور تلبیس تو کیا وہ ذاتی نفع کے لئے اپنے ضمیر کا خون کرے گا۔ نہیں ہرگز نہیں ۔

اس لئے ڈرتے ڈرتے کہا آپ مجھے معاف کریں میں یہ خدمت نہ بجا لا سکوں گا۔ میں اسے اپنے اصول کے خلاف سمجھتا ہوں۔

سیٹھ جی کو مطلق غصہ نہیں آیا۔ اسی سکون آمیز تبسم کے ساتھ بولے کیوں؟

"اس لئے کہ یہ سراسر جعل ہے۔"

"جعل کسے کہتے ہیں؟"

"نقل کو اصل بنا کر دکھانا جعل نہیں تو اور کیا ہے؟"

"لیکن اگر اس تغیر سے سو آدمیوں کی روزی بنی رہے تو اس حالت میں بھی یہ جعل ہے کمپنی کی اصلی حالت کچھ ہے کاغذی حالت کچھ اور ہے۔ اگر تغیر نہ کیا گیا تو فوراً لمبی لاکھ روپے نفع کے دینے پڑ جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کا دیوالہ ہو جائے گا اور یہ سارے آدمی بیکار ہو جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تھوڑے سے مالدار حصہ داروں کے لئے اتنے غریبوں کا خون کیا جائے غریبوں کی بہتری کے لئے اگر کچھ جعل بھی کرنا پڑے تو میں اسے ضمیر کا خون نہیں سمجھتا۔ اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی آدمی کی جان بچتی ہو تو مجھے جھوٹ بولنے میں مطلق تامل نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے اسباب تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں۔ جس کام سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے۔"

دینا ناتھ کو کوئی جواب نہ سوجھا، اگر سیٹھ کا قول صحیح ہے اور اس تحریف سے ایک سو آدمیوں کی روزی قائم رہ سکتی ہے تو اسے جعل کرنا پڑے گا۔ یہ جعل نہیں، ناگوار فرض ہے اگر ضمیر کا خون بھی ہوتا ہے تو اتنے آدمیوں کی بہتری کے لئے اس کا خون بھی کرنا پڑے گا لیکن ضمیر کو سمجھا لینے کے بعد اُسے اپنے مواخذ کا خیال آیا قانون کی نظر میں تو جعل جعل ہے خواہ وہ کسی نیت سے بھی کیا جائے بولا لیکن کہیں یہ راز کھل گیا تو مجھے سزا ہو جائے گی چودہ سال کا کالا پانی رکھا ہوا ہے۔"

سیٹھ جی نے زور سے قہقہہ مارا، اگر راز کھل گیا تو تم نہ پھنسو گے۔ میں پھنسوں گا، تم صاف انکار کر سکتے ہو۔

"تحریر میں کچھ نہ کچھ امتیاز رہے گا۔"

"پتہ ہی کیسے چلے گا کہ کون سا صفحہ بدلا گیا۔ تحریروں میں کچھ امتیاز رہے بھی تو ناقابلِ احساس۔"

دینا ناتھ لاجواب ہو گیا۔ اسی وقت اس صفحے کو نئے اعداد کے مطابق لکھنے لگا۔

ایک مہینہ بعد اس کی ترقی ہو گئی سو روپے ملنے لگے دو سو بونس کے بھی ملے۔

یہ سب کچھ ہؤا۔ گھر میں فارغ البالی کے آثار نظر آنے لگے۔ لیکن دینا ناتھ کا مجرم ضمیر ایک بوجھ سے دبا رہتا تھا۔ جن دلیلوں سے سیٹھ جی نے اس کی زبان بندی کر دی تھی ان دلیلوں سے گوری کی زبان بند کر سکنے کا یقین اسے نہ تھا۔ اب خود اسے ان دلیلوں کا اصلی پہلو نظر آنے لگا تھا۔ اس کی خدا پرستی روحانی تقویت کے بدلے اسے پاگل کرتی رہتی تھی۔ قہرِ الٰہی کا خوف اس کے دل میں سمایا رہتا تھا۔ اس گناہ کی سزا اسے ضرور ملے گی کسی توبہ کسی کفارہ سے وہ اس سزا سے بچ نہیں سکتا۔ ابھی نہ ملے، سال دو سال نہ ملے دس یا پانچ سال نہ ملے۔ لیکن جتنی ہی دیر میں ملے گا۔ اتنی ہی خوفناک ہو گی زرِ اصل سود کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔ وہ اکثر پچھتاتا۔ میں سیٹھ جی کی ترغیب میں کیوں آ گیا، کارخانہ ٹوٹتا یا رہتا میری بلا سے، مجھے تو روحانی خلش نہ ہوتی لیکن اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اور سزا ضرور ملے گی، اس خوف سے اس کا سکونِ قلب، اس کی طبعی بشاشت، اس کی زندہ دلی رخصت ہو گئی وہ اب گنہگار تھا جس کا فردِ جرم جلی حرفوں میں اس کی نظروں کے سامنے لٹکتا تھا۔ وہ ایک پل بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر سکتا تھا۔

ملیریا پھیلا ہؤا تھا بچے کو بخار آنے لگا دینا ناتھ کی جان ناخن میں سما

گئی کہاں جائے کیا کرے جیسے عقل سلب ہو گئی ہو۔ گوری نے کہا جاکر کوئی دوا لاؤ یا کبھی ڈاکٹر کو دکھادو۔ تین دن تو ہو گئے۔ دینا ناتھ نے تشویشناک انداز سے جواب دیا۔ ہاں جاتا ہوں لیکن مجھے بڑا اندیشہ ہو رہا ہے 'اندیشہ کی کون بات ہے بے بات کی بات منہ سے نکالتے ہو۔ آج کل کسے بخار نہیں آتا"

"ایشور اتنا بے رحم کیوں ہے؟"

"ایشور بے رحم ہے گنا ہگاروں کے لئے ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"کیا ایشور گنا ہگاروں کو کبھی معاف نہیں کرتا؟"

"گنا ہگاروں کو سزا نہ ملے تو دنیا میں کوئی زندہ نہ رہنے پائے؟"

"لیکن آدمی ایسے کام بھی تو کرتا ہے جو ایک خیال سے گناہ ہو سکتے ہیں دوسرے خیال سے عین ثواب"

"میں نہیں سمجھی!"

"مان لو میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہو تو وہ گناہ ہے"

"میں سمجھتی ہوں ایسا جھوٹ ثواب ہے"

دینا ناتھ کو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلا لایا۔ علاج شروع کیا ایک ہفتہ میں بچہ بھلا چنگا ہو گیا۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ خود بیمار پڑا۔ اب کے ضرور اس پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے اور وہ جانبر نہیں ہو سکتا۔ معمولی فصلی بخار تھا۔ لیکن دینا ناتھ کے خوف سزا نے اسے سرسام کی صورت دے دی۔ بخار میں حالت نشہ کی طرح یونہی واہمہ بہت بلند پرواز ہو جایا کرتا ہے۔ پہلے جو محض ایک وہم تھا وہ متشکل حقیقت بن بیٹھا۔ تخیل نے موت کے فرشتے بنا کر کھڑے کر دئے۔ ان کے بھالے اور کوہ نما گرز بنا ڈالے۔ دوزخ کے اگن کنڈ دہکا دئے ڈاکٹر کی ایک گھونٹ ایک ایک ہزار من کے گرز کی چوٹ اور آگ کے اُبلتے ہوئے سمندر کی جلن پر دوا کیا اثر کرتی دینا ناتھ وہم پرست نہ تھا۔ پرانوں کے دُور از قیاس قصوں پر اسے مطلق ایمان نہ تھا نہ ہی وہ معقولات

کا دلدادہ تھا اور خدا پر بھی اسے اسی وقت یقین آیا جب اس کی عقل نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا لیکن ایشور آیا تو اس کے ساتھ رحم بھی آیا قہر بھی آیا، مانا رحم کی بدولت اسے روزی ملی۔ خدا کا رحم نہ ہوتا تو شاید وہ بھوکوں مر جاتا۔ لیکن رحم کی صورت کتنی کمزور اور حقیر ہے۔ قہر کی صورت کتنی ہیبت ناک، بھوکوں مرجانا اگن کنڈ میں دھکیل دئے جانے کی نسبت کتنا آسان ہے، بالکل کھیل ہے سزا کا تخئیل بزرگوں سے متوارث ہوتے ہوتے اتنا راسخ ہو گیا تھا گویا اس کی روح اور عقل کا ایک جزو ہو گیا ہو اس کا استدلال اس کے نقش ہوئے تاثرات پر سمندر کی اونچی لہروں کی طرح آتا تھا اور انہیں ایک لمحہ کے لئے غرقاب کر کے پھر لوٹ جاتا تھا اور وہ پہاڑ جوں کا توں کھڑا رہ جاتا تھا۔

زندگی باقی تھی بچ گیا۔ طاقت آتے ہی دفتر جانے لگا۔

ایک دن گوری بولی جب تم بیمار تھے تو ایک دن تمہاری حالت بہت نازک ہو گئی تھی اور میں نے گھبرا کر بھگوان کی منوتی کی تھی کہ اگر یہ اچھے ہو جائیں گے تو تو پچاس برہمنوں کو بھوجن کراؤں گی۔ دوسرے دن ہی سے تمہاری حالت سنبھلنے لگی۔ ایشور نے میری عرض سُن لی۔ آج بازار سے سامان لا دو تو وہ منتا پوری کر دوں، پچاس براہمنوں کو نیوتہ دو گے تو سو ضرور ہی آئیں گے۔ پچاس کنگلے بھی سمجھ لو اور دوستوں میں بھی پچیس نکل ہی آئیں گے۔ دو سو آدمیوں کا تخمینہ ہے میں جنس کی مقدار لکھے دیتی ہوں۔

دینا ناتھ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا تو تمہارا خیال ہے کہ میں ایشور کے رحم سے اچھا ہو گیا۔

"اور کیسے اچھے ہوئے"

"اچھا ہوا اس لئے کہ زندگی باقی تھی۔"

"ایسی باتیں نہ کرو منتا پوری کرنی ہوگی۔"

"ہرگز نہیں میں بھگوان کو رحیم نہیں سمجھتا۔"

"اور کیا بھگوان بے رحم اور ظالم ہے؟"

"اس سے زیادہ بے رحم اور سنگدل ہستی دنیا میں نہ ہوگی جو اپنے بنائے ہوئے کھلونوں کو ان کی غلطیوں اور حماقتوں کی سزا یہ دے کہ انہیں دوزخ کے اگن کنڈ میں میں دھکیل دے۔ وہ بھگوان رحیم نہیں ہو سکتا۔ ایسے بھگوان کے تخیل سے ہی میری روح کو لرزہ آتا ہے۔ محبت دنیا کی سب سے بڑی طاقت کہی گئی ہے عقلمندوں نے محبت ہی کو زندگی کی اور دنیا کی عبادت قرار دیا ہے، برتاؤ وات میں نہ سہی تخیل میں سہی، محبت ہی ہماری زندگی کی حقیقت ہے۔ مگر تمہارا ایشور اپنے قہر اور عذاب کے خوف سے دنیا پر حکومت کرتا ہے پھر اس میں اور معمولی انسان میں کیا فرق ہوا۔ ایسے ایشور کی عبادت میں نہیں کرنا چاہتا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ موٹے ہیں ان کے لئے ایشور رحیم ہوگا کیونکہ وہ دنیا کو اس کی رحیمی کی بدولت لوٹتے ہیں ہم جیسوں کو تو ایشور کی دیا کہیں نظر نہیں آتی۔ وہاں اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھورا کرتا ہے یہ مت کرو نہیں ایشور سزا دے گا۔ وہ مت کرو نہیں دوزخ میں جاؤ گے ایسے ایشور سے کم از کم مجھے عقیدت نہیں ہو سکتی۔ محبت سے حکومت کرنا انسانیت ہے۔ خوف سے حکومت کرنا بربریت ہے ایسے قہار اور جبار خدا سے تو خدا کا نہ رہنا کہیں اچھا ہے۔ ایسے قہار اور جبار خدا سے تو خدا کا نہ رہنا کہیں اچھا ہے۔ اسے دل سے نکال کر میں اس کے رحم اور اس کے قہر دونوں ہی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ ایک کلمۂ محبت برسوں کے پریم کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ میں تمہارے اوپر برابر جان دیتا رہتا ہوں لیکن کسی دن ایک طعنہ دیدوں تو میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کرو گی۔ ایسی پرعذاب پرخوف زندگی کے لئے میں کسی ایشور کا احسان نہیں لینا چاہتا اگر تم نے براہمنوں کے بھوج پر زور دیا تو میں زہر کھا لوں گا۔"

گوری اس کے چہرہ کی طرف خوف زدہ نظروں سے تکتی رہ گئی۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

مولوی عبدالحق صاحب ہاپڑ ضلع میرٹھ کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ کالج میں تعلیم پائی اور ایک مدت تک ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں کام کرتے رہے۔ وہاں سے فارغ ہوئے۔ تو اُردو زبان کی توسیع و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا کر انجمن ترقی اُردو کی بنا ڈالی۔

قیام پاکستان سے پہلے آپ نے ہندوستان بھر میں اُردو کی خدمت میں نمایاں حصہ لیا۔ اس انجمن کی طرف سے بے شمار علمی و ادبی کتب چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے۔ آج کل آپ کراچی میں مقیم ہیں۔ اور بکمال جذب و انہماک سے خدمت زبان میں مصروف ہیں۔ قوم نے ان خدمات پر آپ کو بابائے اُردو کا خطاب دے رکھا ہے۔ کراچی میں اُردو کالج کے بانی آپ ہی ہیں۔

مولوی صاحب موصوف اردو زبان کے بہت بڑے محقق ہیں زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ طرز تحریر سادہ ہے۔ فارسی اضافتوں کا استعمال بہت کم کرتے ہیں۔ مولانا بلند پایہ نقاد بھی ہیں۔

اُردو زبان

پاکستان اور ہندوستان میں یوں تو متعدد مقامی زبانیں ملیں گی۔ مثلاً پنجاب میں پنجابی۔ سرحدی صوبے میں پشتو۔ سندھ میں سندھی۔ بنگال میں بنگالی مہاراشٹر میں مرہٹی۔ مدراس میں تامل اور تلنگی اور ملیبار میں ملیالم۔ غرض ہر صوبے اور ہر علاقے کی اپنی اپنی الگ بولی ہے۔ لیکن اردو ایسی زبان ہے جو پشاور سے لے کر راس کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے:

دنیا کی دوسری زبانیں سنسکرت، عربی، فارسی، لاطینی بہت پرانی ہیں اور ہزاروں سال ہوئے لوگ ان میں کتابیں لکھتے تھے۔ اُردو زبان عمر میں ان سب سے چھوٹی ہے۔ لیکن جو لطف اس میں ہے وہ عجیب ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کئی اچھی اچھی بولیاں اس میں آکر مل گئی ہیں ۔

ہے زبان ایک، بے شمار مزے
اس کی ہر بات میں ہزار مزے

اُردو زبان کی کہانی یہ ہے کہ جب آریہ وسط ایشیا کے میدانوں سے اُتر کر پنجاب کی راہ سے ہندوستان میں آئے تو انہوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کو جنوبی ہندوستان کی طرف دھکیل دیا اور آپ پنجاب میں اور گنگا کے کنارے آباد ہو گئے۔ اس زمانے میں ان آریہ ہندوؤں کی زبان سنسکرت تھی لیکن کچھ تو ان لوگوں کے بڑھنے پھیلنے اور کچھ آب و ہوا کے اثر سے سنسکرت بگڑ بگڑ کر کچھ کی کچھ ہو گئی، اس غلط سلط بولی کا نام "پراکرت" رکھا گیا۔ ڈیڑھ ہزار سال تک لوگ پراکرت بولتے رہے۔ لیکن جب راجہ بکرماجیت گدی پر بیٹھا۔ تو اس نے سنسکرت کو جو دیوتاؤں کی زبان سمجھی جاتی تھی پھر زندہ کرنا چاہا۔ راجہ کی مرضی

پاکر بڑے بڑے پنڈت سنسکرت میں کتابیں لکھنے لگے اور سنسکرت پھر ہندوستان کی علمی زبان بن گئی ÷

لیکن دربار کے امیر و وزیر اور پڑھے لکھے آدمی تو سنسکرت بولنے لگے۔ مگر عوام اب بھی پراکرت ہی بولتے رہے۔ آخر بدلتے بدلتے پراکرت برج بھاشا میں تبدیل ہوگئی۔ چنانچہ مسلمانوں کے ہندوستان میں داخل ہونے سے پہلے سارے شمالی ہند میں برج بھاشا بولی جاتی تھی۔ برج بھاشا کے دوہے اس وقت بھی لوگوں کو یاد ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ برج بھاشا نہایت شیریں زبان تھی÷

اس اثنا میں مسلمان ہندوستان میں قدم جمانے لگے۔ پہلے پٹھانوں اور پھر مغلوں کی بادشاہت ہوئی، ان لوگوں کی زبان فارسی تھی اور فارسی میں بہت سے عربی اور ترکی کے الفاظ ملے ہوئے تھے۔ جس طرح آجکل انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ اُردو سے بغل گیر ہو رہے ہیں۔ اسی طرح فارسی اور ترکی کے بے شمار الفاظ برج بھاشا میں ملنے لگے۔ مغلوں کے عہد میں یورپ کی بعض قومیں ہندوستان میں آئیں۔ اس لئے کچھ پرتگالی اور کچھ فرانسیسی الفاظ بھی برج بھاشا میں آ گئے۔ اسی طرح ہوتے ہوتے شاہجہان کے زمانے میں برج بھاشا کی صورت ایسی بدل گئی کہ اس کا پہچاننا مشکل تھا۔

اس زبان کو ہندو مسلمان سمجھ سکتے تھے۔ کیونکہ اس میں ہندی بھاشا اور فارسی کے الفاظ ملے ہوئے تھے۔ چونکہ مغلوں کے لشکروں میں ہندو، مسلمان سب ہی نوکر تھے۔ اس لئے یہ زبان چھاؤنیوں میں پھیل گئی۔ سب سپاہی ایک دوسرے کا مطلب اسی بولی کی مدد سے سمجھ لیتے تھے۔ اس طرح پر اس بولی کا نام اُردو پڑ گیا۔ ترکی زبان میں اُردو لشکر کو کہتے ہیں۔ گویا اُردو لشکری بولی تھی ÷

اُس دن سے اُردو زبان ایسی پھلی اور پھولی کہ تمام ہندوستان کو اپنا بنا لیا۔ اور اب تو یہ حال ہے کہ بڑی بڑی زبانوں کا مقابلہ کر رہی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر اور اس میں کتابیں لکھ کر اور شعر کہہ کہہ کر اس کا درجہ

بہت بلند کر دیا ہے۔ اب چاروں طرف اس کی دھوم مچی ہوئی ہے ٭

زمانے کا انقلاب اسی کا نام ہے کہ وہ بولی جو لشکر میں اجڈ اور گنوار بولا کرتے تھے اور جس کو سن کر پڑھے لکھے انسان ہنسا کرتے تھے۔ آج اس کی وہ عزت ہے کہ جو اسے نہ سیکھے وہ لکھا پڑھا ہی نہیں سمجھا جاتا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر قوم کی عزت اُس کی زبان سے ہوتی ہے۔ مثلاً انگریزی کو لو! اگر اس میں علمی کتابوں کا اس قدر وسیع ذخیرہ نہ ہوتا تو کون جانتا کہ انگریز قوم اس قدر شائستہ اور بلند پایہ ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے اُردو میں دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں اور وہ مصنف جنہوں نے بے بدل ناول اور روح افزا نظمیں لکھی ہیں، واقعی اُردو زبان کے محسن ہیں ٭

خلاصہ یہ ہے کہ اُردو پراکرت کی بیوی ہے۔ برج بھاشا اور فارسی کے میل جول سے بنی ہے۔ اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں۔ وہ کثرتِ استعمال سے گھِس گھِس کر نرم، ملائم اور آسان ہو گئے ہیں اور ان کی کرختگی جاتی رہی ہے۔ سونا وہی ہے۔ مگر کٹھالی میں ڈھل کر کندن بن گیا ہے۔ تلفظ اور لہجے کی دقت زائل ہو گئی ہے۔ ان الفاظ کا بولنا اب آسان ہو گیا ہے۔ اُردو زبان اس لئے پسند عام ہے کہ ہندی اور فارسی کی آمیزش نے اس میں ایک خاص دلچسپی اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ہندی الفاظ کی بدولت یہ دل نشین ہے اور فارسی الفاظ کے بل بوتے پر یہ پرشکوہ ہے۔ قدیم زبانوں میں یہ بڑی دقت تھی۔ کہ ایک ہی لفظ کو ذرا ذرا سے فرق اور پھیر سے مختلف صورتوں میں لے آتے تھے۔ لیکن اُردو زبان میں دوسرے الفاظ کی مدد اور شمولیت سے یہ دقت جاتی رہی ہے۔ اور مرکب صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ کے طرح طرح کے خوش نما رنگوں کی پچکاری نے ہندی عمارت کی دیواروں کو جگمگا دیا ہے۔ ان الفاظ کے ملاپ سے نہ صرف لغت میں اضافہ ہوا ہے۔ بلکہ خیالات میں بھی وسعت پیدا ہو گئی ہے ٭

گزشتہ صفحات میں ہم نے دیکھا کہ اُردو اس زمانے کی یادگار ہے۔ جب مسلمان فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے۔ اور اہلِ ہند سے اُن کا میل جول روز بروز بڑھتا گیا اسی وقت سے ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہوتا چلا گیا جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی جس کا ان میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا۔ مسلمان فارسی بولتے آئے تھے اور ایک مدت تک اُن کی زبان فارسی ہی رہی۔ دربار و دفاتر میں بھی اسی کا سکّہ جاری تھا۔ ہندوؤں نے بھی اسے شوق سے سیکھا۔ اُس زمانے میں فارسی لکھنا پڑھنا تہذیب میں داخل تھا۔ فارسی کے علاوہ عربی مسلمانوں کی مذہبی اور علمی زبان تھی۔ دستارِ فضیلت کا ملنا بغیر تحصیل زبان عربی ناممکن تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے علوم و فنون کا خزانہ اسی زبان میں مدفون ہے۔ ادھر ملک میں جو زبان (قدیم ہندی یا پراکرت) رائج تھی، اُسے بھی مسلمانوں نے سیکھا۔ عوام وہی زبان بولتے تھے، چنانچہ اس مخلوط زبان میں بڑے بڑے شاعر ہوئے۔ مسلمان شاہی درباریوں اور علماء اور شعراء نے بھی یہ زبان سیکھی اور اس میں تالیف و تصنیف بھی کی (جو زیادہ تر نظم تھی) کی۔ غرض ہندوستانیوں کے میل جول اور رغلا ملا سے ایک نئی زبان نے جنم لیا۔ جس کا نام بعد میں اُردو رکھا گیا۔

اُردو کے معنی لشکر کے ہیں اور لشکری زبان جیسی ہوتی ہے ظاہر ہے۔ یعنی آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ اس لئے اوّل اوّل ثقہ لوگ اس کے استعمال سے بچتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اس کے قدم جمتے گئے اور مغلیہ سلطنت کے آخری دَور میں شعراء نے اس بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اور پال پوس بڑا کیا۔ بہت کچھ صفائی پیدا کی اور نئی تراش خراش سے آراستہ کیا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر کے راستے ایک نئی قوم ہندوستان پر مسلط ہوئی جو ہندو مسلمانوں سے بالکل غیر تھی۔ اس قوم نے اُس کی انگلی پکڑی۔ اُس نے انگلی پکڑتے پہنچا پکڑا۔ اور دربار سرکار میں اس کی رسائی ہوگئی اور رفتہ رفتہ دفاتر سے فارسی سے نکال باہر کیا۔ اور خود اس کی کرسی پر جلوہ گر ہوئی۔ آخر

ہندوستان کی قدیم راجدھانی اس کا بعمِ بجوم اور دو آبہ اس کا وطن ہؤ - اب دُور دُور پھیل چلی ہے - اور ہندوستان کے اس سرے سے اُس سرے تک چلے جائیے، ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے - بلکہ ہندوستان کے باہر تک جا پہنچی ہے - سب سے بڑھی چڑھی بات یہ ہے کہ یہ تین مختلف جلیل القدر قوموں کی یعنی ہندو مسلمانوں اور انگریزوں کی چہیتی ہے، اور ان تینوں کی متفقہ کوششوں کی عظیم الشان یادگار ہے - تینوں نے اسے سیکھا، پڑھا، لکھا، تینوں نے اس کی ترقی میں مقدور بھر کوشش کی، اور اب تینوں کی بدولت اس رُتبے کو پہنچی کہ دنیا کی جدید زبانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہوئی -

اُردو ہندی نژاد ہے - اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت ہے - برج بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہے - اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں، وہ زمانۂ دراز کے استعمال اور زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدا پن کرختگی اور تلفظ اور لہجہ کی دقت تھی، بالکل جاتی رہی - اور چھٹ چھٹا کر پاک صاف، سیدھے سادے رہ گئے - جس سے زبان میں لوچ گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی -

اُردو کے ہندی نژاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں - کیونکہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسما و صفات میں ہوا ہے - ورنہ زبان کی بنیاد ہندی پر ہے - تمام حروف فاعلی مفعولی، اضافت، نسبت، ربط وغیرہ ہندی ہیں - ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں - لیکن عربی، فارسی الفاظ کے اضافے نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خوبی میں اضافہ کر دیا ہے - ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہے - اور عربی فارسی الفاظ میں شان و شوکت، اُردو زبان کے لئے ان دونوں عنصروں کا ہونا ضروری ہے، عربی، فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت میں بلکہ خیالات میں بھی وسعت پیدا کر دی ہے - جس سے اُس کا حُسن دوبالا

ہوگیا۔ اب یہ دائرہ زیادہ وسیع اور کلیہ تیار ہو گئی مگر اصل بنیاد جس پر وہ قائم ہے
ہندی ہی ہے۔ محض غیر زبانوں کے اسماء و صفات کے اضافے سے اس کے
ہندی ہونے میں مطلق فرق نہیں آسکتا۔ مثلاً آج کل بہت سے انگریزی الفاظ
داخل ہوتے جاتے ہیں لیکن اس سے زبان کی اصلیت اور ماہیت پر کچھ
اثر نہیں پڑ سکتا۔

دنیا کی مہذب و ترقی یافتہ اور زندہ زبانوں میں یہ ہے کہ وہ اس اصول پر قائم ہیں جو تمام
جدید زبانوں میں اس وقت پایا جاتا ہے یعنی صورت ترکیبی بجائے تفصیلی
کی طرف اس کا رجحان ہے۔ قدیم زبانوں میں یہ بڑی دقت تھی کہ ایک ہی لفظ
کو تھوڑا سا فرق اور تصرف سے مختلف صورتوں میں لے آتے تھے۔ اب
دوسرے الفاظ کی مدد سے مرکب صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور وہ قیود نکالی
یہی حال اردو کو بھی اس قید سے آزادی مل گئی ہے۔ غرض یہ زبان مختلف
حیثیتوں سے ایسی مقبول صورت ہو گئی ہے کہ اس کی ترقی میں شبہ نہیں ہو سکتا
اس کی صفائی، فصاحت، سلاست اور شیرینی، فارسی، عربی اور انگریزی
کے مختلف مفید اثرات اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ وہ دنیا کی بہترین زبانوں
میں سے ہے۔ اور ایشیا میں ایک روز اس کا ستارہ چمکے گا۔

مولوی عبدالحق

سودیشی ریل

شوکت تھانوی

شوکت تھانوی اردو کے مشہور مزاح نگار ادیب اور سنجیدہ ظرافت میں صاحب طرز انشاء پرداز ہیں۔ آپ کے مضامین اکثر رسالوں میں چھپتے اور ریڈیو پر نشر ہوتے رہتے ہیں۔ "سیلاب تبسم" اور "بحر تبسم" وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ شوکت تھانوی کی شہرت کا آغاز ان کے مشہور مزاحیہ مضمون "سودیشی ریل" سے ہوا۔ جس میں مزاحیہ انداز میں دیسی لوگوں کے بے اصولی پن اور بدنظمی پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ شوکت کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ وہ مزاحیہ انداز میں سوسائٹی پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو ہنسا کر ان کے عیوب سے خبردار کرتے ہیں۔

فیصلہ کُن قدم

مجھے ناز ہے کہ مَیں شراب نہیں پیتا۔
انہیں شکوہ ہے کہ میں چاء بہت پیتا ہوں۔
مجھے اللہ تعالے نے گھوڑ دوڑ سے بچایا ہے۔
وہ کہتی ہیں کہ تم برج کھیلتے ہو۔
خدا کا شکر ہے کہ میں چرس وغیرہ کا عادی نہیں۔
وہ قسمت کو روتی ہیں کہ میں سگریٹ بہت پیتا ہوں۔

مختصر یہ کہ وہ چاہتی ہیں کہ میں فرشتہ بن جاؤں اور میں اسی کو بہت سمجھتا ہوں کہ فرشتوں کا استاد ہونے سے اب تک بچا ہوا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی بے شمار باتیں ایسی ہیں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ وہ مجھ کو داد دیں۔ مگر اس قسم کی چھوٹی چھوٹی بے شمار باتیں ایسی ہیں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ان کے ماں باپ نے قسمت ہی اِن کی پھوڑ دی۔ اللہ جانے یہ میری کمزوری ہے یا اُن کی۔ بہر حال اسی کشمکش اور اسی صدمہ خدا نے ہم دونوں کا اطمینان چھین رکھا ہے۔ گھریلو فضائیں ہر وقت پانی پت کا میدان بنی رہتی ہیں۔ اگر اس چشمک میں وہ کیفیت ہو جس کو "چھیڑ خوباں سے چلی جائے" کہتے ہیں تو پھر شکایت ہی کس بات کی گھر جنت ہی نہ بن جائے۔ مگر لطیفہ تو یہ ہے کہ خوباں کی تعریف میں نہ وہ آتی ہیں نہ یہ خاکسار۔ ہاں ایک در پردہ شکایت ہم دونوں کو آپس میں یہ بھی ہے کہ وہ ہم کو اور ہم اُن کو "خوباں" اور "خوبانی" کیوں نہیں سمجھتے۔ مجھ کو تو خیر آئینہ کے سامنے جا کر اطمینان ہو جاتا ہے کہ مَیں خوباں کیوں نہیں سمجھا جاتا۔ مگر ان کو اب کون سمجھائے .... کہ اپنے کو خوباں بنانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ

ہر وقت ؎

محبوبی تمنّی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

بنا ہوا کوئی بیٹھا رہے حسن برہم بھی ایک چیز ہے اور بڑی چیز ہے مگر خالص حسن برہم ہو اور شگفتگی ایک سرے سے باقی ہی نہ رہے تو محبوب اور ملک الموت میں امتیاز دشوار ہو جاتا ہے۔ دلنوازی کے لئے کچھ کھٹ مٹھی ادائیں درکار رہتی ہیں۔ ہر دقت کی شگفتگی اگر طالب کو بے فکر بنا دیتی ہے تو ہر وقت کی برہمی سے بھی وہ بے زار ہو کر کہنے لگتا ہے کہ ؎

محبت میں پہلے پہ ستمگاریاں تھیں

محبت میں اب اور بیزاریاں ہیں

ہزار سمجھایا۔ دوسروں کی مثالیں دیں۔ تاریخ میں سے نور جہان اور جہانگیر کی قسم کے سینکڑوں حوالے دیئے۔ ان کے اشاروں پر اس حد تک چلے کہ

؎ ۔ کیا جو مرنے کو مر گئے ہم کیا جو جینے کو جی اٹھے ہم

مگر پھر جو دیکھا تو پیشانی پر وہی شکنیں۔ لب پر وہی سرد آہیں۔ جلا ہوا سا رُخ روشن۔ آنکھوں میں بیزاری۔ کھنچے کھنچے سے انداز۔ بھرّائی ہوئی آواز۔ ہر بات میں چڑ چڑا پن۔ اب بتلایئے کہ سمجھوتہ ہو تو خاک اور نہ ہو تو یہ زندگی ایک جیتی جاگتی موت ہے یا کچھ اور۔

راتوں کو جاگ جاگ کر غور کیا۔ تنہائیوں میں یکسوئی پیدا کر کے سوچتے رہے۔ سنا تھا کہ صبح کا وقت غور و فکر کے لئے نہایت مناسب ہوتا ہے۔ گھڑی میں الارم لگا کر لیٹے اور طلوع آفتاب سے قبل اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوئے مگر ایسی کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آسکی کہ یہ گھریلو کشمکش دور ہو سکے۔ جب انسان ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ جھنجلا کر کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاتا ہے اس قدم کے اٹھانے سے اب تک برابر کتراتے رہے تھے مگر آخر کب تک؟ آخر ایک دن دل کو ذرا مضبوط بنا کر یہ طے ہی کر لیا کہ روز کی جھک جھک سے یہی

اچھا ہے کہ ایک دن ذرا جان پر کھیل کر صاف صاف بات ہی کیوں نہ کر لیں۔ مگر اس سے قبل کہ ایک دم سوچے سمجھے بغیر منسٹر کے پاس پہنچ جائیں۔ دانشمندی یہی تھی۔ کہ پہلے وہ سوالنامہ تیار کر لیں جو پیش کرنا ہے اور متوقع سوالوں کے جوابات کے لئے بھی تیار ہو کر جائیں تاکہ عین وقت پر کوئی صورت ایسی پیش نہ آ جائے کہ جا تو رہے ہیں۔ وہاں پر کی بتوں کی رٹ لے اور پچھتانا پڑ جائیں لفظیں۔ دل ہی دل میں دل ہلا دینے والے الفاظ کی ایک تقریر تیار کی جس میں ولولہ بھی تھا جوش بھی۔ تاثیر بھی اور شوہر المنزعب بھی۔ اس تقریر کا دو معمولی اور ایک نور لیس رہرسل کیا کہ کس لفظ پر مٹھیاں بھینچنا ہیں اور کس جملہ پہ میز پر گھونسے مارنا ہیں۔ کس فقرے میں طنز کی ملفنک رکھنا ہے اور کن الفاظ کا کیا اتار ہونا چاہیئے اور کیا چڑھاؤ۔ جب ہر طرح تیار ہو گئے تو ایک مرتبہ پھر دل نے کہا کہ بھئی پھر غور کر لو۔ یہ طوفان اٹھانا مناسب بھی ہے یا نہیں اور آخر ٹھیک ہی پایا نہ اب تو جو کچھ ہو آج فیصلہ کر کے رہیں گے۔ ایک جوش کے ساتھ اٹھے۔ قدم بڑھایا ہی تھا کہ دل کی حرکت کچھ تیز ہو گئی اور فطرت جو صلح جو تھی نے سمجھانا شروع کیا۔ کہ ہٹاؤ بھی۔ عافیت اسی میں ہے کہ غم کھاؤ اور ٹال جاؤ۔ مگر ٹھیک اسی وقت یاد آ گیا کہ مرد کا عزم اور دل نے یاد دہانی کی تو ہمت کی۔ یہ صلح جوئی نہیں یہ رواداری نہیں، یہ رفع شر نہیں۔ یہ امن پسندی نہیں بلکہ خالص بزدلی ہے آباؤ اجداد کی جرأت کے کارنامے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ وہ آباؤ اجداد جو شیروں کے جبڑے چیر ڈالتے تھے۔ توپ کے منہ میں دراز گھس جاتے تھے بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ اسی قسم کے گھوڑے پر ایک دم سوار ہو گئے اور بپھرے ہوئے وہاں جا پہنچے۔ جہاں وہ منسٹر تھے اور چھپا لیا ہے اپنا غم غلط کر رہی تھیں۔

پہنچتے ہی عرض کیا۔ "مجھ کو آپ سے کچھ کہنا ہے"

انہی سنجیدہ پیشانیوں نے تڑپتے تڑپتے انداز سے فرمایا "فرمائیے"

بہرحال کچھ اور کیا تھا مگر کہتا تھا کچھ۔ اور بہرحال شکر ہے کہ الفاظ خود بھاری بھرکم تھے۔ "مجھ کو پوچھنا ہے یعنی میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آخر اس کے معنی کیا ہیں؟"

سر وہ اطمینان سے رکھ کر بولیں "کس کے معنی کیا ہیں؟"

اور اب مجھ کو احساس ہوا کہ بات غلط طریقہ پر شروع ہوئی ہے۔ بہرحال بات تو سنبھالنا ہی تھا "معنی اسی کے۔ اس کے معنی کہ آخر یہ سب کیا ہے۔ یہ کیوں ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ جو آپ نے اپنا انداز بنا رکھا ہے۔" ایک دم یاد آیا کہ مجھ کو بہرحال قریب بیٹھنا چاہئے مگر میز پر گھونسا بھی تو مارنا ہے۔ صرف فضا میں گھونسا لہرا کر رہ گیا۔ لہٰذا یہ ارادہ بھی ملتوی کرنا پڑا۔ اور اگر اس وقت یہ قائم نہ ہو سکا تو رہی سہی وقعت بھی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائے گی۔ لہٰذا بلا جھجک اس کرسی پر بیٹھ گیا جو میز کے قریب تھی اور سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "یہ اندازہ یہی انداز جو آپ نے اپنا بنا رکھا ہے۔"

وہ بہت حیرت سے بولیں "کیا بنا رکھا ہے میں نے انداز۔ مجھے معلوم تو ہو۔"

مجھ کو معلوم تھا کہ یہ سوال وہ ضرور کریں گی اور سب سے زیادہ مدلل جواب اس کا میرے پاس تیار تھا۔ جس کے ہر نقرہ میں میز پر گھونسے مارنے کی گنجائشیں موجود تھیں۔ لہٰذا میں نے کہا "میرے لئے تحقیر بھری دُوری ہوئی نظریں۔ مجھ سے بیزار تیور۔ مجھ سے تنفر آمیز بے رخی۔ میرے لئے بھی آپ کے ضمیر نے سزا یا تشدد کیا ہے کہ گویا میں آپ کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ مجھ کو یقین دلا دیا ہے کہ نہ میرے رہنے کی خوشی آپ کے پاس ہے نہ آپ کے جینے کی خوشی میرے پاس۔" اس موقع کے لئے ایک بند بھی یاد کیا تھا جو عین وقت پہ ذہن سے نکل گیا۔ مگر خیر آئی ایک

اور مصرعہ یاد آگیا "آپ نے میرا یہ حال بنا رکھا ہے کہ ؎
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے "

انہوں نے حیرت سے کہا "کیا مطلب؟ میری تو سمجھ میں آ نہیں رہا ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں"؟

دل نے کہا کہ بس اب رُکو نہیں کہے چلے جاؤ، سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تو نہ سہی۔ بہر حال رُعب ضرور پڑ رہا ہو گا۔ لہٰذا سلسلہ جاری رکھا۔ "میری بات سمجھنے کی آپ نے کوشش ہی کب کی ہے جو اب میری بات سمجھ میں آجائے گی۔ میری بات سمجھ میں آتی ہی ہوتی تو رونا کس بات کا تھا۔ مگر میرے لئے یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ پیالہ ایک حد تک لبریز ہوتا ہے اس کے بعد چھلک جاتا ہے میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو کر چھلک چکا ہے اور اب میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ۔ کہ۔ کہ"

وہ غور سے میری طرف گھُور رہی تھیں اور میں پریشان کہ اس کے بعد مجھ کو کیا کہنا تھا۔ آخر وہ خود ہی بولیں۔

"ہاں ہاں پوچھئے نا، میں تو خود چاہتی ہوں کہ آپ صفائی سے بات کر لیں مگر آپ نے تو اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا انداز آج اختیار کیا ہے" کچھ پتہ تو چلے کہ یہ جوش و خروش آخر کس بات کا ہے"۔

میں نے فی الکل تمام جوش و خروش قائم رکھتے ہوئے کہا "یہ جوش و خروش نہیں ہے بلکہ بلبلے پھوٹ رہے ہیں۔ آج میں نے طے کر لیا ہے کہ آپ سے پوچھ کر رہوں گا کہ آخر آپ نے یہ انداز کیا بنا رکھا ہے اپنا۔ یعنی ہر وقت میرے لئے ایک بیزاری۔ مجھ سے ایک تنفر، میرے لئے آنکھوں میں ایک بل اور میرے لئے ابرو میں شعلے۔ جی نہیں بلکہ آنکھوں میں شعلے اور ابرو میں بل۔ اگر آنکھوں میں بل ہوتا تو کیا کہنا تھا۔ وہ تو ایک ادا ہوتی۔ وہ تو ایک لگاوٹ ہوتی۔ مگر ـــــ

اب غالباً وہ بھی جوابی حملہ کے لئے تیار تھیں۔ پہلے سر وتہ اٹھایا۔ پھر

کچھ سوچ کر رکھتے ہوئے بولیں۔" میں دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت غصہ کی وجہ سے نہ آپ کو الفاظ پہ قابو ہے نہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ سکتے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے پہلے غور کیجئے پھر جو کچھ کہنا ہے وہ کہئے۔ میں تو خود چاہتی ہوں کہ اگر آپ کے دِل میں کچھ سوالات پیدا ہوئے ہیں تو وہ ضرور صاف ہو جائیں۔

یہ انداز ذرا خطرناک تھا۔ اس لئے کہ اس میں کچھ صلح جویانہ نرمی تھی اور یہ گویا نہایت امتحانی موقع تھا کہ اگر اس وقت میں ذرا بھی نرم ہو جاتا تو وہ پھر اُبھرنے نہ دیتیں۔ لہٰذا اپنے نہایت جوش و خروش کو خالص جوش و خروش ثابت کرنے کے لئے میں نے نہایت سنگین قسم کے الفاظ ڈھونڈتے ہوئے کہا" آپ نے مجھ کو آخر سمجھ کیا رکھا ہے۔ مَیں چغد ہوں۔ احمق ہوں۔ گدھا ہوں آخر کیا ہوں۔ زرخرید غلاموں کے ساتھ بھی وہ سلوک نہیں ہوتا جو اس گھر میں آپ کے

وہ بات کاٹ کر بولیں" مثلاً۔ مثلاً کونسا ایسا سلوک ہُوا آپ کے ساتھ۔"

میں اس جواب کے لئے پہلے سے تیار نہ تھا۔ اس سوال کا پہلے سے اندازہ تھا۔ لہٰذا اس پہ میں نے خاص زور دے کر نہایت مدلل جواب تیار کر رکھا تھا جو اس وقت ذہن میں تو موجود نہ تھا مگر دھندلے دھندلے سے نقوش باقی تھے۔ ان ہی کی مدد لے کر مَیں نے کہنا شروع کیا" مثلاً سلوک یہ ہوتا ہے کہ جوتے کی پالش ــ" لاحول ولاقوۃ یہ تو سب سے سہل مثال تھی جو سب سے پہلے یاد آگئی اور اس سے قبل کہ میں بات بدلوں۔ انہوں نے حیرت کے ساتھ ٹوک دیا۔" جُوتے کی پالش؟ جوتے کی پالش سے کیا مطلب"؟

میں نے گڑبڑا کر کہا" جوتے کی پالش تو مَیں نے یُوں ہی کہہ دی کہ ایک حقیر سی چیز ہے مگر پندرہ دِن سے غائب ہے اور جُوتا طاعونی چُوہے کی شکل کا پہنے پھر رہا ہوں۔ کبھی آپ نے محبت سے پوچھ لیا ہوتا کہ آخر جُوتے

یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں لگ رہی تھی۔ مگر یہ خیال تو اس کو ہوتا ہے جس کو واقعی کچھ خیال ہو۔ مگر جو آدمی روز آپ سے تو کبھی یہ بھی نہ پوچھا کہ آپ ان باتوں پر کیوں نہیں جاتے۔ [illegible] ہمیشہ [illegible] شروع کر دی تھی کہ اس کا فیصلہ [illegible] تھا۔ ان باتوں سے جو باتیں نہیں ہو سکتیں۔ آخر جلدی سے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو تو صرف اپنے غصے سے کام ہے۔ ہر وقت پیشانی سے کوئی سروکار رہتی ہیں۔ میرے لئے ایک تبسم بھی آپ کے چہرے پر کبھی نمودار نہیں ہوتا۔ نہ کبھی آپ مجھ سے بات کرتی ہیں۔ کبھی گفتگو میں مشغول نہیں ہوتی [illegible]

[illegible] خدا کی قسم [illegible] گفتگو تو مجبوراً [illegible] تھی [illegible] وہ سنبھل کر بولیں [illegible]

[illegible] یہ تو تہذیب کو بھی شکایت ہیں مجھ سے مگر اس وقت کیا شکایت ہے ذرا وہ بھی تو سنوں"۔

میں نے میز پر [illegible] ضرورت سمجھ کر کہا یہ وہی تمام شکایتیں اس وقت بھی ہیں اور میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر میری زندگی ان حالات میں کس طرح بسر ہو سکے گی؟ جملہ ختم ہونے کے بعد میز پر [illegible] یاد آیا جو [illegible] بعد میں [illegible] آیا۔

وہ بولیں "میرے خیال میں تو اس وقت آپ کو کسی اور بات پر غصہ آیا ہے"۔

میں نے کہا "اور بات [illegible] بات کیا ہو سکتی ہے؟"

کہنے لگیں "مثلاً [illegible] کو [illegible] چکا ہو"۔

میں نے [illegible] کہا "پھر وہی [illegible] لینا ہوں [illegible] اگر میں [illegible] خدا جانے آپ کیا کرتیں [illegible] شراب پیتا ہوتا تو خدا جانے آپ کیا کرتیں"۔ [illegible]

دھواں دھار تقریر کر رہا ہوں۔ اور وہ اُٹھ کر چل دیں۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے تحقیر کا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کتوں کے بھونکنے سے قافلے نہیں رکا کرتے مگر وہ فوراً ہی واپس آئیں۔ ہاتھ میں کچھ نوٹ تھے۔ قریب آ کر بولیں: "یہ لیجئے روپے۔ میں اسی دن کو بسر کرنے سے منع کرتی ہوں کہ اگر کسی وقت جیب خالی ہوگی تو یہی عالم ہو جائے گا جیسا اس وقت ہے کہ نہ الفاظ پر قابو ہے نہ کسی بات کا کوئی تُک ہے۔"

لاحول ولاقوۃ ہزار چاہا کہ ہنستی رُک جائے مگر بات یہ ہے کہ شریف آدمی کچھ فطرۃً بندہ احسان ہوتا ہے۔ احسان فراموش تو وہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تمام جوش و خروش ختم۔ چہرہ پر تبسم۔ تبسم میں ندامت اور ندامت میں بُزدلی۔ وہ اس وقت بھی فاتحانہ مسکراہٹ کو اپنے رعب اور جلال میں چھپا رہی تھیں۔ ہمارا فیصلہ کن قدم اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور نوٹ گن رہے تھے۔

شوکت تھانوی

عبدالماجد دریابادی

مولوی عبدالماجد دریابادی ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے۔ عربی فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۱۲ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ قرآن مجید کا انگریزی اُردو ترجمہ و تفسیر فلسفۂ جذبات۔ فلسفۂ اجتماع وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ مولوی صاحب کو ادبی دنیا میں ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ فلسفہ میں آپ کا مطالعہ بہت گہرا ہے آپ کو فلسفیانہ مضامین سلیس اور عام فہم اردو میں لکھنے کا خاص ملکہ حاصل ہے۔ ان کے قلم کا ایک خاص کمال یہ ہے کہ ہر بات کو ایک انوکھے پیرائے میں ادا کرتے ہیں اور موقع و محل کی مناسبت سے اس قدر موزوں الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ عقیدت کا سَر ان کے استادانہ طرزِ کلام اور مہارت زبان کے آگے خم ہو جاتا ہے۔ ایک مدت سے اخبار "صدق" نکال رہے ہیں جس میں حالاتِ حاضرہ پر بڑے دلکش پیرائے میں تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ اُردو میں عبدالماجد کا درجہ ایک فلسفی اہلِ قلم کے علاوہ ایک مخصوص صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے بھی بہت بلند ہے۔

نفسیات

حکمائے یورپ اور فلاسفۂ مغرب کی کسی مجلس میں، اگر دفعتہً یہ سوال کر دیا جائے کہ دنیا کے علوم و فنون میں سب سے بہتر، مفید اور ضروری علم کونسا ہے؟ تو مختلف زبانوں پر اُس کے مختلف جوابات آئیں گے۔ لیکن اگر شخصی رجحانات اور ذاتی میلانات سے قطع نظر کر لی جائے۔ تو تحقیق کی عدالت سے بالآخر فیصلۂ ناطق یہ صادر ہوگا کہ جو علم، حیاتِ انسانی کی منازل طے کرنے یا فرائضِ معیشت کے ادا کرنے اور زندگی کے بہمہ وجوہ احسن و مکمّل بسر کرنے میں سب سے زیادہ معین و کارآمد ہو، وہی سب سے بہتر، اور اسی کی تحصیل سب سے مقدم اور سب سے زیادہ ضروری ہے ؛

تہذیب و تمدن کی دنیا میں جتنے علوم و فنون، جتنے پیشے اور جتنے مشاغل انسان کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کے اندر کامیابی کے لئے حیاتِ نفسی کے اصول و قوانین سے عملاً واقف ہونا ضروری نہ ہو۔ اور جس علم میں حیاتِ نفسی کے ان اصول و قوانین کی باقاعدہ تشریح کی جاتی ہے۔ اُسی کا نام نفسیات ہے ؛

یورپ کی ایک مشہور یونیورسٹی کے ایک دولتمند استاد صاحب شب کو اپنے کمرے میں تنہا سو رہے ہیں۔ ایک قزاق پستول سے مسلّح خوابگاہ میں داخل ہوتا ہے۔ اور پستول کی لبلبی پروفیسر صاحب کی پیشانی کے سامنے لاکر خزانے کی کنجی کا سوال کرتا ہے۔ سونے والے کی آنکھ کھلتی ہے تو موت کا منظر روبرو۔ کوئی دوسرا ہوتا تو بدحواس ہو جاتا۔ لیکن اُس کے ہوش و حواس درست رہتے ہیں۔ چہرے پر سکون واطمینان کے آثار قائم۔ بے

سپاہی کے ساتھ ڈاکو سے کہتا ہے کہ "یہ کیا مردانگی ہے کہ ایک سوتے ہوئے پر تم تین مل کر حملہ آور ہوتے ہو"۔ ڈاکو تنہا تھا، گھبرا کے پیچھے دیکھنے لگتا ہے کہ یہ دو اور ساتھی کہاں سے پیدا ہو گئے۔ اُستاد صاحب کی استادی کام آ جاتی ہے۔ ڈاکو کے ہاتھ سے ریوالور جھٹک کر زمین پر گرا دیتے ہیں اور کہاں ابھی چت پڑے ہوئے تھے یا ابھی اُسی ڈاکو کو چت کر دیتے ہیں۔ مُعلم صاحب فنِ نفسیات (سائیکالوجی) کے معلم تھے اور فن کے محض عالم ہی نہیں تھے، عالم باعمل بھی تھے۔

ایک شخص بار بار کا سزا یافتہ تھا، لیکن ہر سزا پانا اُس کی جرم پسندی اور ذوقِ جیل بازی کو بڑھاتی ہی رہتی تھی۔ جب جیل کے اندر جاتا، تو پُرانے گھاگھ مجرموں کی صحبت، جرائم پر اُس کی دلیری بڑھاتی جاتی، اور جب باہر نکل کر آتا تو ہر طرف سے لعن طعن کے آوازے، اور نفرت و بیزاری کے فقرے دل کو سخت سے سخت تر کرتے رہتے۔ جب آخری مرتبہ اُس پر مقدمہ قائم ہوا تو اُسی کے وکیل نے اُس "ذلیل بدمعاش" کو یا بقول ہاتھ لیا اور اُٹھ کر اور کھڑے ہو کر استقبال کیا، عزت کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ اپنے برابر کرسی پر جگہ دی۔ اب مجرم کی قلب ماہیت تھی۔ اب وہی سراپا جرم ہستی، شائستگی اور امن پسندی کی تصویر تھی۔

وکیل صاحب کوئی ساحر نہ تھے۔ کچھ صاحبِ تصرف و کرامات نہ تھے۔ البتہ نفسیات کی اس حقیقت کے رمز شناس تھے کہ جماعت جس طرح کا اثر افراد پر ڈالتی ہے، بس وہ اُسی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کچھ لوگ سازش کر کے کسی اچھے بھلے آدمی کو دیوانہ اور پاگل کہنا شروع کر دیں، تو چند روز میں واقعتہً اُس شخص سے وحشت و جنون کی حرکتیں سرزد ہونے لگیں گی اور وہ خود بھی اپنے کو دیوانہ یقین کرنے لگے گا۔ اگر کسی شخص کے ہمنشین اُسے نظروں سے گرانے لگیں تو کچھ عرصے میں وہ شخص خود اپنی نظروں میں ذلیل معلوم

ہونے لگے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی ہر طرف سے ہم حوصلہ افزائی ہوتی ہے
تو چند روز میں اس میں از خود خود اعتمادی اور بلند نظری پیدا ہو جائے گی۔ یہی حال
مجرم کا بھی ہے۔ اگر ہم بھی یہ تواتر آئندہ سینکڑوں نہیں آپ ہی خیال والے نہ یہ ہیں
کہ وہ بڑا ہونہار طبیعت کا ہے تو وہ یقیناً ایسا ہی ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہم اپنے
طرز عمل سے اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیں کہ وہ ایک اچھا آدمی ہے اور ہم
اس سے وہی توقعات رکھتے ہیں جو ایک شائستہ شخص ہی سے رکھنی چاہییں
تو اکثر صورتوں میں وہ شخص یقیناً ایسا ہی ہو جائے گا۔ اس نکتے تک نہ
محض مجسٹریٹ کی ذہنی رسائی ہو سکتی ہے نہ پولیس کی پہنچ ہو سکتی ہے
اور نہ بیرسٹروں کی تاوقتیکہ مخفی موثرات نفس انسانی پر بھی نظر نہ ہو۔

دو لڑکے جن کی عمریں سات سات سال کی ہوں گی۔ الگ الگ اپنے ماسٹروں
سے جغرافیہ کا درس لے رہے تھے۔ سبق میں آفتاب اور کرۂ زمین کے درمیانی
فاصلے کا ذکر آیا۔ ایک ماسٹر نے اپنے شاگرد سے کہا کہ "زمین سے آفتاب تقریباً
نو کروڑ میل دور ہے" لڑکے نے یہ فقرہ سننے کو تو سن لیا لیکن سمجھ میں خاک نہ آیا
کیونکہ نو کروڑ کیا بلا ہے اس کا استاد کی ہیبت سے زبان نہ کھلی لیکن اس کے علم میں
اس اطلاع سے مطلق اضافہ نہ ہوا۔ دوسرے استاد نے اس کے برخلاف اپنے
شاگرد سے شفقت کے لہجے میں سوال کر دیا کہ "اچھا یہ تو بتاؤ اگر کوئی شخص یہاں
سے آفتاب تک ریل میں بیٹھا ہوا تمہارے ابا کی عمر کو بالکل کر دے دن کو شام
لگا تو کیا کہہ سکو گے؟ بچے نے خود جواب دیا "کئی دن لگ جائیں گے" جلدی سے کمرے
سے نکل کر بھاگ جاؤں گا۔ اس پر ماسٹر صاحب نے تمکین و تسکین کے لہجے
میں پوچھا کہ نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے یہ تم بزرگ اطمینان سے
اسی کمرے میں بیٹھے رہو اور اسی طرح آگے بڑھتے رہو۔ درجہ پاس کرو
پھر دوسرا درجہ پاس کرو پھر تیسرا درجہ پاس کرو۔ پاس کر کے نوکری کرنے لگو۔ بیوی بچے پالو
کمانے پھر نوکری کرو۔ شادی بیاہ کرو۔ پھر تمہارے لڑکے پیدا ہوں۔ اور

وہ لڑکے آ آکر اس اسکول میں پڑھیں اور تم مجھ سے بھی زیادہ بوڑھے ہو جاؤ جب کہیں جاکر اتنے برسوں کے بعد' وہ آج کی چلی ہوئی گولی آفتاب سے کمرے تک پہنچے گی۔ کچھ ٹھکانا ہے؟ آفتاب ہماری زمین سے اتنی دُور ہے!

ان دونوں مثالوں میں پہلا اُستاد نرا کھرا جغرافیہ دان تھا نطرتِ بشری سے بیگانہ ۔ دوسرا استاد اپنے فن کے علاوہ اصولِ نفسیات کا بھی ماہر تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نفسِ بشری ہمیشہ مجہول کو معروف کے ذریعے سے جانتا اور نامعلوم کو معلوم کے واسطے سے پہچانتا ہے ۔ آفتاب کا فاصلہ بچے کے لئے قطعاً ایک مجہول و نامعلوم شے تھی' اُسے کسی ایسی چیز کی وساطت سے اُس کے ذہن نشین کرانا تھا' جو اُس کے لئے خوب معروف اور اچھی طرح معلوم ہو۔ نہ کہ اُس مجہول کا تعارف ایسے ذریعے سے کرایا جائے ۔ جو خود مجہول ہو ۔ جیسے بچے کے دماغ کے لئے " نو کروڑ " کا ناقابلِ فہم و ناقابلِ تصوّر عدد!"

فنِ تربیت کے تمام اصول' درحقیقت قوانینِ نفسی کے فروع ہیں۔ اشتہار ہر دوا فروش دیتا ہے۔ لیکن ہر اشتہار کامیاب و پُر منفعت نہیں ثابت ہوتا اس کا کھُلا راز یہ ہے کہ اشتہارات کی کامیابی کوئی محض اتفاقی شے نہیں ہوتی بلکہ خاص خاص اصول و قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ عام دکان دار اُن اصول کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور کامیاب دلیل راہ بنا لیتے ہیں۔ اشتہاری کامیابی کا اصلِ اصول اشتہار کی جانب پبلک کی اضطراری جلبِ توجہ ہے ۔ اور اسی ایک اصل کو نظر انداز کر دینے سے اتنے زائد مشتہرین ناکام رہتے ہیں۔ ایک شخص فلسکیپ سائز کے کاغذ پر اشتہار دیتا ہے اور اس کے عنوان ایک ایک بڑے لمبے جملے کو قرار دیتا ہے ۔ یہ غریب اس سے بے خبر ہے کہ انسان کا ذہن ایک وقت میں متعدد چیزوں کا احاطہ نہیں کر سکتا ۔ اور اس لئے سرسری نظر میں ناممکن ہے کہ وہ طویل العنوان اشتہار پر متوجہ ہو سکے۔

دوسرا شخص جو اپنی چیزوں کا اشتہار ہمیشہ ایک ہی عبارت کے ساتھ ایک ہی پرچے میں شائع کراتا رہتا ہے، وہ اس حقیقت سے بیگانہ ہے کہ نفس انسانی پر زیادہ مؤثر دعوے ہوتا ہے جو تھوڑے تھوڑے فرق عنوان اور ہلکے ہلکے تفاوت بیان کے ساتھ مختلف ذریعے سے اس کے سامنے پیش ہوتا رہے۔ ایک تیسرا شخص اپنے اشتہار کو نمایاں کرنے کے لئے سیاہ زمین میں سفید حروف درج کرتا ہے۔ وہ اس نکتے سے ناآشنا ہے کہ جلب توجہ کی زیادہ قوت اس میں نہیں۔ بلکہ صورت بالعکس میں ہے یعنی سفید زمین پر سیاہ حروف تحریر کرنے میں۔ ایک اور مشتہر جلب توجہ کے اصول سے غلط واقفیت پیدا کرکے اپنے اشتہارات پر کوئی عجیب و غریب تصویر بنا دیتا ہے کہ لوگ فرط حیرت سے اُسے خود بخود دیکھنے لگیں گے اور بے چارہ اس سے بے خبر ہے کہ غیر متعلق الفاظ اور بے تعلق تصویروں کا اندراج بجائے مفید ہونے کے مُضر پڑتا ہے۔ کتابوں کے اشتہار میں مینڈک کی شبیہ، حلوے کے اشتہار میں گرگٹ کی تصویر، بجائے مفید ہونے کے شئے مشتہرہ اور تصویر مندرجہ کے درمیان ایک عظیم افتراقِ ذہنی پیدا کر دیتی ہے، جو مشتہر کے حق میں سخت مضر ہے۔ غرض جتنے مشتہرین ناکام رہتے ہیں اُن کی ناکامی کا راز بس اسی قدر ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اشتہار دینے میں نفسیات بشری کے صحیح اصول کو نظر انداز کر دیا۔

اوپر جو گفتگو ہوئی اس کے نتائج ذیل حاصل ہوئے:۔

(۱) اصولاً فطرتِ بشری سے واقفیت، ہر شعبۂ حیات کے لئے لازمی ہے۔

(۲) عملاً دنیا کے ہر پیشے اور ہر فن میں کامیابی انہی لوگوں کے حصے میں رہتی ہے جو قوانین نفس کو ملحوظ رکھ کر مشغول کار رہتے ہیں:۔

عبدالماجد دریابادی

سیّد امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج دیو بند کے رہنے والے شمس العلماء سید مولوی ممتاز علی صاحب کے صاحبزادے ہیں موجودہ زمانے کے انشاء پردازوں میں نمایاں درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا لکھا ہوا ڈرامہ "انار کلی" بہت مشہور اور پسندِ خاص وعام ہے۔ آجکل عام طور پر ریڈیو کے لئے ڈرامے اور فیچر لکھتے ہیں۔ آپ کی نگرانی میں بچوں کا ہفتہ وار اخبار "پھول" شائع ہوتا ہے۔ چچا چھکن وغیرہ ان کی تصانیف ہیں ؎

انارکلی

(سلیم کا مثمن برج والا ایوان)

باہر نیلے آسمان ، مسجد کے گنبد اور میناروں پہ دھوپ کہہ رہی ہے کہ دن چڑھ چکا۔ اندر سلیم تخت پہ بیہوشی کی حالت میں پڑا ہے۔ گویا کہیں سے لا کر لٹا دیا گیا ہے۔ ذرا سی دیر بعد حرم کی طرف کے دروازے کے پردے ہلتے ہیں اور دلآرام سر نکال کر اندر جھانکتی ہے۔ جب اطمینان ہو جاتا ہے کہ سلیم غافل ہے تو دبے پاؤں اندر آتی ہے اور آہستہ آہستہ پنجوں کے بل چل کر سلیم کے قریب پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔

دلآرام ۔ تو غافل سو رہا ہے ۔ اور موت کا منہ تیری انارکلی پہ بند ہو چکا ہے۔ تیری زندہ انارکلی کے گرد اینٹیں اور پتھر چنے گئے اور اس کا حسن خاک میں غروب ہو گیا۔

(سلیم کروٹ بدلتا ہے۔ دلآرام حرم کے دروازے کی طرف بڑھتی ہے۔ مگر رخصت ہونے کو جی نہیں مانتا۔ آخر جلدی سے بڑھی اور دروازے کے پردے کے پیچھے چھپ جاتی ہے)

سلیم (آنکھیں کھول دیتا اور ذرا دیر چپ چاپ پڑا ساکن نظروں سے چھت کو تکتا رہتا ہے۔ پھر اٹھ کر بیٹھ جاتا اور چونک کر حیرت سے ادھر ادھر دیکھتا ہے) یہ کیا ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟ —— اب میں یہاں ہوں۔ یہ کیا اسرار۔ کیسے ہوا؟ مجھے ابھی معلوم ہونا چاہئے۔

(باہر جانے کے لئے دروازے کی طرف بھاگتا ہے۔ دروازہ میں سے ایک سپاہی تلوار لئے ہوئے نکل آتا ہے۔ اور جھک کر تعظیم بجا لاتا ہے)

سپاہی ۔ صاحب عالم اس ایوان سے باہر نہیں جا سکتے ۔
سلیم ۔ کیوں ؟
سپاہی ۔ ظل الٰہی کا فرمان ہے ۔
سلیم ۔ (جلال کے عالم میں) میں جاؤں گا ۔
سپاہی ۔ (سکون سے) کوشش بے سود ہے ۔ ہر طرف مسلح سپاہی ہیں ۔
سلیم ۔ آہ ! میں اسیر ہوں ۔ بے دست ہوں ۔ خداوندا !!!

(مسند پر گر پڑتا ہے)

(بختیار داخل ہوتا ہے چہرے پر فکر و تردد ہے)

بختیار ۔ سلیم !
سلیم ۔ آہ ! تم بختیار ! تم آ گئے میرے دوست ! مجھے بتاؤ ۔ نہیں جانتا کیا کیا پوچھوں ؟ سب کچھ بتاؤ ۔ نہیں ! پہلے بتاؤ ۔ وہ زندہ ہے ؟
بختیار ۔ امیدیں ، آرزوئیں ، امنگیں ، حوصلے ، سب مٹ گئے سلیم ! تمہارا سب کچھ فنا ہو گیا ۔

(سلیم کھڑا کھڑا سا مٹنے کو گرنے لگتا ہے ۔ بختیار سلیم ! سلیم ! کہتا ہوا بڑھتا ہے اور اسے سنبھال لیتا ہے)

میرے شہزادے ! میرے بادشاہ ! ہوش میں آؤ ۔ مرد بنو ۔
سلیم ۔ مجھے تم سے کچھ کام ہے ۔
بختیار ۔ (سلیم پر نظریں گاڑے ہوئے) کیا ؟
سلیم ۔ ایک خنجر لا دو ۔
بختیار ۔ (اٹھ کر سلیم کے سامنے آ بیٹھتا ہے) تم کیا سوچ رہے ہو ؟
سلیم ۔ کچھ نہیں ۔ مجھے انارکلی کے پاس پہنچنا ہے ۔
بختیار ۔ سلیم ! خدا کے لئے ــــــ
سلیم ۔ (غصہ سے) خنجر لاؤ ۔ یا دور ہو جاؤ ۔

بختیار ۔ (سلیم کے غصہ سے ڈر کر کھڑا ہو جاتا ہے) سلیم! مجھ پر رحم کھاؤ ۔
سلیم ۔ (یوں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے جیسے رُک جانے کے بعد زندگی ریلا کر کے اُس کے جسم میں واپس آ گئی ہو) کچھ نہیں۔ یہاں سے نکل جاؤ (بختیار کو نکالنے کے لئے اُس کی طرف بڑھتا ہے۔ حرم کے دروازہ سے ثریا داخل ہوتی ہے)

(سلیم ثریا کو دیکھ کر اُس کی طرف بڑھتا ہے)

ثریا ۔ (وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ اُٹھا کر) میرے قریب نہ آ ۔
سلیم (حیرت میں) کیا ؟
ثریا ۔ تیمور کی نامراد اولاد! ہندوستان کے بُزدِل ولی عہد! میری بہن کی جان لے کر تو ابھی زندہ موجود ہے۔ جھوٹے! تو نے اس کو بچا لینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کوشش میں تو نے اپنی جان تک دے دینے کو کہا تھا اور سب قول یوں پُورے ہوئے؟ جوانِ انارکلی کے، انارکلی کی بڑھیا ماں کے قاتل! تجھ پر بے کس کا صبر ٹوٹے، تجھ کو مظلوم کی آہیں پھونکیں۔ تجھ کو بے بس کے آنسو غرق کریں ۔
بختیار ۔ لڑکی! خاموش خاموش ۔
سلیم (سر جھکا کر) ثریا! دُنیا کی کوئی لعنت، کوئی بددُعا باقی نہ چھوڑ! اور جب تیرا دِل بھر جائے تو صرف اتنا کر۔ مجھے اپنی انارکلی کے راستے پر لگا دے ۔ میری ثریا! میرا راستہ کھو گیا۔
ثریا ۔ ظالم اکبر کے دروغ گو بیٹے! تجھے راستہ نہیں ملتا۔ میری جیتی جاگتی بہن کے گرد دیوارچُن ڈالی گئی۔ وہ ناشاد زندہ گاڑ دی گئی۔ اس کی سلیم (سلیم!) کی آخری چیخیں آسمان میں شگاف کرتی رہیں۔ اور تو یہاں پردوں میں گدیلوں پر جان کو لئے بیٹھا ہے۔
سلیم ۔ زندہ دیواریں؟ پناہ تیری! میرے گرد کس جہنم کا مُنہ کھُل گیا ۔

ثریا۔ وہ تھرتھراتی ہوئی نازنین پتھروں میں ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گئی۔ اس کا دھڑکتا ہوا دل، دوڑتا ہوا لہو دیوار میں غرق ہونے کے بعد ختم گیا اور تجھے اُس کا راستہ نہ ملا۔ موت نہ آئی۔

سلیم۔ (پاگلوں کی طرح کبھی اپنے آپ سے کبھی بختیار سے) دیوار بند ہو گئی۔ اس پہ دیوار بند ہو گئی۔ میرا دم گھٹا۔ دم گھٹا۔

بختیار۔ سلیم! سلیم! تمہیں کیا ہو گیا۔ نامُراد لڑکی! تو نے کیا کر دیا۔؟

ثریا۔ خوشامدی کُتّے! میری بہن کی روح دوسرے جہان میں اس کے لئے بیتاب ہے۔ میں اپنے آخری سانس کو اس کے لئے لعنت بناؤں گی۔ میں اس کے لئے زندگی کو موت سے بدتر بنا دوں گی۔ میں اسے خود کھینچ کر موت کے مُنہ میں لے جاؤں گی (سلیم بختیار کی آغوش سے یک لخت الگ ہو کر دیوانہ وار دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

بختیار۔ سلیم! کہاں جا رہے ہو؟

سلیم۔ میں اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ قلعے کو کھنڈر بنا دوں گا۔

بختیار۔ راہ بند ہے۔

سلیم۔ راہ بند ہے تو میری ٹکریں راہ بنائیں گی (پہ وہ دیوار پر سے نوچ ڈالتا ہے۔ دیکھتا ہے تو پیچھے دلآرام سہمی ہوئی کھڑی اس کے جنون کو دیکھ کر کانپ رہی ہے) انارکلی!

ثریا۔ اندھے! یہ انارکلی ہے یا وہ سموم جس نے انارکلی کو پھونک ڈالا۔ دلآرام انارکلی کی قاتل تیرے سامنے کھڑی ہے۔ اس نے انارکلی کو گرفتار کرایا۔ جشن کی رات یہ اکبر کے حضور میں موجود تھی۔ اس نے قتل کا حکم دلوایا۔ کل رات یہ اکبر کی خوابگاہ میں گئی تھی۔ انارکلی کا سانس بند ہے، اور یہ سانس لے رہی ہے۔ انارکلی کے جسم سے زندگی کی آخری رمق مٹ چکی۔ اور اس کے جسم میں لہو جاگ رہا ہے۔ مار! مار! میرا کلیجہ ٹھنڈا کر! انارکلی

کی روح کی جلن کو مٹا!

دلآرام۔ (تھر تھر کانپتے ہوئے) میں نے موت کی سزا نہیں دلوائی۔ داروغۂ زنداں نے دلوائی ہے۔

سلیم۔ (لپک کر اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے اور دبانا شروع کرتا ہے) آخرکار! آخرکار انارکلی کو گھونٹ ڈالنے والے پتھر! تو مجنوں سلیم کے ہاتھ آ گیا۔ اب اس کے ہاتھ تیرے خون کی ایک ایک بوند سے انارکلی کا انتقام لیں گے۔

سید امتیاز علی تاج

فلک پیما

خان بہادر عبدالعزیز صاحب ایک مدت تک "فلک پیما" کے نام ملک کے مشہور ادبی جرائد خصوصاً ہمایوں کے لئے مضامین لکھتے رہے۔ اردو ادب میں ان کا رنگ بالکل جداگانہ ہے۔ لاہور کے رہنے والے تھے۔ ایک مدت تک پنجاب سول سروس میں رہے۔ کچھ مدت ریاست کپورتھلہ کے وزیر اعظم بھی رہے۔ تقسیم کے بعد صوبہ پنجاب میں فنانشل [illegible] رہے [illegible] آپ کا [illegible] ہو گیا ہے۔

میاں رحموں

حکما، فرماتے ہیں کہ کسی کا دولتمند ہونا اس کے اپنے لئے اور نیز قوم کے لئے بڑا بھاری بوجھ ہے بعض تو سرے سے دولتمند خاندان میں پیدا ہونے کے ہی برخلاف ہیں اور اسے بدقسمتی خیال کرتے ہیں ۔

اطبائی دُر فشانی یہ ہے کہ بیخوابی، سوہضمی وبھچول قسم بیسیوں دیگر جسمانی سمیات کے لئے صرف غربت ہی تریاق ہے ۔

صُلحا کی نصائح کا لُبّ لباب بھی یہی ہے کہ جتنی دیر میں اہلِ دوّل اپنی شاندار قبروں کے نیچے سے بمشکل جنبش کر سکیں گے۔ اتنی دیر میں ملنگے تانگے کے کفن والے جنت میں داخل ہو کر حوروں سے پاؤں دبواتے ہوں گے ۔

گویا خوش قسمتی، صحت و اخروی فلاح کا زیادہ تر دار و مدار ناداری پر ہے۔ ایک شخص نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اللہ میاں کو غریب مسکین بہت ہی پسند ہوں گے جو اس قدر سال بہ سال ان کو پیدا کرتا رہتا ہے ۔

آمنّا و صدقنا۔ ہر چہ شک آرد کافر گردد مگر پھر بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ اللہ جل شانہٗ کی یہ بےغایت عنایات میاں رحموں بہشتی پر کیوں وفور ہیں؟ کیوں وہ اس قدر خوش قسمت ہیں کہ باپ کے قرضے میں اپنی کمائی، نانی کا گھر، گھر والی کا زیور سب کچھ دے کر بھی مدیون ہیں اور کیوں ان کے لئے صحت کا بہترین استعمال یہی ہو کہ سردی کے موسم میں اذان سے پہلے جو مشک ڈھونی شروع کریں تو شام کے سات بجے تک کمر نہ کھولیں ؟ اور کیوں ان کا مالی اقتدار اس زور پر ہو کہ میونسپل کمیٹی سے تیس دن کے دو وقتہ چھڑکاؤ کے لئے تین روپیہ، بیس گھروں سے پانی کی مجموعی اُجرت دس روپیہ اور جب قحط نہ ہو تو چند مزید

سوکھی روٹیاں ان کے لئے کافی تصور ہوں ؟

حلم کا ان کے یہ حال ہے کہ کوئی کچھ ہی کہہ لے کیا مجال کہ میاں رحموں تیور پہ بل لائیں سنتے ہیں کہ صرف ایک دفعہ جوانی میں انہیں غصہ آ گیا تھا محلے میں ایک صاحب نے ناحق ان کے خورد سال بچے کے تھپڑ رسید کیا محض اتفاق سے میاں رحموں اچانک اس جگہ آ نکلے اور گو ان کے کندھے پر بھری مشک تھی انہوں نے مارنے والے کو ایک ہی خالی ہاتھ سے مروڑ کے دھر دیا۔ میاں رحموں کی خوش قسمتی نے اس موقع پر بھی ان سے منہ نہ موڑا۔ پولیس معززین کی پوری محافظ نکلی اور تھانیدار نے شارع عام میں دنگے کا مقدمہ کھڑا کر دکھایا۔ پانچ پولیس، پانچ وکیل، پانچ عدالت کل پندرہ روپے کے سر آئی۔ وہ سالانہ چھ چھ کر (تین اصل تین سود) میاں رحموں نے پانچ سال میں ادا کئے، مگر اس دن سے آج تک پھر بچارے نے باوجود صدہا آزمائشوں کے مزاج کو برہم ہونے نہ دیا۔ ان کے محلے میں جو ممبر چونگی ہیں ان کے نوکروں کی دو وقتہ ڈانٹ ڈپٹ حضرت ایوب بھی مشکل سے برداشت کرتے مگر میاں رحموں ہیں کہ جھکے جاتے ہیں، سرکار سرکار کے سوا بات نہیں کرتے۔ پندرہ دونے تیس روپیہ کا سبق انہیں ایسا ملا کہ پھر عمر بھر ہر قسم کا ظلم برداشت کیا مگر انتقام یا انصاف کا خیال تک دل میں نہ آنے دیا۔ جسمانی مشقت ہی اتنی سخت تھی کہ بھوک کے سوا کسی اور خیال کا آنا قریباً ناممکن تھا۔ جب ان کی بکری ایک بے پروا موٹر کے نیچے دب کر مر گئی تو بچارے پورے چھ ماہ تک روکھی چنے کی روٹی پر کنبہ پالتے رہے غنیمت تھا کہ موٹر والوں نے ہرجانے کا دعوےٰ نہ کیا۔ اور بہت سے واقعات ان کی زندگی کے اس امر کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں کہ حکماء اور صلحاء کے نقطۂ خیال سے میاں رحموں کی زندگی خوش قسمتی اور اخروی فلاح کی بے مثل مجسمہ تھی ۔

میاں رحموں پر ہی کیا موقوف ہے لاکھوں اس قسم کی اور مثالیں ہیں۔

بلکہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میاں رحموں کا دوسرا نام ہندوستان ہے اور جہاں تک تدبر کو کام میں لایا جائے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ کیوں ملکوں میں ہندوستان کو سب سے زیادہ خوش قسمت خیال نہ کیا جائے۔ خدا جانے آج کل کے وطن پرست برادران کی عقل پر کیا پردہ پڑ گیا ہے کہ وہ آئے دن بجائے اس کے کہ شکریہ کے جشن رچائیں خواہ مخواہ کی بدظنی اور بے چینی پھیلانے میں مصروف ہیں ان لوگوں کا کبھی یہ رونا ہے کہ فوج زیادہ ہے اور کبھی یہ جھگڑا ہے کہ سول میں تنخواہ زیادہ ہے۔ کبھی انہیں یہ بخار ہے کہ بدیسی تجارت کی ڈائن یہاں کی نتھی کھڈیوں کا کلیجہ نکال رہی ہے یہ سب باتیں غلط ہیں۔ شاندار ملک ہے اس لئے فوج زیادہ ہے۔ اور کونسا ملک ہے جہاں ایسے جلیل القدر راجہ نواب ہیں؟ اگر فوج تھوڑی ہو تو ان کی سلامی اور پیشوائی میں فرق آجائے ؞

اصل بات صرف اتنی ہے کہ قانون دان تعزیر باز خیال کر لیتے ہیں کہ ملک میں وہی وہ ہیں حالانکہ ایسے ایسے مہاراجہ بھی ہیں جن کا ہوٹل میں سو کمروں بغیر گذارہ نہیں ہو سکتا ؞

فوج پر اعتراض بالکل لغو ہے باقی رہی سول والوں کی تنخواہ مگر امیر مزاج ملک ہے۔ اس لئے ملازمان کو منہ مانگی تنخواہ دیتا ہے۔ یک بیک اس قدر سفلہ پن کہاں سے آجائے کہ انکار کر دے اور پرانے آزمودہ کار خدمتگزاروں سے منہ موڑ لے۔ اب رہی دیسی بدیسی تجارت کی چپقلش۔ بھلا میاں رحموں جیسے آن والے سے یہ کب ممکن ہے کہ جن دوکانوں سے پرانی ساکھ ہے وہاں سے سودا نہ لے ارے بھائی جس بادشاہ نے ہیضے، ملیریئے، طاعون کو تاں نہ کبھی وہ ململ، لٹھے، نین سکھ کو کیا دھتکار دے ؞

اصل بات یہ ہے کہ سیاسیات کے لٹھ باز خواہ مخواہ میاں رحموں کی تذلیل کے درپے ہیں۔ بیہودہ چیخ پکار مچا رکھی ہے کہ غریب ہے مفلس ہے ان پڑھ ہے، میاں رحموں کو کیا ضرورت کہ مسٹر سمتھ بن جائے، ان اللہ والوں کو دھن دولت کے جنجال سے کیا نسبت ہو اسلئے اپنی تو یہی صلاح ہے "رام بھلی کریگا"

فلک پیما

عبدالمجید سالک

۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء کو بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و پرورش پٹھانکوٹ میں ہوئی۔ بی۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کرنے کے بعد ۱۹۱۵ء میں تہذیب نسواں اور پھول کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے جب ۱۹۲۰ء میں روزنامہ "زمیندار" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ زمانہ خلافت میں ایک سال جیل بھی کاٹی۔

۱۹۲۷ء میں غلام رسول صاحب مہر کی رفاقت میں اپنا ذاتی اخبار "انقلاب" جاری کیا۔ جو اب بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر بند ہے۔ اور اسے زندہ کرنے کی مساعی جاری ہیں۔

سالک صاحب شاعر، انشاء پرداز، نقاد ادب، ظرافت نویس، براڈکاسٹر اور اخبار نویس ہیں جس مجلس میں موجود ہوں۔ وہ آپ کے مزاح لطیف سے کشتِ زعفران بنی رہتی ہے۔ نثر میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ زبان دانی خصوصیت ہے۔

ادبیاتِ اُردو

کسی زبان کے ادب کو ترقی دینے کے لئے اخباروں اور رسالوں کی بے انتہا ضرورت ہے لیکن ایسے اخبار اور رسالے مطلوب نہیں، جو آج کل ہمارے ملک میں حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ شور بہت مچاتے ہیں۔ لیکن کام کچھ نہیں کرتے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں تمام اخباروں اور رسالوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہا ہوں۔ اس محشرستان صحافت میں چند موقت الشیوع پرچے ایسے بھی نظر آتے ہیں۔ جن کی ادبی خدمات لائق تحسین ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بالکل انگلیوں پر گننے کے قابل ہے۔ جب تک تمام اردو رسائل و جرائد کی زبان درست نہ ہوگی۔ ادبیات اُردو کی ترقی کا خواب بالکل خواب ہی رہے گا جس قوم کے مدیران جرائد اور مصنفین تک کی زبان درست نہیں۔ وہ نہ صرف قوم کہلانے کے قابل نہیں، بلکہ اسے صفحۂ دُنیا پر زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں، ایسی قوم نہ ڈراما اور ناول لکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے، نہ مختصر فسانوں کی تحریر میں کوئی درجہ حاصل کر سکتی ہے۔ نہ اچھا شعر لکھ سکتی ہے، جس کی زبان غلط ہے۔ اس کا ڈراما غلط۔ ناول غلط۔ ع

خود غلط ۔ مضمون غلط۔ انشاء غلط۔ املا غلط

اُن لوگوں کو جو اخباروں کے ایڈیٹر اور کتابوں کے مصنف بننا چاہتے ہیں۔ لازم ہے کہ صحیح زبان سیکھنے کی کوشش کریں۔ اور جن حضرات کو اپنے ملک اور اس کی زبان سے حقیقی ہمدردی ہے۔ ان کا فرض ہے کہ لوگوں کو صحیح زبان سکھائیں اس کی عملی صورت یہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے بہترین زبان دانوں کی خدمات حاصل کی جائیں بہترین زبان دانوں سے میرا مطلب یہ ہے۔ کہ

اچھے پڑھے لکھے اور ثقہ آدمی حاصل کئے جائیں۔ جو زمانے کی ضروریات اور اُردو کی وسعت فرائض سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ آج کل اُردو زبان بہت تیزی اور سرعت سے ترقی کر رہی ہے۔ اور خصوصاً اہلِ پنجاب نے تو اس زبان کے خزائن کو مالامال کر دیا ہے۔ آج کل ہمیں ایسی زبان کی ضرورت ہے جو علم و ادب کے تمام شعبوں میں اظہارِ خیالات کے لئے کافی روانی ہو۔ بیگماتی روزمرہ اور چوڑے چکلے کے محاورات کی اتنی ضرورت نہیں جتنی اس امر کی ضرورت ہے۔ کہ اُردو کا دائرۂ ادب وسیع کرنے کے لئے ہر قسم کے محاورات کو رواج دیا جائے اور اُن انگریزی دانوں کی رہنمائی کی جائے۔ جو انگریزی کے مضامین و کتب کا ترجمہ کرتے ہوئے اپنی ناواقفیت کی وجہ سے اُردو کی تہیدستی کا رونا رویا کرتے ہیں۔

دائرۂ ادب کی تجویز

اپنے بہترین زبان دانوں کے اہتمام میں نہایت اعلیٰ پیمانے پر ایک "دائرۂ ادب" قائم کیا جائے جس کے ماتحت وہ لوگ ادب کی تمام اصناف پر اچھی کتابیں لکھیں۔ اور اس دائرہ کے ماتحت زبان کی تنقید کے لئے ایک عمدہ اور ضخیم رسالہ یا ہفتہ وار اخبار جاری کیا جائے۔ جو مہینے بھر کے تمام اخباروں اور رسالوں کی موٹی موٹی غلطیاں بتائے۔ اخباروں کو نئے الفاظ کے تراجم مہیا کرے۔ اور اندازِ بیان کے سلجھے ہوئے طریقے سمجھائے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ یہ کام بہت بڑا اہتمام، بہت سا روپیہ اور بہت سا ایثار چاہتا ہے۔ لیکن کوشش کی جائے۔ تو سب کچھ ممکن ہے۔

اس کے علاوہ اخباروں کے ایڈیٹروں کو چاہیئے۔ کہ وہ اپنے عملے میں ایسے شخص کو نہ رکھیں۔ جو زبان صحیح نہ لکھ سکتا ہو۔ ادبی انجمنوں کے ناظموں کو لازم ہے۔ کہ وہ کسی ایسے نثار یا شاعر کو اپنے جلسوں اور مشاعروں میں نثر و نظم نہ سنانے دیں جس کی زبان صحیح نہ ہو۔ غرض اس قسم کی تدابیر اختیار کی جائیں جس سے نثر و نظم لکھنے کے شوقینوں کو مجبوراً زبان سیکھنی پڑے اور جب تک وہ کسی مستند استاد سے

اصلاح نہ لیں اور صحیح اُردو نہ لکھیں اُن کو اُردو کے کسی رسالے یا اخبار یا جلسے یا مشاعرے میں بار نہ مل سکے ۔

اس تمام سمع خراشی سے میرا مدعا یہ ہے۔ کہ ادب میں زبان ہر چیز پر مقدم ایک ایسی غزل جو تغزل کے تمام دوسرے محاسن سے مالامال ہو لیکن اس کی زبان غلط ہو۔ یقیناً اُس غزل سے پست سمجھی جائے گی جس میں گو جذبات اور تخیل کا علو تو نہیں پایا جاتا لیکن زبان صحیح ہے۔ یہی حال ڈرامے، ناول اور مختصر فسانے اور دیگر اصناف نظم کا ہے ۔

ڈراما

صحیح زبان کی اہمیت بیان کرنے کے بعد میں ادب کے مختلف اصناف کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔ ادب میں سب سے زیادہ اہم۔ سب سے زیادہ بلند سب سے زیادہ مشکل صنعت ڈرامے کی ہے ۔ اُردو زبان کی تہی مائگی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی۔ کہ ادب کی صنعت اعلیٰ میں یہ زبان بالکل مفلس و نادار ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ ڈراما لکھنے والے بہت ہیں۔ حشر اور احسن اور محشر وغیرہ مشہور بھی ہیں۔ اور ان سب میں آغا حشر کا غلغلہ زیادہ بلند سُنا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ آج تک ادب اُردو میں ایک بھی ڈراما ایسا نہیں۔ جو ممالک مغربی کے ڈراموں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ میں حشر کے کمالِ ادبی کا بہت بڑا معترف ہوں۔ وہ نثر و نظم پر نہایت قادر اور ڈرامے کی خوبیوں کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ انھوں نے عوام کے مذاق کو صحیح راستے پر لانے کی بے انتہا کوشش کی ہے۔ اور اس لحاظ سے ڈراما کے متعلق اُردو میں اوّلیت کا سہرا انہی کے سر پر ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ ڈراما اور ناول خاص یورپ کی چیزیں ہیں۔ جب تک ہمارے ڈراما اور ناول لکھنے والے انگریزی ادب کو پوری طرح حاصل نہ کریں گے۔ اور اس کے تمام ڈراموں اور ناولوں کو اور ان کی تنقیدوں کو حصول

منفعت کی نظر سے نہ پڑھیں گے۔ اُردو میں ناول اور ڈراما کبھی فروغ نہیں پا سکتے جس طرح اُردو کے موجودہ علمی دَور کا احیاء چند ایسے بزرگوں کا ممنون احسان ہے جو انگریزی نہیں جانتے تھے۔ مثلاً سرسید احمد خان۔ خواجہ حالی۔ مولانا شبلی۔ مولانا نذیر احمد۔ اسی طرح اُردو کے ادبی احیا کا کام بھی پہلے پہلے انہی لوگوں کو کرنا پڑا۔ جو انگریزی سے بے بہرہ تھے۔ اور جن میں آغا محمد حشر کاشمیری بھی شامل ہیں۔

جو انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان اس صنف میں اُردو کی خدمت کا شوق اپنے سینوں میں رکھتے ہیں۔ انہیں چاہیئے۔ کہ پہلے صحیح زبان سیکھیں۔ اور اس کے بعد شکسپیئر کو کسی اچھے اور وسیع المنظر عالم پروفیسر سے پڑھیں۔ پھر اپنے طور پر ان کتابوں کا مطالعہ کریں۔ جو شکسپیئر کے نقادوں نے لکھی ہیں۔ پھر انگلستان کے بہترین ڈراما لکھنے والوں کی تصانیف کا مطالعہ کریں۔ اس کے بعد اچھے اچھے ڈراموں کا اُردو میں ترجمہ کریں۔ اگر یہ عمل کچھ مدت جاری رہا۔ تو ممکن ہے کہ اچھے ڈرامے تصنیف کرنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔

مختصر فسانے

ڈرامے کے بعد مختصر فسانوں کا درجہ ہے۔ ایک طول طویل ناول کی نسبت مختصر فسانہ لکھنا زیادہ مشکل ہے۔ یہ چیز بھی خالص مغربی ہے۔ مشرق میں یوں تو مختصر فسانے اور طویل فسانے داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا سبھی کچھ موجود ہے لیکن اہلِ مغرب نے ان اصناف ادب پر بہت عرق ریزی کی ہے۔ اور ان کو فی الحقیقت کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ہمیں یہ فن اُن سے سیکھنا چاہیئے۔ مقام مسرت ہے کہ مختصر فسانے لکھنے کا شوق روز بروز عام ہو رہا ہے۔ اور بعض بہت اچھے فسانہ نویس ہماری زبان میں پیدا ہو رہے ہیں۔ سید سجاد حیدر، نیاز فتحپوری، منشی پریم چند کے اسمائے گرامی اس قبیل میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک دفعہ مجھے "مختصر فسانے" کی تحریر کے متعلق علامہ اقبال سے گفتگو کرنے

کا اتفاق ہوا۔ علامہ موصوف نے دوران گفتگو میں فرمایا۔ کہ میں فسانہ نویس کو علم الکیمیا کے تجربات کرنے والے سے تشبیہ دیتا ہوں۔ جس طرح کیمسٹری کا ماہر مختلف چیزوں کو مختلف خیالات میں رکھکر ایک خاص چیز پیدا کر دیتا ہے۔ اسی طرح فسانہ نویس مختلف سیرت کے انسانوں کو مختلف حالات وکیفیات کے ماتحت رکھ کر ایسے نتائج پیدا کر دیتا ہے۔ جو ان افراد اور ان حالات کی یکجائی کی حالت میں ناگزیر ہوتے ہیں۔ علامہ ممدوح کی اس تشبیہ و تنظیر سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ جس طرح کیمسٹری کے کسی تجربہ میں اگر خواص یا عمل تجربہ میں ذرہ برابر غلطی رہ جائے۔ تو سارا تجربہ ناقص اور عمل بے سود رہ جاتا ہے۔ اور بعض اوقات سارا سامان تجربہ ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جاتا ہے۔ سی طرح فسانے کا حال ہے۔ اگر کسی رکن فسانہ کی سیرت لکھنے میں فسانہ نویس سے ذرہ بھی غلطی رہ جائے۔ یا حالات وکیفیات میں سے کوئی حالت یا کیفیت فطرت انسانی اور اصلیت واقعات سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو جائے۔ تو اس فسانے کو اہل نظر فسانہ نہیں کہیں گے خواہ اس میں دوسری ہزار خوبیاں بھی موجود ہوں۔

اس قسم کے ماہر فسانہ نگار بہت کم ہیں۔ اور فسانہ نگاری کے شوقین حضرات کو چاہیئے کہ مغربی فسانے زیر مطالعہ رکھیں۔ اور ان کی تنقید و انتقاد کے مضامین بھی ہمیشہ پڑھتے رہیں تاکہ ان کی طبیعت کو ایسے فسانوں سے مناسبت پیدا ہو جائے۔ اور جب وہ اپنے ملک اور اپنے تمدن کے حالات کے ماتحت کوئی فسانہ لکھنے بیٹھیں۔ تو جذبات نگاری یا واقعہ نویسی میں کہیں اُن کا قلم لغزش نہ کرے۔

طویل فسانے

مختصر فسانے کے بعد طویل فسانے یعنی ناول کا نمبر آتا ہے۔ اس کا حال بھی مختصر فسانے ہی کا سا ہے۔ لیکن اس میں فسانہ نگار کو طول مضمون کی وجہ سے ہر قسم کی گنجائش ہوتی ہے۔ اُردو میں یوں تو ناولوں کی کمی نہیں عام طور پر

کتب فروش ایک روپیہ میں ہزار صفحے کے حساب سے یوں تو ناول بیچ رہے ہیں۔ لیکن وہ ناول اُردو کی زندگی نہیں - بلکہ موت اور ہلاکت کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ عوام کو چاہیئے۔ کہ اُن سے سخت پرہیز کریں۔ اچھے ناول لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ جن کی تصانیف ہیں بہت امید افزا ہونہاری پائی جاتی ہے۔ مولانا عبدالحلیم شرر تاریخی فسانے لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ گو فسانہ نگاری کے فن کے اعتبار سے اُن کے فسانوں میں بعض فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں لیکن بہرحال اُن کا دم کا غنیمت ہے۔ رتن ناتھ سرشار مرزا محمد ہادی رسوا۔ منشی سجاد حسین اودھ پنچ والے سب کی یہی حالت ہے۔ اور ان سب میں میری رائے یہ ہے۔ کہ منشی سجاد حسین کے ناول - طرحدار لونڈی۔ پیاری دنیا۔ حاجی بغلول۔ اور احمق الذین فسانہ نگاری کے فن کے لحاظ سے بہت کامیاب افسانے ہیں۔ منشی صاحب نے جذبات بھی نہایت صحیح لکھے ہیں۔ اعلیٰ وادنیٰ طبقے کی زبان لکھنے میں پورا پورا کمال دکھا گئے ہیں۔ معاشرت کی صحیح تصویر پیش کرنے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ غرض آپ کی تصانیف ہر طرح اُردو کے لئے مایۂ ناز ہیں ؀

دہلی میں مولانا نذیر احمد صاحب مراۃ العروس نہایت عالی پایۂ افسانہ نویس گزرے ہیں۔ ان کے ناول بھی اُردو کے لئے ایک بہترین سرمایہ ہیں۔ مولانا راشد الخیری نے پہلے پہلے جو کتابیں لکھیں وہ بہت عمدہ تھیں اور آئندہ ترقی کا پتہ دیتی تھیں۔ لیکن آپ کی بعض تازہ تصانیف تو اس قدر حوصلہ شکن ہیں۔ کہ مولانا کی شان کے لائق نہیں ؀

بعض نئے مصنفین کی کتابیں بھی قابل غور ہیں جن میں ابن مسلم از سلطان حیدر جوش۔ نیلی چھتری۔ مسٹر ظفر عمر۔ نازاں حسن (منشی پریم چند) اچھی کتابیں ہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ کہ ناول بھی مغربی شے ہے۔ اس لئے لکھنے والوں کو چاہیئے کہ انگریزی فرانسیسی اور ترکی فسانوں کا مطالعہ کریں۔ اور اُن سے سیکھ

کر اپنی زبان میں لکھیں ٭

مستثنیات

ہماری زبان میں بعض نہایت عالی پایہ انشا پرداز موجود ہیں۔ جو ڈراما، ناول، مختصر فسانہ وغیرہ کسی قبیل میں نہیں۔ مثلاً پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں اور ہندوستان میں مولانا ابوالکلام ایسے بے پناہ انشا پرداز ہیں۔ کہ ان کی مثال دُنیائے اُردو شاید مدت تک پیدا نہ کر سکے۔ دہلی کے خواجہ حسن نظامی صاحب نے بھی اُردو میں ایک خاص انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ اور سادگی، صفائی اور سلاست سے اداے مطلب کرنے میں بے نظیر ہیں۔ زبان سیکھنے والوں کو خواجہ صاحب کی کتابیں خاص طور پر پڑھنی چاہئیں ٭

ادب کی نئی بیماری

آج کل ادبی رسالوں میں ایک نئی بیماری شروع ہوئی ہے۔ جسے نثر شاعری یا تخیل کی نثر کہتے ہیں۔ میں نثر شاعری کی اصل پر معترض نہیں۔ لیکن اس کی پامالی کا نوحہ خواں ضرور ہوں۔ یہ بیماری حقیقت میں ٹیگور کی غلط تقلید سے شروع ہوئی ہے۔ جس رسالے کو دیکھئے۔ دو چار مضامین نثر شاعری کے ضرور نظر آ جائیں گے۔ لیکن سب کی روش ایک ہی چلی جاتی ہے۔ "تو دوپٹہ اوڑھ رہی تھی۔ اور میں تجھے کوٹھے پر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ تیرے رخسار تابش حسن سے تمتا رہے تھے۔ اور میں دیکھ دیکھ کر مٹ رہا تھا۔ وقس علیٰ ہذا" اسی قسم کی بیہودہ اور لاحاصل تحریروں سے رسالوں کے صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں۔ اور کوئی جدت پیدا نہیں کی جاتی۔ ٹیگور کے تراجم میں خیالاتِ عالی بعض لکھنے والوں کو نظر آ جاتے ہیں۔ اور اس کی اندھا دھند تقلید کی جاتی ہے۔ حالانکہ اصل یہ ہے۔ کہ ٹیگور نے پہلے پہل وہ تمام چیزیں نظم میں لکھی تھیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ نثر میں

ہوا۔ لہذا اُردو والے بھی ان کا ترجمہ نثر ہی میں کرتے ہیں۔ اگر اس قسم کی نثر شاعری لکھنے والے حضرت ذرا سی وقت گوارا فرما کر ایسے خیالات کو نظم کر دیا کریں۔ تو اُردو نظم کے ذخیرے کا افلاس بہت جلد دُور ہو جائے ❊

نظم

نثر کی بحث ختم ہوئی۔ اب نظم کی طرف آیئے۔ علامہ اقبال نے اپنی حیات افروز شاعری سے شعر کی دنیا میں جو انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ وہ کسی سے مخفی نہیں۔ لیکن ان کی غلط تقلید نے بہت سے نوجوان شاعروں کی کاوشیں برباد اور عمریں تباہ کر دی ہیں ان کے نزدیک اقبال کی تقلید صرف اسی میں ہے۔ کہ چند فارسی کی ترکیبیں جمع کر کے ایک نظم تیار کر دی جائے۔ اس میں معنی نہ ہوں۔ اس میں شاعرانہ بلند خیالی یا فطرت کی صحیح مصوری نہ ہو۔ اس کی پروا نہیں۔ لیکن "شعر گفتن ضرور است"! ہر شاعر کو اپنا ایک خاص مذاقِ سخن قائم کرنا چاہیئے۔ اور "یک گیر محکم گیر" کے سنہری اصول پر کاربند ہو کر آخر تک اسی کو نباہنا اور اسی میں ترقی پیدا کرنا چاہیئے۔ خدا کے فضل سے ملک میں اچھے اچھے شاعر پیدا ہو رہے ہیں۔ مولانا اکبر مرحوم۔ اور علامہ اقبال کا کلام شعرا کا خضرِ راہ بننا چاہیئے۔ اور فن شعر کے طالبوں کو اُردو کے پُرانے شعرا کا کلام زیادہ تر زیر مطالعہ رکھنا چاہیئے۔ جذبات کے بیان۔ زبان کی درستی۔ حالات و کیفیات کی مصوری اور مناظر فطرت کی عکاسی میں لکھنؤ کے میر انیس مرحوم کے مرثیے اُردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ آج اگر دنیا میں بہترین شاعری میں اُردو شاعری کی طرف سے کوئی تحفہ پیش کرنا پڑے۔ تو ہم غالب و انیس اور اکبر و اقبال کو نہایت فخر و ناز سے پیش کر سکتے ہیں ❊

چونکہ غزل کی فرسودہ روش آج کل متروک ہوتی جاتی ہے۔ اور وسیع و بلند خیالات کی نظمیں لکھنے اور پڑھنے کا شوق روز افزوں ہو رہا ہے۔ اس لئے شعرا

کو چاہیئے۔ کہ اپنے کلام میں زور پیدا کرنے کے لئے شعرائے ایران و ہند کے کلام کو پیش نظر رکھیں۔ قومی نظموں سے جمہور کے دلوں کو گرمائیں۔ مناظر فطرت پر کوشش و کاوش سے اچھی نظمیں لکھیں۔ فلسفیانہ خیالات کو نظم کریں۔ غرض اردو شاعری کو ہر اعتبار سے تونگر کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ سکیں۔

عاشقانہ شاعری

بعض لوگ شاید اظہار اتقا کے طور پر یا اپنے علم و فضل اور جدت پسندی کے اعلان کی خاطر اکثر یہ کہا کرتے ہیں۔ کہ عاشقانہ شاعری کو ترک کر دینا چاہیئے۔ لیکن میں ان میں سے نہیں ہوں۔ عاشقانہ شاعری کو ترک کرنے کی کوشش میں خود شاعری متروک ہوئی جاتی ہے۔ کیونکہ عشق تمام جذبات پر حاوی ہونے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور شاعری صرف تصویر جذبات کا نام ہے۔ دنیا کی کوئی زبان عشقیہ شاعری کو ترک نہیں کر سکی۔ تو پھر اس خیال محال میں اردو والے کیوں اپنا سر کھپائیں۔ عشق قوموں کی زندگی ہے۔ کسی زبان میں عاشقانہ شاعری کا موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ قوم کی رگوں میں زندہ اور تازہ خون دوڑ رہا ہے کیونکہ جس قوم میں صحت اور خون گرم نہیں۔ وہ عشق کیا خاک کرے گی۔ البتہ میں اس امر کا مخالف ہوں۔ کہ عاشقانہ شاعری میں بزدلی نامردی کمزوری اور ضعف کے خیالات نظم کئے جائیں۔ اگر عاشقانہ شاعری میں شجاعت۔ بلند حوصلگی اور جوش حیات ظاہر کرنے والے جذبات عشق نظم کئے جائیں تو ان پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔ غزل کی پرانی فرسودہ روش فی الحقیقت ترک دینے کے قابل ہے۔ لیکن جو چیز صدیوں میں سرایت کر گئی ہو۔ اور کئی نسلوں سے قوم کے افراد کا شغل محبوب ہو۔ اس کو چھوڑنے کے لئے مدت چاہیئے۔ آج کل پرانے رنگ میں جلیل۔ ریاض۔ وغیرہ بہت اچھا کہنے والے ہیں۔ اور جدید طرز میں حسرت موہانی کی مثال نہیں لیکن غزل کا معیار اس سے بھی بلند ہونا چاہیئے۔ مرزا غالب اس کے لئے بہترین استاد

ہیں۔ ان کے کلام کو زیادہ تر پڑھنا اور ان سے کسب فیض کرنا چاہیئے۔

نظم معرّا

آخر میں مجھے نظم غیر مقفیٰ کے متعلق کچھ کہنا ہے جسے انگریزی والے "بلینک ورس" کے مناسب و موزوں نام سے یاد کرتے ہیں؟ اور اپنے قافیہ و ردیف کی وجہ سے اتنی دلفریبی اپنے اندر رکھتا ہے۔ کہ نثر سے بدرجہا زیادہ ممتاز سمجھا جاتا ہے اور اس کے مؤثر ہونے کا راز ہی مصرعوں کی اسی ہم آہنگی میں مضمر ہے۔ یورپ والے بھی "بلینک ورس" کے چنداں شوقین نہیں ہے شکسپیر نے اپنے بعض ڈرامے "نظم معرّا" میں لکھے ہیں۔ لیکن بعد میں اس روش کو نامقبول سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اردو میں مولانا شرر نے میوۂ تلخ اور شاید شہید وفا نظم معرّا میں لکھے ہیں۔ لیکن چلے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نظم مقفیٰ میں کوشش کرنے کے بجائے نظم معرّا میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ معرّا نظمیں اردو شاعری کے لئے کچھ مایۂ ناز ثابت نہیں ہونگی۔ مجھے یہ امر ناپسند ہے کہ ہم اپنی شاعری کے قیود کو اس قدر ناقابل برداشت سمجھیں۔ کہ ان کا جوا اپنے کندھے سے اتار پھینکیں۔ یہ حرکت آج تک کسی قوم نے نہیں کی۔ انگریزی شاعری کو شروع سے لیکر آخر تک دیکھ جائیے نظم معرّا نہایت خال خال نظر آئیگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طبائع انسانی جو ردیف و قافیہ کی دلفریبی کی خوگر ہو چکی ہیں۔ اس کو قبول نہیں کرتیں۔ اگر کسی کو اس کا ایسا ہی شوق لاحق ہو۔ تو میں یہ مشورہ دونگا۔ کہ قافیہ کو اڑا دینے سے جو آزادی شاعر کو مل جاتی ہے۔ اس سے اگر پورا پورا فائدہ نظم معرّا میں نہ اٹھایا گیا۔ اور اس کے اس نقص کو محاسن سے بالکل پوشیدہ نہ کر دیا گیا۔ تو نظم یقیناً ناکام رہیگی۔ اس لئے چاہیئے کہ پورے زور سے نظم لکھی جائے۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات موزوں سے موزوں الفاظ اور صحیح سے صحیح جذبات اس میں بھر دیئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قادر الکلامی ہر شاعر سے ممکن نہیں اگر یہ روش عام ہو گئی تو اکثر شعرا کی نظمیں ارباب مذاق کی محفلوں میں مضحکہ کا سرمایہ بن جائینگی۔ اور حاصل کچھ نہ ہوگا۔

حصہ نظم میں شامل غزلیات

ڈاکٹر محمد دین تاثیر

پاکستان کے ایک بلند پایہ ادیب اور اچھے شاعر تھے لاہور سے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ولایت سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لائے۔ تو امرتسر ایم۔ اے۔ او کالج اور بعد میں پرنس ویلز کالج جموں کے پرنسپل رہے۔ آخری عمر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ ۱۹۵۰ء میں رحلت فرمائی۔

انہوں نے اپنی ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں بسر کر دی۔ ملک کے تمام بلند پایہ ادبی رسائل مرحوم کے اعلیٰ علمی و ادبی مضامین نظم و نثر سے زینت پاتے رہے۔

اُردو شاعری کا ابتدائی دَور

اردو شاعری کی ابتدا دو رو شوں پر ہوئی۔ ایک طرف تو فارسیت کا زور تھا اور دوسری طرف ہندیت کا۔ فارسیت کا زور شمالی ہند میں تھا۔ کیونکہ شمالی ہند میں سرکاری درباری اور اہلِ ثروت کی علمی زبان فارسی تھی۔ اور ولایت سے لوگوں کی آمد و رفت بکثرت تھی۔

اگر خسرو کے "اُردو" اشعار میں پورے مصرعے اُردو کے تھے تو اس کی وجہ یہ بھی قرار دی جاسکتی ہے کہ اس وقت اُردو برائے نام بھی رائج نہ تھی۔ مگر مولوی غلام فطرت کا عہد تو ٹکسالی اُردو کا عہد ہے۔ ان کے اشعار میرزا غالب کے بیدلی دَور سے متشابہ ہیں۔ کہتے ہیں

از زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے
در گلشنِ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

اس شعر کی ساخت خالص فارسی ہے۔

اس کے برعکس دکنی شاعری کے مزاج میں ہندیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کیونکہ دکن کی سرکاری درباری زبان مقامی تھی۔ دکنی اُردو تھی اور دکنی بادشاہ صاحب دیوان تھے۔ تشبیہات، تخیل طرزِ ادا سب میں ہندیت کے اثرات نمایاں تھے۔ یہاں تک کہ ہندی کی طرح اظہارِ عشق عورت کی زبان سے ہوتا تھا۔ اس ہندی انداز سے دھوکا کھا کر "دکن میں اُردو" کے مصنّف نے لکھا ہے کہ ہاشمی بیجاپوری ریختی کا موجد ہے۔ ہاشمی کا یہ شعر مشہور ہے ؎

سجن آدیں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کر کے موتی کا پرونے ہار بیٹھوں گی

ہاشمی (سید میراں) کا سن وفات ۱۱۰۹ھ ہجری ہے۔ وجہی اس سے پہلے گزرا ہے۔ گولکنڈے کا رہنے والا ابراہیم قطب شاہ کا درباری اور "قطب مشتری" اور "سب رس" کا مشہور مصنف ہے۔ اس کا بھی یہی انداز ہے ؎

کھانا برہ کھاتی ہوں میں پانی انجھوں پیتی ہوں میں
رنج تے بچھڑ جیتی ہوں میں کیا سخت ہے دل لے پیا

اس ہندیت اور فارسیت کے درمیان آہستہ آہستہ ایک وسطی راستہ پیدا ہوا۔ یہ ایک نیا ادبی مزاج تھا۔ اور یہی اردو شاعری کا مخصوص طرز ہے۔ اس میں عجمیت کا عنصر غالب ہے۔ لیکن یہ خالص فارسیت نہیں۔ اس میں شعریت کا اثر بھی ہے لیکن یہ ہندی نہیں۔ اس میں اسلامی روایات کا زور ہے۔ لیکن اس دور میں اگر تہذیب تھی تو وہ اسلامی روایات میں رنگی ہوئی تھی۔ ہندوؤں نے اسے قبول کیا۔ مسلمانوں نے اسے چمکایا۔ کیونکہ اسلامی روایات تمدنی اعتبار سے زیادہ زوردار تھیں۔ زیادہ مہذب تھیں۔ جب ہندوؤں میں انگریزوں کی انگیخت سے فرقہ وارانہ قومیت کا جذبہ تیز ہوا۔ تو انہوں نے ان مہذب روایات سے کنارہ کشی شروع کردی۔ انگریزیت کو اختیار کرلیا اور اُردو زبان تک کو اسلامی قرار دے کر مردود قرار دیا۔ اس رویّے سے مسلمانوں میں بھی ردِ عمل پیدا ہوا۔ آخر کار دُودھ پانی الگ الگ ہو گئے۔

مدعا یہ کہ اُردو شاعری کا مزاج فارسیت سے اور ہندیت سے مختلف ہے۔ اس میں اپنی مخصوص انفرادیت پائی جاتی ہے۔ یہ "اُردوپنا" دہلی سے لازم ملزوم ہے۔ دلّی دکنی دلّی ضرور آیا۔ لیکن دکن میں اس سے پہلے ہندیت کا زور کم ہو رہا تھا اور خود دہلی کے شعرا میں ہندیت کے آثار نظر آ رہے تھے

دکن کے باشندے عارف الدین عاجز کا کلام دیکھئے۔ ہندیت سے کس

صا ۔ آنسو مطابق پنجابی۔

قدر پاک ہے۔ ؎

سجن کا تبسم، سجن کا تکلم، سجن کی ادائیں، سجن کی یہ قامت!
ہے فردوس غنچہ، ہے بارغ فصاحت، سراپا لطافت، قیامت قیامت
سجن کی جبین پہ سجن کے رُخ اوپر، سجن کی بھوال پر سجن کی کمر پہ
ہے زہرہ تصدق، ہے خورشید مائل، ہیں نو ریاں کمائیں، فدا ہے نزاکت
ہماری زبان ہے ہمارا سخن ہے، ہمارا قسلم ہے، ہمارا رقم ہے
ثنا خوانِ بلبل، معانی کا گلشن، نہال مقطع، مرصع زراعت؟

ایک غزل کے اشعار ہیں ؎

شوخ مسجد کو چلا، شیخ شتابی چھپ جا
دیکھ ہووے گی ترے دیں کی خرابی چھپ جا
غضب آج خرابات میں آنا ہے خراب
دخترِ رز کو بغل مار شتابی چھپ جا

ایک اور شعر ہے ؎

بڑا پگڑ ہے، بڑا شملہ، بڑا کلاہ، بڑا ادھاڑا
بڑھایا ہے بڑی محنت سے زاہد نے وقار اپنا

اگر یہ دکن کا انداز ہے تو دہلی والے یوں شعر کہہ رہے تھے۔
شاہ مبارک یعنی نجم الدین آبرو کا شعر ہے ؎

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے
کہ اس ظالم کی ہم پر جو گھڑی بیتی سو جگ بیتا

اور یہ کہ ؎

نین سے نین جب ملائے گیا
دل کے اندر میرے سمائے گیا

وہی نین اور سجن کی باتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن جب اُردو شاعری پیرزادوں

اور صوفیا سے گزر کر امرا کے ہاں پہنچی۔ تو اس کا انداز بدلنے لگا۔ اس میں واردات عشق کے ساتھ ساتھ روزمرے کی چوٹ بڑھنے لگی۔ شجاع الدولہ نواب اودھ کے بیٹے یحییٰ خاں آصف، جو آصف الدولہ آصف جاہ، بہرجنگ وغیرہ کہلاتے تھے۔ اردو کے دو دیوانوں کے شاعر ہیں۔ شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں فیض آباد میں وزارت کرتے تھے۔ غزل کی زبان ایسی ہے جیسی آجکل بولی جاتی ہے ؎

یا ڈر مجھے تیرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
یا حوصلہ میرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہتا ہے بہت کچھ وہ مجھے چپکے ہی چپکے
ظاہر میں یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اسی زمین میں بہادر شاہ ظفر نے بھی غزل کہی ہے۔ یہی لہجہ ہے۔ اس کی ایک اور غزل ہے۔ مطلع ہے ؎

جو جلوہ صنم تجھ میں ہم دیکھتے ہیں
خدا کی خدائی میں کم دیکھتے ہیں

اسی زمین میں غالب کی غزل بھی ہے۔ ایک مطلع ہے ؎

سرخ چشم ایسی کہیں ہوتی ہے بیداری سے
لہو اترتا ہے تیری آنکھ میں میخواری سے

ایک اور رئیس زادے اشرف علی فغاں تھے۔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکا اسی عہد کے ہیں۔ ان کے ہاں بھی وہی واقعیت اور روزمرہ کا لطف ہے ؎

اس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گذر گئی
دیکھا تو ہنس دیا جو نہ دیکھا تو رو دیا
کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنا نہیں
خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

اس کا ایک مطلع ہے جس پہ میر تقی نے ہاتھ مارا ہے۔ اور ایسا ہاتھ مارا ہے کہ مضمون اپنا بنالیا ہے۔ فغاںؔ کا شعر ہے

~ یہ امتحان نہ کر اے میرے مہربان عزیز
جہاں میں کوئی بھی تجھ سے رکھے گا جان عزیز

میرؔ کا شعر مشہور ہے ~

کیا فائدہ ہے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

فغاںؔ کا ایک اور شعر ہے ~

کہتا ہے یہ بہشت میں مستوں کی جا نہیں
زاہد کا کیا خدا ہے ہمارا خدا نہیں

ایک اور مطلع ہے ~

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں
لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

آج کل کے انداز کی غزل ہے کہ ~

صنم کہنے سے کیا خوش ہو وہ کافر
خدائی کا تصور بندھ رہا ہے
فغاںؔ کو وصل میں آرام کیا ہو!
جدائی کا تصور بندھ رہا ہے

ایک اور مطلع ہے ~

عشاق تیرے گرمیٔ بازار کر گئے!
اس جنس کو گراں یہ خریدار کر گئے

اور ~

مجھ سے جو پوچھئے تو بہرحال شکر ہے

یوں بھی گزر گئی مری وُوں بھی گذر گئی!

حسرت، مظہر جانِ جاناں، یقین جس کا بھی کلام دیکھئے۔ بولی سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آجکل کے لوگ ہیں۔

غرض اُردو شاعری کا مزاج اس ابتدائی دَور ہی میں قائم ہوگیا تھا۔ ہندیت اور فارسیت سے الگ ایک نیا راستہ نکل آیا تھا۔

یہ شاعری عوام کی شاعری بھی تھی اور خواص کی بھی، کیونکہ یہ اپنے وقت کی تہذیب کی آئینہ دار تھی۔ یہ وہ تہذیب تھی جس کے آج ہم وارث ہیں۔ نئے حالات نے نئے انداز پیدا کر دیئے ہیں۔ لیکن نئے راستے اسی پرانی شاہراہ سے نکلتے ہیں۔ اس شاہراہ سے پیوستہ رہ کر ہی ہم ادب کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

تاثیر

سر عبد القادر

سر شیخ عبد القادر صاحب ۱۸۷۴ء میں بمقام لدھیانہ پیدا ہوئے فورمین کرسچین کالج سے بی۔اے کر لینے کے بعد اخبار آبزرور اور رسالہ مخزن کے ایڈیٹر رہے ۱۹۰۷ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا ۱۹۲۱ء میں پنجاب ہائیکورٹ کے جج بنائے گئے ۱۹۲۳ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے ۱۹۲۵ء میں پنجاب کے وزیر تعلیم بنائے گئے۔ ۱۹۲۶ء میں مجلس بین الاقوام کے ساتویں اجلاس میں جو جنیوا میں ہوا تھا، ہندوستان کی طرف سے بحیثیت ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ واپسی پر لاہور ہائیکورٹ کے مستقل جج بنائے گئے۔ پھر انڈیا کونسل کے رکن رہے۔ اور ریٹائر ہونے سے پہلے چند ماہ گورنمنٹ ہند کے لا ممبر بھی رہے۔ شیخ صاحب اردو ادب کے محسنوں میں سے تھے۔ آپ کی تحریر میں حلاوت اور زور کے علاوہ صفائی اور خیالات میں بلندی ہے۔ آپ نے اپنے دو سفرنامے مرتب کیے۔ جو سفرنامہ یورپ اور دربار خلافت کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۵۰ء میں لاہور میں ہوا۔

Child marriage is a [illegible]

پنجاب میں اُردو

ادب اُردو کی تاریخ جب کبھی لکھی جائے گی۔ اس میں پنجاب کی خدمات کا باب دیدنی ہوگا۔ ہرچند کہ اردو پنجاب کی مادری زبان نہ تھی۔ مگر پنجاب کو ماں کے دودھ کی طرح راس آئی۔ اور اس نے پنجاب میں وہ فروغ پایا کہ باید وشاید۔ اس ترقی کے کئی سبب ہوئے۔ ایک بڑی چیز جو اس زبان کے پنجاب میں رواج پانے کا باعث ہوئی۔ وہ یہ تھی کہ جب دہلی جو اُردو کا مرکز تھا۔ غدر کی مصیبت کے زمانے میں اُجڑا۔ اور اس کے اہل کمال ادھر اُدھر منتشر ہوئے۔ تو اتفاقات زمانہ سے چند باکمال لاہور اور پنجاب کے حصہ میں بھی آئے۔ ان سب میں جس شخص کا نام ادب اردو کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے لائق ہے وہ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم تھے۔ وہ پنجاب میں آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ دہلی کے دلدادہ اور زبانِ دہلی کے عاشق اور شیدائی تھے یہاں لاہور میں یونیورسٹی کی بنیاد قائم ہوئی تو وہ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ سینکڑوں تعلیم یافتہ نوجوان ان کے زیرِ اثر آئے اور ہر ایک کے دل میں ان کی بدولت اُردو کی محبت اور اُردو کا مذاق پیدا ہو گیا۔

ہر اک کو مستعار دلِ مبتلا دیا
یوں ہم نے اک زمانہ کو عاشق بنا دیا

انہوں نے بعض درسی کتابیں سرکاری مدارس کے لئے آسان مگر دل آویز طرز میں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں اور جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مذاق طلبہ کے اعلیٰ طبقہ میں ان کے فیض صحبت سے پیدا ہوا تھا وہ ابتدائی

درجوں میں بھی اُن درسی کتابوں کی بدولت کم و بیش پھیل گیا۔ مولانا آزاد مرحوم کا ذکر تو میں نے خصوصیت سے اس واسطے کیا ہے کہ انہیں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ورنہ اصلیت یہ ہے کہ ایسے دہلوی اصحاب کی تعداد بہت بڑی ہے۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً پنجاب میں زبان اُردو کی اشاعت میں شرکت کی ہے اور جن کی خدمات کا یہ صوبہ زیر بار احسان ہے۔ ان سب کے نام تو اس مختصر مضمون میں لکھنے ممکن نہیں۔ مگر مرزا عبدالغنی صاحب ارشد گورگانی کا نام بے ساختہ زبانِ قلم سے نکلتا ہے وہ بھی جب پنجاب میں آئے۔ یہیں رہے۔ انہیں بھی محکمۂ تعلیم سے تعلق تھا اور بے شمار شاگرد اُن سے فیض یاب ہوئے۔ اُن کا کلام زیادہ تر منظوم ہے۔ اور اُن میں یہ خصوصیت تھی کہ وہ اپنا کلام بڑے بڑے جلسوں اور مجمعوں میں خود پڑھ کر سُناتے تھے اور اپنے زورِ کلام اور پڑھنے کی استادانہ طرز کی بدولت سامعین پر چھا جاتے تھے۔ جس سے سننے والوں کے دلوں میں اُردو کے پڑھنے اور سُننے کا شوق پیدا ہوتا تھا۔ یہ دو مثالاً نام میں نے نمونہ کے طور پر اپنے مطلب کو واضح کرنے کے لئے لکھے ہیں۔ ورنہ اُن صاحبانِ کمال کی فہرست بہت لمبی ہے جنہوں نے اُردو کو پنجاب میں اس کثرت سے پھیلا دیا۔ اُن میں نہ صرف دہلی کے مصنفین شامل ہیں۔ بلکہ لکھنؤ اور دیگر اضلاع صوبجات متحدہ کے رہنے والے بھی شریک ہیں مگر ان حضرات نے جو کچھ کیا وہ اس مقصود کو سامنے رکھ کر نہیں کیا۔ کہ اردو کو اپنے گھر سے نکلنے کے بعد پنجاب میں ایک نیا گھر مل جائے وہ اُردو بولتے تھے کیونکہ وہ ان کی پیاری زبان تھی۔ وہ شعر کہتے تھے۔ کیونکہ دہلی کے دورِ آخر کی صحبتیں ابھی اُن کی آنکھوں میں پھرتی تھیں۔ اور انہوں نے بڑے بڑے نامور استادوں کے زیرِ سایہ مشقِ سخن بہم پہنچائی تھی۔ پس وہ جو کچھ کرتے تھے اور کہتے تھے۔ وہ اُن کا قدرتی میلانِ طبع تھا۔ تعجب ہے تو

اس بات کا کہ پنجاب نے اُردو کو اس سرعت کے ساتھ اور اس قدر شوق سے کس طرح قبول کیا۔ جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں اس میں ان بلند پایہ اصحاب کا شخصی اثر ضرور شامل تھا۔ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مگر پنجاب کے خاص حالات کو بھی اس میں کچھ کم دخل نہ تھا۔ اوّل تو پنجاب کی اپنی زبان اُردو سے بہت ملتی جلتی تھی۔ یہ دونوں گویا ماں جائی بہنیں تھیں جو مدت سے بچھڑی ہوئی تھیں اور اب آ ملیں ایک بہن کی بولی شہروں میں رہتے ہوئے نکھر گئی تھی۔ اور دوسری دیہات میں رہنے سے اپنا لب ولہجہ بدل چکی تھی۔ لیکن ملنے کی دیر تھی کہ ایک نے دوسرے کو پہچان لیا اور گلے مل گئیں ایسی کہ پھر جدا نہ ہوئیں۔ بے شمار لفظ اور محاورے ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ اور جسے شوق ہو وہ اس تلاش کو نہایت دلچسپ پائے گا۔ مگر اس وقت مثال کے طور پر چند لفظوں کا مقابلہ کافی ہو گا۔ ذرا غور سے اُوپر کی چند سطروں کو ہی دیکھئے۔ کیا نظر آتا ہے:-

اُردو یا ہندوستانی	پنجابی
ملتی جلتی	ملدی جلدی
ماں جائی	ماں جائی
بچھڑی	وِچھڑی
آ ملیں	آن ملیاں
نکھر	نکھر
مل گئیں	مل گیئاں
نہ ہوئیں	نہ ہوئیاں
اوپر	اُپر - یا اُتے

دیکھئے دونوں کے خدوخال کیسے ملتے ہوئے ہیں کہ دیکھنے والا فوراً کہے کہ ایک ماں کی بیٹیاں ہیں اور وہ بھی ایک دوسرے کو محبت کی نگاہوں

سے دیکھنی اور پہچانی نظر آتی ہیں۔

پس سب سے زیادہ آسانی تو اُردو کے رواج پانے میں اس قدرتی یگانگت اور مناسبت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ورنہ جو بیج دہلی کے باغبانوں نے بویا تھا۔ وہ کسی دوسری زمین میں اس حد تک کامیاب نہ ہوتا۔

اُردو نے گو ہندی کی گود میں جنم لیا تھا۔ مگر پرورش فارسی کے آغوش میں پائی تھی۔ ممکن تھا کہ اگر پنجاب کو فارسی سے کوئی تعلق نہ ہوتا تو اُردو کو پنجاب کی ہوا ایسی موافق نہ آتی۔ مگر پنجاب کو فارسی سے بھی بہت تعلق تھا پُرانے شاہی زمانوں میں فارسی ہندوستان کے بیشتر حصوں میں بطور دفتری زبان کے اسی طرح مروّج تھی جیسے اب انگریزی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور اتفاق سے پنجاب میں باوجودیکہ انگریزی عملداری سے پہلے سکھوں کا راج تھا۔ مگر دفتری زبان اپنی پہلی حالت پر قائم تھی۔ اور سب اہلِ قلم اور اہلِ کار خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان فارسی نوشت و خواند سے واقف تھے۔ اُردو میں جو فارسی الفاظ کی آمیزش تھی۔ اس کو یہاں کسی نے مغائرت کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ بلکہ پنجابیوں کی فارسی دانی انہیں اُردو کے جلد سیکھنے میں ممد ہوئی۔ صُوبہ پنجاب کا سرحدی ممالک یعنی افغانستان اور ایران سے نسبتاً قریب ہونا اور اُدھر کے لوگوں کی آمد و رفت اِدھر زیادہ ہونا بھی پنجاب میں فارسی کے رواج کا ایک سبب تھا اور اس طرح فارسی سے مناسبت اُردو سے مناسبت کا سبب ہوئی ان قدرتی اسباب پر یہ اضافہ ہوا۔ کہ انگریزی راج کے آنے پر فارسی کی جگہ عدالتوں میں اُردو کو جاری کیا گیا۔ اور مدارس میں اُردو کی کتابیں پڑھائی جانے لگیں۔ اور اُردو کا رواج روز بروز بڑھنے لگا۔ مگر سب سے زیادہ ترقی اُردو کو اخبارات کی بدولت ہُوئی۔ پنجاب میں جو قومیں آباد ہیں ان میں سے اکثر جسمانی قوائے کے لحاظ سے ہندوستان کی مضبوط ترین قوموں میں شمار ہوتی ہیں اور

اس سبب سے اُن میں قوتِ عمل بیں دوسروں سے کچھ بہتر ہے۔ یہاں کے لوگوں کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کسی کام کی طرف نہ متوجہ ہوں تو نہ ہوں۔ لیکن اگر اس کی طرف مائل ہو جائیں تو اسے بہت جوش اور سرگرمی سے کرتے ہیں۔ چنانچہ جب تک تعلیم کا یہاں چرچا نہ تھا۔ تو یہ پڑھنے لکھنے میں اور صوبوں سے بہت پیچھے تھے۔ مگر جب سے اس طرف ان کا خیال ہُوا ہے انہوں نے تھوڑے عرصے میں خاصی رفتارِ ترقی دکھائی ہے۔ تعلیم کا چرچا ہوتے ہی اردو اخبارات جابجا نکلنے لگے۔ یہاں تک کہ اس وقت یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو زبان کے جتنے اخبار اس صوبہ میں چھپتے ہیں کسی اور صوبہ میں نہیں چھپتے۔ اور اُن میں سے اکثر صرف لاہور سے نکلتے ہیں۔ جو پنجاب کی سب تحریکوں کا صدر مقام ہے۔ اخبارات کے علاوہ موقت رسالے بھی جس کثرت سے لاہور میں شائع ہوتے ہیں اور ہوتے رہے ہیں۔ اس کی مثال بھی کسی دوسرے شہر میں موجود نہیں۔ یہ موقت رسالے زبان کی ادبی ترقی کے لئے اخبارات سے بڑھ کر مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اخبارات کا یہ نتیجہ ہوا کہ جابجا اُردو کا چرچا ہو گیا۔ اور شہروں کے کوچوں سے قدم نکال کر اُردو دیہات کی گلیوں تک پہنچ گئی۔ مگر زبان کی عمدگی اور سلاست اور درستی اور صفائی کو اخبارات ملحوظ نہ رکھ سکے۔ ایک تو اس سبب سے کہ اُن کے لکھنے والوں میں جہاں بعض اعلےٰ درجہ کے لئیق اشخاص تھے۔ وہاں بہت سے معمولی تعلیم کے لوگ تھے۔ جو الفاظ و محاورات کی صحت کا لحاظ رکھنے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں خبریں بہم پہنچانا اور اپنے اپنے خیال کے مطابق سیاسی رائیں ظاہر کرنا منظور تھا اور زبان کی خوبی ان کے خیال میں چنداں قابلِ توجہ نہ تھی۔ دوسرے اخبارات میں جو کچھ لکھا یا چھاپا جاتا ہے۔ اس میں بسا اوقات ایسی عجلت ہوتی ہے کہ عبارت کی چستی یا سُستی کی پروا کرنے کا موقع نہیں ہوتا اور نہ لفظوں

کی طرف دھیان ہوتا ہے ۔ اخبار کے نامہ نگاروں اور ترتیب دینے والوں کو اپنے روزانہ کام سے کام ہوتا ہے ۔ اور بس ۔ برعکس اس کے رسالے خاص ادبی خدمت کے لئے ہوتے ہیں اور انہیں ایسے لکھنے والوں کی تلاش ہوتی ہے جو مضمون نگاری میں خاص مہارت رکھتے ہوں اور کچھ نام ملک میں پیدا کر چکے ہوں ۔ ان لکھنے والوں کو بھی علیٰ قدر مراتب اپنی شہرت قائم رکھنے کا خیال ہوتا ہے اور رسالوں کے ایڈیٹروں کو ضروری اصلاح مضامین و صحت زبان کے لئے کافی وقت ملتا ہے ۔ اس لئے رسالے خاص طور پر ادبی ترقی کے لئے فائدہ مند ہوتے ہیں ۔ مجھے اس سے بہت مسرت ہوئی کہ میرے دوست میاں بشیر احمد صاحب بی ۔ اے بیرسٹر ایٹ لا خلف الرشید میاں محمد شاہ دین صاحب بی' اے ۔ مرحوم سابق جج چیف کورٹ پنجاب نے اپنے والد ماجد کے علمی کاموں کی یادگار کے طور پر ایک ماہوار رسالہ جاری کر کے پنجاب کے نامور ادبی رسالوں میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے ۔ میاں محمد شاہ دین مرحوم ہمایوں تخلص کرتے تھے اور باوجود کثرت مشاغل کے اردو نظم کے لئے کچھ وقت نکال لیا کرتے تھے اور ان کے اشعار پُرلطف ہونے کے ساتھ پُرمغز ہوتے تھے ۔ اس لئے اس رسالہ کا نام ہمایوں رکھا گیا ہے ۔ جو نہایت موزوں ہے ۔ ہم اس رسالہ کے لئے درازی عمر کی دعا کرتے ہیں ۔ تاکہ یہ دیر تک اردو زبان اور ادب اردو کو فائدہ پہنچاتے ۔ اور پنجاب اپنی بساط کے مطابق جو مدد اردو زبان کی ترقی کے کام میں آج تک دیتا رہا ہے اس کی رفتار کو تیز تر کر دے ۔ میاں بشیر احمد کا مذاق علمی ہے جو انہیں اپنے والد مرحوم سے وراثتاً پہنچا ہے ۔ ان کی تعلیم جو مغربی و مشرقی مذاق کی جامع ہے اور ان کا شوق اور تلاش جس نے اس پہلے پرچہ میں ہی ہندوستان کے ہر حصے سے مشہور صاحبان فن کے مضامین نظم و نثر جمع کر دیئے ہیں اس رسالہ کی کامیابی کے لئے نہایت اُمید افزا ہیں ۔ اور اس کام میں ان کے ساتھ مولانا تاجور جیسے فاضل اور مشاق ادیب کی شرکت اس کی عمدگی کی کافی ضمانت ہے ۔

مرزا عظیم بیگ چغتائی

مرزا عظیم بیگ چغتائی - بی - اے - ایل - ایل بی تا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ مشہور مزاح نگار ادیبوں میں سے تھے۔ ان کے افسانوں کی دلچسپی زیادہ تر ان کے طرز بیان اور سلاست زبان میں ہے۔ بعض بعض افسانوں میں اصلاحی رنگ جھلکتا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے افسانے یا ناول کے لئے ایسے واقعات انتخاب کرتے ہیں جو اوّل تا آخر پڑھنے والوں کو ہنساتے چلے جائیں اور ان واقعات کو بے ساختگی اور بھونڈے پن کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔

میں نے پڑھا

(۱)

کتب خانے کی پُرسکون فضا میں جو مختصر لمحے گزرتے ہیں، میرے لئے وہ نپولین اور سکندر اعظم کی تمنائے زندگی کی صدیوں سے زیادہ بیش بہا اور قابل قدر ہیں۔ دائیں بائیں آگے پیچھے اور ارد گرد مجلد اور منقش خزانہ انبار در انبار چُنا ہوتا ہے۔ اس پر کتب خانہ کا سکوت نیم شبی سناٹے کو مات کرتا ہے اور میں بھی سمجھتا ہُوں کہ الہ دین کی غار میں ہوں اور ہر چہار طرف زر و جواہر کے انبار ہیں۔ سب میرے اور ذاتی تصرف کے لئے۔

میں ایک دلچسپ کتاب ہاتھ میں لئے دنیا مافیہا کے تفکّرات سے بے نیاز ہوکر گویا جنت الفردوس میں تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا۔ کہ زندگی ایک دلچسپ شیریں خواب ہے کہ اتنے میں کسی صاحب نے دھماکے کے ساتھ اپنا منحوس قدم دروازے میں دھمک کر کہا۔ "کوئی ہے"؟ میرے سر پر بجلی سی لگی۔ میں نے ایک دم اپنا سر پکڑ لیا۔ اور کتاب میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

"کوئی اخبار وخبار نہیں ہے .... ہم ... ں ۔ ں ..... اتنا کہا اور لپک کر انہوں نے اپنی انگریزی ٹوپی پٹک دی۔ اور پھر عجیب کھر بڑ شروع کی۔ لمبی چوڑی میز پر نظر دوڑا کر ایک دم سے اخباروں کو اٹھا اٹھا کر پٹکنا اور پھینکنا شروع کیا۔ اس قدر تیزی سے ورق الٹنے شروع کئے کہ ایک شور بے ہنگام بپا ہوگیا۔ کوئی دس منٹ تک ان کی یہ اخبار بینی جاری رہی اتنے میں لائبریرین صاحب آگئے تو یہ بولے۔ "کوئی نیا اخبار نہیں آیا؟"

"سب تازہ اخبار تو آپ کے سامنے چُنے ہوئے ہیں"۔ لائبریرین نے کہا۔
"فہرست بھی آج کی سامنے آویزاں ہے کہ کون کون سے اخبار موجود ہیں۔ آپ نے دیکھی نہیں ہے"

"اچھا" انھوں نے کہا اور فہرست جو دیوار پر آویزاں تھی۔ اُس کو غور سے کھڑے ہو کر پڑھنے لگے۔

"اچھا تو یہ سب اخبار موجود ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے میز پر بڑھے اور اب تصدیق کی۔ "کیا واہیات ہے" لائبریرین صاحب کو مخاطب ہو کر بولے "لائبریری کی یہ بدتمیزی نہ گئی کہ تمام اخبار سپینٹ کر رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ دیکھئے کوئی احمق "لیڈر" کے صفحے باؤ نبریں ملا گیا ہے۔ یہ دیکھئے پھر پُرانے اخبارات کی موجودگی میز پر کچھ سمجھ نہیں آتی۔ خواہ مخواہ پڑھنے والوں کو پریشان کرنے کے لئے۔

لائبریرین نے مؤدبانہ عرض کی "جناب صرف ایک روز قبل کے پرانے اخبار لازمی رکھے جاتے ہیں۔ وہ دوسری لائن میں ہوتے ہیں۔ مگر صاحب میں کیا کروں کوئی بدتمیز آیا اور تمام میز کریدکر ڈال گیا۔ ابھی ابھی تو میں قرینے سے جما کر گیا ہوں"۔ شاید ان حضرت کو اب پتہ چلا کہ وہ "بدتمیز" شخص جو اس بدعت کا ذمہ دار تھا۔ سوائے اُن کے کوئی دوسرا نہ تھا۔

اخباروں پر سرسری نظر ڈال کر اور دو ایک کو جو خود انھوں نے تتر بتر کر دیے تھے۔ قرینے سے جما کر لائبریرین سے بولے "کوئی عمدہ کتاب نکلوا دیجئے"۔ گویا اخبار بینی کر چکے۔

"بہت بہتر۔ فرمائیے کون سی؟"

"کوئی اُردو کی ہو۔ نہیں خیر انگریزی کی سہی"۔

" لائبریرین نے کتابوں کی فہرست سامنے کر دی اور یہ حضرت کتاب پسند کرنے میں مشغول ہو گئے۔

میرے پراگندہ دماغ کو قدرے سکون ملا۔ جب یہ حضرت لائبریرین سے کتاب لینے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے کتاب دوبارہ اٹھائی۔ عبارت تلاش کی۔ دماغ میں سلسلہ مضمون کو دوبارہ قائم کیا۔ اور خیالات کو ایک مرکز پر لاکر میں پھر کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔

وہ حضرت آئے۔ اور مجھ سے کوئی پانچ چھ قدم پر ایک صوفے پر تکیہ لگاکر میری طرف پشت کرکے بیٹھ گئے۔ اور ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ مگر یہ حضرت نہایت ہی خلیق اور ملنسار معلوم ہوتے تھے۔ کوئی بیس منٹ تک تو کتاب پڑھتے رہے۔ پھر دور سے کھنکار کر میری طرف دیکھا۔ نظر چار ہوتے ہی عجیب حیرت و استعجاب سے بولے "کمال کر دیا ہے۔"

میں نے اُن کی بات سے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اور کچھ نہ بولا تو بولے "تاج محل ... عجیب وغریب عمارت ہے۔ استاد عیسٰے نے بنایا ہے۔ واللہ اب تک میں یہی جانتا تھا کہ نقشہ اس کا ایک اٹلی کے رہنے والے نے بنایا ہے"۔

"جی ہاں" میں نے کہا اور گفتگو کو ختم کرنے کی نیت سے فوراً ہی اپنی کتاب پر پھر نظر جمالی۔ کیونکہ میں کتاب کے نہایت دلچسپ مقام پر پہنچ گیا تھا اور کسی کا مخل ہونا مجھے ذرہ بھر گوارا نہ تھا۔ مگر پانچ منٹ بعد وہ اُچک کر بولے "یہ دیکھئے خود دوسرے منصف مزاج مورخوں کے اقوال سے مصنف ثابت کرتا اور ....."

"جی ہاں" میں نے کہا۔ "میں نے پڑھا ہے۔ پوری کتاب میں نے پڑھی ہے" وہ پھر پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ اور میں بھی مشغول ہوگیا۔ مگر دس منٹ بعد وہ پھر پڑھتے پڑھتے اچھل پڑے۔ کیا کہنا ہے۔ مصنف کی قابلیت کا چودہ مستند حوالے۔ ذرا غور تو فرمائیے۔" "میں نے پڑھا ہے۔" میں نے تنگ آکر کہا۔

"مگر یہ سب . . ."

"میں نے پڑھا ہے۔" میں نے کل کتاب پڑھی ہے۔" یہ کہہ کر میں اندازِ بے نیازی کے ساتھ کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ مگر دس منٹ مشکل سے گزرے ہوں گے کہ انھوں نے بے تاب ہو کر مجھ سے کہا۔ "یعنی یہ دیکھئے کہ . . . . ."

"میں نے پڑھا ہے" میں نے زور دے کر کہا . . ."

"تو پھر آپ نے دیکھا ہوگا۔"

"ارے صاحب میں نے پڑھا ہے" سے کے میں نے رو کر کہا۔ "سب پڑھا ہے۔"

"میں آپ کو عبارت ہی سنائے دیتا ہوں۔ . . . . ."

"میں نے پڑھا ہے" موت کی تکلیف اٹھاتے ہوئے میں نے۔ مگر وہ میری کب سنتے تھے مست ہو کر ہوا میں انگلی بار بار اٹھا کر بہ آوازِ بلند کتاب پڑھ کر مجھے سنانے لگے . . . "تمام دنیا کے مؤرخین اس بات پر متفق . . ."

کسی نے سچ کہا ہے تنگ آمد بجنگ آمد۔ ان حضرت کی ضد۔ بدتمیزی اور جارحانہ کارروائی نے میرے لئے موت اور زیست کا سوال پیدا کر دیا۔ میں کمزور آدمی پاگل ہو گیا۔ وہ میری طرف پشت کئے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی کرسی کا بڑا اگدا گھسیٹ کر پوری قوت سے "آ . . . . ہم" کر کے بے خبری میں ان کے سر پر نہایت زور سے گھما کر مارا۔ اور کرسی پھاند کر بدحواسی میں سر پر پیر رکھ کر بھاگا۔

(۳)

چشم زدن میں لائبریری کے احاطہ کی دیوار پھاند کر کمینوں کھیت ڈاک گاڑی کی رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ نہ دیکھوں خندق نہ کھائی سامنے سے ایک باڑ نظر آئی چاہا کہ کترا کر نکل جاؤں۔ مگر حضرت کہاں ہیں اس ادھر کے جھاڑوں کی باڑ ہو پر سے اڑنے کی کوشش جو کی تو الجھ کر گرا۔ بوکھلا کر اٹھا مڑ کے لائبریری سے برآمدے کی طرف نظر کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ بے اختیاری کے عالم میں ان کے ہاتھ میں کتاب دیکھتے ہی زور سے بکار کر میں نے وہیں

مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۲ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سکول میں حاصل کی۔ پھر ۱۹۰۷ء میں مشن کالج سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔

مرزا صاحب کا طرز تحریر سادہ اور پرلطف ہے۔ ان کی زبان اتنی عام فہم اور ہلکی پھلکی ہے۔ کہ تعریف احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ بے جا تکلفات سے اُن کو سخت نفرت تھی جو کچھ لکھتے تھے۔ سیدھے سادھے الفاظ میں لکھتے۔ ان کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا دلی کا کوئی بہت بڑا زبان دان اپنی زبان میں باتیں کر رہا ہے۔ ان کی ظرافت بھی بڑی لطیف ہوتی ہے۔ مضامین کا مجموعہ "مضامین فرحت" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ سادہ مگر پرکشش زبان چستی الفاظ۔ دلکش انداز بیان اور ہنسانے والے واقعات کی وجہ سے مرزا فرحت کو اُردو زبان کے مزاح نگاروں میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ آپ کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔

عالمِ بے بسی

یہ کون ہیں؟ کہ مرزا صاحب! آئیے آئیے مرزا صاحب! آپ کی تو شکل ہی نظر نہیں آتی۔ آئیے بیٹھئے۔ مرزا صاحب کی شکل ملاحظہ فرمائیے۔ سات فٹ کا قد۔ سفید رنگ۔ کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ غلافی آنکھیں۔ ان میں قدرتی لال ڈورے۔ چڑھی ہوئی داڑھی۔ جس کا ایک ایک بال سرکار انگریزی کی فوج کی طرح اپنی اپنی جگہ "اٹنشن" (استادہ) سر پہ چوگوشہ ٹوپی نیچی چولی کا انگرکھا۔ اس پہ نیم آستیں جس کا سینہ کھلا ہوا۔ ایک بر کا پاجامہ پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ ہاتھ میں رام پوری بانس کی چھڑی۔ اور چاندی کی موٹھ نیچے لوہے کی شام۔ ہنستے ہوئے آئے۔ اور نہایت متانت کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

مرزا صاحب۔ ارے میاں میر صاحب! کیا کروں مرزا نوشہ پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ان سے آج ذرا سویرے پنڈ چھڑایا تو تم سے ملنا نصیب ہوا اور ہاں میر صاحب! وہ ہمارے یار شیخ جی کہاں ہیں؟ ان کو بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔

میر صاحب۔ اب آتے ہی ہوں گے۔ لیجئے وہ آئے۔ یار بڑی عمر ہے۔ ابھی مرزا صاحب تم کو یاد کر رہے تھے۔

شیخ جی بڑے سوکھے سہمے آدمی تھے۔ ڈاڑھی بھی کچھ واجبی سی تھی۔ رنگت تو اتنی کالی نہ تھی۔ لیکن چیچک کی وجہ سے منہ پر کچھ پھوسی اڑنے لگی تھی۔ مگر تھے بڑے وضع دار۔ عمر گو پچاس سے بھی اوپر تھی۔ پھر بھی گوٹے کی ٹوپی اور مشروع کا پاجامہ نہ چھوٹتا تھا۔

شیخ جی اوہو مرزا صاحب اور یہاں! ہم تو سمجھے تھے ۔ کہ تم مرزا نوشہ کے ہو رہے ۔ میاں ہم بھی شاعر ہیں ہمارے بھی استاد ہیں ۔ لیکن یار اس طرح استاد کا دُم چھلہ نہیں بن جانا ۔

باہر سے آواز آئی "کیوں بھئی ہم بھی آئیں ؟"

شیخ صاحب ۔ آئیے آئیے ۔ واہ بھئی واہ ۔ میں سمجھا تھا ۔ کوئی بھلا آدمی ہوگا ۔ کیا خبر تھی کہ الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی ۔

میاں نواب بالکل شیخ جی کی ضد تھے ۔ جتنے وہ دبلے تھے ۔ اتنے یہ موٹے ۔ جتنے وہ ٹھگنے تھے ۔ اتنے یہ اونچے ۔ اندر آتے ہی وہ بیٹھنے کو ایک مونڈھے کی طرف بڑھے ۔

میر صاحب ۔ بھئی نواب ذرا سنبھل کے ۔ واللہ میں نے آج ہی چھو آنے کو لیا ہے ۔ تم بیٹھے اور یہ نچکا ریچکا ، نا بھئی خدا کے لئے تم اپنے اسی مونڈھے پر بیٹھو ۔

نواب ۔ یار موٹا ہونا بھی غضب ہوگیا ۔ میر صاحب! ایسا ہی مونڈھوں کا خیال ہے تو ہمارے لئے تخت بچھوا دو ۔ آہا مرزا مرزا صاحب بھی براج رہے ہیں ۔ کہو بھئی مرزا آج کل مرزا نوشہ کس رنگ میں ہیں ؟

مرزا ۔ آج کل عالم بے کسی اور بے بسی کو نئے انداز میں باندھ رہے ہیں ۔

نواب بھئی بے بسی کا عالم ہم سے پوچھو ۔ یار دل پہ جو گزری ہے تو ہم ہی جانتے ہیں ۔

میر صاحب ۔ میاں نواب ہم بھی تو سنیں کہ آپ پر کون سی بپتا پڑی تھی ۔

نواب ۔ مگر بھئی تم ہنسو گے اور مجھے غصہ آجائے گا ۔

شیخ جی میاں نواب! آپ بھی غضب کرتے ہیں ۔ یار تمہاری مصیبت اور ہم ہنسیں ۔ بھائی توبہ کرو ۔

نواب ۔ اچھا بھائی اچھا ۔ کہتا ہوں ۔ کوئی دس برس کا زمانہ ہوا کہ مجھے

ایک کام سے غازی آباد جانا پڑا۔ اس زمانے میں میرا جسم بھی ماشاءاللہ کسی قدر بھاری تھا۔

شیخ جی - اوہو! نواب خیر سے آپ دُبلے ہیں۔ واللہ اُس زمانے میں تو دیکھنے کے قابل ہوں گے۔

نواب - شیخ جی! خدا کے لئے جب انسانوں کا ذکر ہو۔ تو آپ بولا نہ کریں۔ آپ کی کھال کو تو ریہہ لگ گئی ہے۔ نہ گھٹ سکتی ہے نہ بڑھ سکتی ہے۔ میاں ہماری کھال ربڑ ہے ربڑ۔ جتنا اللہ کے فضل سے جسم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اتنی پھیلتی جاتی ہے۔ خیر غازی آباد پہنچا۔ راستے میں بھارکس کے ہچکولوں نے بھرکس نکال دیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی۔ سرائے میں جا کر ایسی لمبی تانی کہ صبح کے نو بجا دیئے۔ اُٹھا تو بیت الخلاء کی تلاش ہوئی لوگوں سے پوچھا تو انھوں نے ایک طرف اشارہ کر دیا۔ اُدھر گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کونے میں ایک الماری کھڑی ہے۔ لوگوں سے پھر جا کر پوچھا تو معلوم کہ جس کو میں الماری سمجھتا تھا۔ وہی ان بھلے مانسوں کا بیت الخلاء ہے۔ اب میری جسامت کو دیکھو اور اس الماری کو دیکھو، بے تابی حد سے زیادہ تھی۔ اس الماری کا پٹ کھولا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک چھوٹے سے قدمچے کے گرد آڑ کے لئے چیڑ کے تختے جڑ دیئے ہیں۔ اب سوچا کہ اگر سیدھا اندر چلا جاتا ہوں تو اندر جا کر مڑ دوں گا کیونکر۔ آخر یہ ترکیب سوجھی کہ اُلٹے پاؤں اندر دھنس جاؤں۔ زور کر کرا کے اندر پہنچ ہی گیا خدا خدا کر کے بے تابی میں افاقہ ہوا۔ اب ختم کارروائی کو دو چار ہاتھ رہ گئے۔

یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ جب تک کہنیاں اور گھٹنے نہ پھیلیں یہ کام کیونکر ہو۔ الماری میں تو پہلے ہی انگوٹھی کا نگینہ بنا بیٹھا تھا۔ آخر زور

کر کے کہنیاں اور گھٹنے کچھ پھیلا ہی دیئے - اس زور ازوری میں پہلے تو پہلو کے تختوں نے چرچڑ کی ـــ . پھر ایک دفعہ ہی میری کہنیاں اور گھٹنے تختے توڑ کر پار نکل گئے - اب ہزار کوشش کرتا ہوں - نہ کہنیاں نکلتی ہیں نہ گھٹنے نکلتے ہیں - ایک ہاتھ میں بھرا ہوا لوٹا - دوسرا ہاتھ ذرا نیچے کی طرف مائل - تھوڑی دیر تک تو میں نے ہاتھ پاؤں مارے - لیکن کہنیاں اور گھٹنے نہ چھوٹنے تھے نہ چھوٹے -

اتنے میں دوسرے مسافروں نے بھی نکلنے کا تقاضہ شروع کیا پہلے تو میں ہوں ہوں کر کے ٹالتا رہا - مگر جب کاٹھ میں کسے ہوئے گھنٹہ بھر گزر گیا - تو لاچار ایک مولوی صاحب سے جنہوں نے پانچویں بھی بار کھٹکادا - اور دروازہ کھٹکھٹایا میں نے کہا " حضرت نکلوں تو کیوں کر نکلوں - مجھ کو آپ کے صندوق نے پکڑ لیا ہے - مجھ سے بلا کب جاتا ہے آپ دروازہ کھولئے - تو میری حالت معلوم ہو" - وہ بچارے سمجھے کسی بیماری کا دورہ ہے - انہوں نے دوسرے مسافروں کو بھی بلا لیا - اور سب نے مل کر دروازہ کا پٹ شرماتے شرماتے کھولا - اندر انہوں نے جو بے بسی کی تصویر دیکھی ہوگی - وہ آپ کے کسی شاعر کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی - بہرحال غل مچ گیا - کہ ایک صاحب بیت الخلا میں پھنس گئے - تمام شہر ٹوٹ پڑا - بڑھیوں نے تھانیوں سے تختوں کی پچریں نکالنا شروع کیں - ادھر میں نے زور لگایا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دفعہ ہی میرے چاروں ہاتھ پاؤں نکل آئے - لیکن ساتھ ہی اس کشمکش میں ایسا جھٹکا لگا کہ میں منہ کے بل دروازہ پر گرا - صندوق ٹھہرا چیڑ کا اور وہ بھی باوا آدم کے وقت کا - بوجھ پڑا اس پر دس من کا - قبضے اور چولیں سب اکھڑ گئیں اور دروازہ کا دروازہ سارا پیرا سامنے جا پڑا - اور میں اپنے زور میں قلابازیاں کھاتا ہوا تماشائیوں کی خدمت میں حاضر ہو گیا - غرض مجھ غریب کا یہ دوسرا نقشہ بے بسی کا تھا - جو ان دیہاتیوں کی ضیافت طبع کا باعث ہوا -

ان تابڑ توڑ مصیبتوں سے کچھ ایسا سٹ پٹایا کہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مجمع کو چیرتا پھاڑتا بھاگا اور سامان و امان چھوڑ چھاڑ سیدھا بھارکس میں گھس گیا۔ بیل لگاتے لگاتے لوگوں نے بھارکس کا تماشا بنا لیا۔ مگر یارو یہ ضرور کہوں گا کہ جس شان و شوکت سے میں غازی آباد سے چلا ہوں۔ ایسی روانگی کسی لاٹ صاحب کو بھی نصیب نہ ہوگی"۔ یہ کہہ کر نواب صاحب لڑھکتے لڑھکاتے دروازے کی طرف چلے۔ سب کہتے رہے کہ ارے میاں ٹھہرو۔ ٹھہرو مگر یہ کب کسی کی سننے والے تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

پطرس

احمد شاہ بخاری ملک کے مشہور ادیب ہیں۔ ادبی دنیا میں پطرس کے نام سے مشہور ہیں۔ شروع میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر رہے۔ اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اور بعد ازاں انجمن اقوام متحدہ میں مستقل پاکستانی مندوب۔

پطرس کا انداز تحریر نرالا ہے۔ مزاح نگاروں میں ایک خاص درجہ کے مالک ہیں لیکن ایک مدت سے اُردو ادب آپ کی نگارشات سے محروم ہے۔ آج کل آپ انجمن اقوام متحدہ کے انڈر سکریٹری ہیں۔

کُتّے

علم الحیوانات کے پروفیسروں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ کتوں کا فائدہ کیا ہے۔ گائے کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کُتّے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کُتّا وفادار جانور ہے۔ اب جناب اگر وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لیے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کُتّے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کُتّے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصّہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولہے میں سے باہر لپکے اور بھنّا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کُتّے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے وہ ہنگامہ ہوا کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ "آرڈر آرڈر" پکارا لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

اور پھر ہم دیسی لوگوں کے کتے بھی کچھ عجیب بدتمیز واقع ہوئے ہیں۔ اکثر تو ان میں سے قوم پرست ہیں۔ خیر یہ تو ایک حد تک قابلِ تعریف بھی ہے۔ اس کا ذکر ہی جانے دیجئے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات ہے۔ یعنی ہمیں بارہا ڈالیاں لے کر صاحب لوگوں کے بنگلوں پر جانے کا اتفاق ہوا۔ خدا کی قسم ان کے کتوں میں وہ شائستگی دیکھی کہ عش عش کرتے لوٹ آئے ہیں۔ جونہی ہم بنگلے کے دروازے میں داخل ہوئے ہیں۔ کتے نے برآمدے ہی میں کھڑے کھڑے ایک ہلکی سی "بخ" کر دی اور پھر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔ ہم آگے بڑھے تو اس نے بھی چار قدم آگے بڑھ کر ایک نازک اور پاکیزہ آواز میں پھر "بخ" کر دی۔ چوکیداری کی چوکیداری۔ موسیقی کی موسیقی۔ ہمارے کتے ہیں کہ راگ نہ سُر۔ نہ سر نہ پیر۔ تان پہ تان لگائے جاتے ہیں بےتالے کہیں کے۔ نہ موقع دیکھتے ہیں نہ وقت پہچانتے ہیں۔ گلے بازی کئے جاتے ہیں۔ گھمنڈ اس بات پر ہے۔ کہ تان سین اسی ملک میں تو پیدا ہوا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تعلقات کتوں سے ذرا کشیدہ ہی رہے ہیں لیکن قسم لے لیجئے جو ایسے موقع پر ہم نے کبھی ستیا گرہ سے منہ موڑا ہو۔ شاید آپ اس کو تعلّی سمجھیں۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ آج تک کسی کتے پر ہاتھ اٹھ ہی نہ سکا۔ اکثر دوستوں نے صلاح دی کہ رات کے وقت لاٹھی چھڑی ضرور ہاتھ میں رکھنی چاہئے کہ دافع بلیات ہے۔ لیکن ہم کسی سے خواہ مخواہ عداوت پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ کتے کے بھونکتے ہی ہماری طبعی شرافت ہم پر اس درجہ غلبہ پا جاتی ہے۔ کہ آپ ہمیں اگر اس وقت دیکھیں تو یقیناً یہی سمجھیں گے کہ ہم بزدل ہیں۔ شاید آپ اس وقت یہ بھی اندازہ لگا لیں کہ ہمارا گلا خشک ہوا جاتا ہے۔ یہ البتہ ٹھیک ہے۔ ایسے موقع پر کبھی میں گانے کی کوشش کروں تو کھرج کی سُروں کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔

چونکہ ہم طبعاً ذرا محتاط ہیں۔ اس لئے آج تک کتے کے کاٹنے کا کبھی اتفاق

نہیں ہوا۔ یعنی کسی کتے نے آج تک ہم کو کبھی نہیں کاٹا۔ اگر ایسا سانحہ کبھی پیش آیا ہوتا تو اس سرگزشت کے بجائے آج ہمارا مرثیہ چھپ رہا ہوتا۔ تاریخی مصرع دعائیہ ہوتا کہ "اس کتے کی مٹی سے بھی کتا گھاس پیدا ہو" لیکن ؎

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے سگِ رہ بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا!

کتوں کے بھونکنے پر مجھے سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ ان کی آواز سوچنے کے تمام قویٰ کو معطل کر دیتی ہے۔ خصوصاً جب کبھی کسی دکان کے تختے کے نیچے سے ان کا پورا خفیہ جلسہ باہر سڑک پر آکر گانے کا کام شروع کر دے۔ تو آپ ہی کہیئے کہ ہوش ٹھکانے رہ سکتے ہیں؛ ہر ایک کی طرف باری باری متوجہ ہونا پڑتا ہے۔ کچھ ان کا شور، کچھ ہماری صدائے احتجاج (زیرِ لب)، بے ڈھنگی حرکات وسکنات (حرکات ان کی سکنات ہماری) اس ہنگامہ میں بھلا دماغ خاک کام کر سکتا ہے؟ اگرچہ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اگر ایسے موقع پر دماغ کام کرے بھی تو کیا تیر مار لے گا؟ بہر صورت کتوں کی یہ پرلے درجے کی ناانصافی میرے نزدیک ہمیشہ قابلِ نفرین رہی ہے۔ اگر ان کا ایک نمائندہ شرافت کے ساتھ ہم سے آکر کہہ دے کہ جنابِ عالی! سڑک بند ہے تو خدا کی قسم! ہم بغیر چون وچرا کئے واپس لوٹ جائیں۔ لیکن پوری مجلس کا یوں متفقہ و متحدہ طور پر سینہ زوری کرنا ایک کمینہ حرکت ہے۔

خدا نے ہر قوم میں نیک افراد بھی پیدا کئے ہیں۔ آپ نے خدا ترس کتا بھی ضرور دیکھا ہوگا۔ عموماً اس کے جسم پر تپسیا کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ جب چلتا ہے تو اس مسکینی اور عجز سے کہ گویا بارِ گناہ کا احساس آنکھ نہیں اٹھانے دیتا۔ دم اکثر پیٹ کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر لیتا

ہے یہ شکل بالکل فلاسفروں کی سی اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا لوگوں سے کہلوایا خود دس بارہ آوازیں دیں۔ تب آپ نے اپنی مخمور آنکھوں کو کھولا۔ کسی نے چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اُٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے۔ اور خیالات کے سلسلے کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے پھر شروع کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے وہ راستہ چھوڑ دینا فقیری شان کے خلاف سمجھتے ہیں ؛

رشید احمد صدّیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے طنز و مزاح میں ایک بالکل نئی راہ اختیار کی ہے۔ انہوں نے ادب میں شوخی۔ لفظوں کے معنی اور معنوں کے الفاظ ایجاد کئے۔ اور صرف الفاظ کے اُلٹ پھیر سے ہی مضامین میں فراخیہ دلچسپی پیدا کر دی آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ اور موجودہ دور کے مزاح نگاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں

اگر دُنیا میں ڈاکٹر نہ ہوتے

اب سے دور ایک حکیم تھے، بے روزگار۔ اپنے سے مایوس دوسرے سے بیزار۔ یہ دیکھ کر کہ وطن میں لوگ بیمار بھی پڑتے ہیں۔ اور مر بھی جاتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں میں سے کسی ایک میں بھی دخل نہیں ہوتا۔ انہوں نے ہجرت کی۔ اور دیارِ غیر میں پہنچ کر قسمت آزمائی پہ آمادہ ہوئے۔ قضارا پہلا ہی مریض ان کے ہاتھوں دنیا سے چل بسا۔ ورثا ان کو خبر کرنے آئے۔ انہوں نے بھی رسماً اظہارِ ہمدردی کیا۔ تھوڑی دیر بعد اُن کی فرمائش ہوئی "حضور والا ہمارے ہاں کا دستور ہے کہ جو مریض جس طبیب کے ہاتھوں فوت پائے اس کی تجہیز و تکفین بھی اسی طبیب کے ہاتھوں عمل میں آئے"۔ طب کے قانون میں یہ دفعہ اس سے پہلے حکیم صاحب کی نظر سے نہیں گزری تھی مجبوراً یا اخلاقاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میت کے گھر پہنچ کر غسلِ میت کے فرائض انجام دئے۔ کفن پہنایا۔ اور میت کو تابوت میں رکھا۔ رسماً تابوت اٹھانے میں پیش قدمی کر کے ایک طرف کاندھا بھی دیا۔ لیکن اب جو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ ہر طرف کا کاندھا تو لوگ بدلتے رہتے ہیں۔ ان کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ قبرستان بستی سے بہت دُور واقع تھا۔ اُفتاں و خیزاں وہاں تک پہنچے۔ میت کو قبر میں اُتارا مٹی دی۔ اور بڑی رات گئے گھر پہنچے۔

دوسرے دن سے جب کوئی مریض اُن کے مطب میں آتا۔ تو اس کا حال سنتے سنتے قطع کلام کر کے پُوچھ بیٹھتے۔ "اور کیوں جناب آپ کا قبرستان کتنا دُور ہے؟" ظاہر ہے یہ سوال ایسا نہ تھا کہ مریض یا اس قبیل کے دُوسرے لوگ اُن سے مزید گفتگو کرتے۔ یہاں سے بھی پریشان ہو کر نکلے۔ اسی دوران میں

ان کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہوئی ۔ جو بظاہر نہایت بھلے مانس معلوم ہوتے تھے۔ حکیم صاحب نے نام اور پتہ پوچھا ۔ انہوں نے مسکرا کر فرمایا:" انسان مجھے فرشتہ کہتے ہیں ۔ اور فرشتے مجھے شیطان ۔ میں دیکھتا ہوں ۔ تم بڑی مصیبت میں ہو ۔ میں تمہاری مدد کرنے کو حاضر ہوں ۔ دیکھو جب کبھی تمہارا سابقہ کسی مریض سے ہو ۔ تو یہ علامت دیکھنا ۔ اگر ملے تو سمجھنا ۔ مریض اچھا نہ ہوگا ۔ اسے ہاتھ نہ لگانا ۔ اگر یہ علامت نہ ملے ۔ تو جو کچھ دے دو گے ۔ فائدہ ہوگا ۔ حکیم صاحب بہت خوش ہوتے کہنے لگے " فوراً آپ کو جزائے خیر دے آپ نے بڑا احسان کیا ۔ میرے لائق جو خدمت ہو فرمائیے " شیطان مسکرایا کہنے لگا :" آخر حکیم ہی ٹھہرے ۔ وہی ہو الشافی ۔ اور وہی بندے لگے بنفشہ اور نیلوفر تم میری خدمت کیا کرو گے ۔ جواب تک جزائے خیر اور احسان کا مفہوم بھی نہ سمجھے :" حکیم صاحب شیطان کے تیور سے گھبرائے ۔ فوراً آداب بجا لا کر رخصت ہو گئے ۔ ایک دوسرے شہر میں پہنچ کر مطب کا ڈول ڈالا ۔

صبح کے وقت ایک مریض آیا ۔ اس میں وہی علامت ملی ۔ جو شیطان نے بتائی تھی ۔ انہوں نے فوراً مریض سے کہہ دیا ۔ علاج کرانے سے کچھ حاصل نہیں ۔ تم جلد ہی مر جاؤ گے ۔ یہ گیا تو دوسرا مریض آیا ۔ اس میں بھی وہی علامت ملی ۔ اُسے بھی موت کی بشارت دے کر ٹالا ۔ غرض کئی دن متواتر ان غریب کے ہاں وہی لوگ آئے جن کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا ۔ جن جن کو یہ مژدہ سنا چکے تھے ۔ وہ جاں بحق ہوتے رہے ۔ چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی شہرت ایسی عام ہوئی کہ مریض تو درکنار ۔ تندرست بھی ان کے سائے سے بھاگنے لگے ۔ اور یہ بے چارے جہاں کے تہاں رہ گئے۔

یہ واقعہ بجائے خود صحیح ہو یا نہ ہو ۔ اس کے دلچسپ ہونے میں یوں بھی شبہ نہیں ہو سکتا ۔ کہ اس میں شیطان کا کافی دخل ہے ۔ اور شیطان اور

ڈاکٹر جب یک جا ہوں۔ تو آپ جانتے ہیں۔ تندرست اور مریض کا حشر یکساں ہوتا ہے۔

آپ نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا۔ بعض ڈاکٹروں کا برزخ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ کہ اُن کی پیشانی پہ مریض کی موت لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے اکثر ایسے ڈاکٹروں کو دیکھا ہوگا۔ جنہیں مطب کرنے کی بجائے اسٹاک ایکسچینج پہ سٹہ بازی کی قسم کے شغل میں مصروف ہونا چاہیئے تھا۔ یا مشرقی لندن میں قہوہ کی دکان رکھنی چاہیئے تھی۔ پھر آپ ہی غور کیجئے۔ ایسے بزرگوں سے مردہ شوئی۔ گورکنی۔ یا میت برداری کا کام لیا جاتا ہو۔ تو کسی کا کیا قصور؟

سائنس کی ترقی نے دوسرے فنون کی طرح ڈاکٹری کے فن کو جتنا نفع پہنچایا ہے۔ اب ڈاکٹر اپنی طبیعت یا اپنے وجدان پہ نہ بھروسہ کرتا ہے۔ اور نہ صحیح وجدان کی تربیت کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ وہ آلات پہ بھروسہ کرنے لگا ہے۔ یا اُن کی پیٹنٹ دواؤں پہ جن کو تجارت نے فروغ دیا ہے۔ وہ نوٹو کا قائل ہے۔ اور اصل کے اسرار سے بالکل ناآشنا ہو گیا ہے۔

ایک اصلی طبیب اور عطائی میں فرق صرف یہ ہے۔ کہ دونوں مریض کی جان لیتے ہیں۔ لیکن طبیب قاعدہ کے ساتھ اور عطائی بے قاعدگی سے۔ ہمارے تمدن کا تمام تار و پود اسی باقاعدہ اور بے قاعدہ طریقۂ کار سے وابستہ ہے۔ اسی قاعدہ اور بے قاعدہ طریقہ عمل نے ہم کو اپنے خالق سے یگانہ یا بیگانہ کر رکھا ہے۔ کوئی شخص خدا کے رحم و رحمت کا اس وقت تک مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص مسلک مذہب سے وابستہ نہ کرلے۔

ہاں تو بات ڈاکٹروں کی تھی۔ یعنی یہ نہ ہوں۔ تو کیا ہو۔ کہ باقاعدہ اور بے قاعدہ مرنے کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ لوگ مرنے سے پہلے نہ مریں۔ ڈاکٹروں میں ایک قوم ماہرین خصوصی کی نکل آئی ہے۔ جسم کا کوئی عضو ایسا

نہیں۔ جس کے مخصوص معالج نہ ہوں ۔

اچھا تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ آپ کے دماغ میں فتور ہے۔ آپ کسی امراض دماغ کے ماہر کے ہاں چلے جائیے ۔ وہ بہت ساری ترکیبیں کر کے آپ پر یہ حقیقت واضح کر دے گا ۔ کہ آپ کے دماغ میں واقعتاً فتور ہے ۔ اس کے پاس ایسے آلات ہوں گے ۔ اس کی شہرت ایسی ہی ہوگی اور آپ خود کچھ ایسے نیازمند ہوں گے ۔ کہ آپ کو اس کا یقین ہو جائے گا ۔ کہ آپ کا دماغ خراب ہے ۔

میرے پاس ایک دوست ہیں ۔ جن کا مقولہ ہے ۔ کہ آج کل کے ڈاکٹروں اور طریقۂ علاج سے سابقہ پڑ جائے ۔ تو جان و مال دونوں کا خدا ہی حافظ ہے ۔ اوّل تو یہ لوگ مرض کے تشخیص کرنے میں اتنے روپے خرچ کرا دیتے ہیں ۔ کہ مریض قلاش ہو جاتا ہے ۔ پھر مریض میں قدرے توانائی بھی ہونی چاہیئے ۔ ورنہ تشخیص کے سلسلہ میں اکثر اس کو دربدر پھراتے پھراتے ہی مار ڈالتے ہیں ۔ اس کے بعد علاج کا دَور آتا ہے ۔ اس میں قیمتی دوائیں ۔ مہنگے مقامات جہاں اسے جلا وطن کرتے ہیں ۔ اور تیمارداری کے وہ ضوابط ہیں ۔ جن کو برتنے کے بعد تیماردار خود مریض بن جاتا ہے ۔ ان سب سے عہدہ برآ ہونے کے بعد جب موت واقع ہوتی ہے ۔ تو معلوم ہوتا ہے ۔ کہ گھر کا سارا اندوختہ ختم ہو چکا ہے اور ڈاکٹر کا بل ادا کرنا باقی ہے ۔

ایک ڈاکٹر ہیں جن سے مجھے بڑی دلچسپی ہے ۔ آپ کے ایک پھنسی سی نکل آئے ۔ اور آپ ان سے رجوع کریں ۔ تو پہلے تو وہ پھنسی کو اس نگاہ سے دیکھیں گے ۔ جیسے کوئی مراقی اپنی بیوی کو دیکھتا ہے ۔ پھر نہایت پُراسرار اور رازدارانہ ہمدردی کے ساتھ دریافت فرمائیں گے ۔ آپ کبھی کوڑھ یا اس قبیل کے دوسرے ناگفتہ بہ امراض میں، تو نہیں مبتلا ہوئے ہیں ۔ اور

آپ نہیں تو آپ کے بزرگ کبھی اس سے دو چار ہوئے ہیں؟ نکام کی ابتدا وہ نمونیا سے کریں گے۔ اور نمونیا کو دق کا مقدمہ بتائیں گے۔ ان کا خیال ہے۔ کہ چالیس سال میں ہر انسان کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے تو اس کا قصور ہے۔ ایسوں کا علاج بھی وہ ایک خاص اصول پر کرتے ہیں یعنی قضا تو مسلم ہے۔ سکرات کو آسان بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

ایک دن کا کھانا کھا کر میں فوراً لکھنے بیٹھ گیا۔ چونک پڑے۔ فرمایا غضب خدا کا ایسی غلطی نہ کیا کیجیئے۔ کھانا کھانے کے بعد دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے۔ کہ چالیس سال کی عمر میں شریان سخت ہو جاتی ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ دورانِ خون کی تیزی سے کوئی شریان پھٹ جائے۔ فالج گرے اور موت واقع ہو جائے۔ میں نے عرض کیا ڈاکٹر صاحب کیا علامتیں مجھ میں نظر آ رہی ہیں؟ فرمانے لگے۔ تم لوگ تو ہو احمق۔ مرض کے اس وقت قائل ہوتے ہو۔ جب اس میں مبتلا ہو جاتے ہو۔ ڈاکٹر امکان کا قائل ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تو یہ کہہ کر چلے گئے۔ لیکن ان کی گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ اب مجھے سر پھٹنے کا اتنا خوف نہیں رہا۔ جتنا شریان پھٹنے کا۔

ہمارا ڈاکٹر لکیر کا فقیر ہو گیا ہے۔ وہ صرف یہ دیکھتا ہے۔ کہ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے۔ اس کی حرف بحرف تعمیل کر دی گئی یا نہیں۔ وہ مرض کا ماہر ہو تو ہو، مریض کا غمگسار نہیں ہوتا اس کے علاوہ پہلے طبیب کے پیشہ کا محرک خدمتِ خلق ہوتا تھا اب صرف ضوابط کی خانہ پُری رہ گئی ہے۔

ڈاکٹروں میں دواؤں سے علاج کرنے والوں کے علاوہ سرجن بھی ہوتے ہیں۔ ان کی اہمیت مسلم ہے۔ ڈاکٹری کے اس شعبے نے واقعتاً معجزے سرانجام دیئے ہیں۔ اس فن کی ترقی انسان کی راحت و عافیت کے لئے نہایت نیک فال ہے۔ لیکن وزارتِ خصوصی کے جنون نے

اس شعبہ میں بھی خطرہ کے امکانات پیدا کر دئے ہیں - ذرا ذرا سی تکلیف میں بھی اپریشن ناگزیر سمجھا جانے لگا ہے - اس طریقہ کار نے وجدان کو مزید نقصان پہنچایا ہے - فوج یا صنعت و حرفت یا دیگر فنون کی مانند طریقۂ علاج بھی مشینی ہونے لگا ہے - لیکن ہر چیز کو مشین آشنا کر دینے سے انسانیت کے اصل جوہر رفتہ رفتہ فنا ہوتے جا رہے ہیں - اور یہ چیز انسانیت کے لئے بڑی محرومی ہے -

لیکن توپ خانے میں طوطی کی آواز کون سنے گا - اب ہماری زندگی تمام تر مشین کی زد میں آگئی ہے - اور انسانیت کا عنصر انسانی زندگی سے بڑی سرعت کے ساتھ ناپید ہو رہا ہے - لیکن یہ یاد رہے کہ مشین سے ذہن و دماغ کو تو بدل سکتے ہیں - قلوب کو گداز نہیں کر سکتے - مختصر یہ کہ ڈاکٹر ہوں تو برا اور نہ ہوں تو اور برا ؂

رشید احمد صدیقی

وقار عظیم

سید وقار عظیم ۹ ستمبر ۱۹۱۰ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ الٰہ آباد میں ایم۔ اے پاس کیا اور علی گڑھ سے بی۔ ٹی کی سند لی۔ دو سال تک جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں اور پانچ سال تک گورنمنٹ آف انڈیا پالی ٹیکنیک میں بطور استاذ درسی خدمات انجام دیتے رہے۔ زاں بعد سرکاری اخبار آج کل کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے قیام پاکستان کے بعد ہجرت کرکے پاکستان چلے آئے اور مجلہ ماہ نو کے مدیر مقرر ہوئے۔ آج کل پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے پروفیسر ہیں۔

سید صاحب نے ہند و پاکستان کے ہر ادبی اور علمی مجلہ میں اپنی خداداد قابلیت کے جواہر بکھیرے اور ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی فرمائی ہے۔ آپ ایک کامیاب تنقید نگار بھی ہیں۔ افسانہ نگاری، فن افسانہ نگاری، ہمارے افسانے، نیا افسانہ، انتخاب مومن، انتخاب آتش اور اصول تعلیم آپ کی مشہور مطبوعہ کتب ہیں

اُردو افسانہ نگاری میں عورت کا تصوّر

عورت کی شخصیت اور اس کی ذات دُنیا کے ہر ادب کا سب سے خاص اور سب سے اہم موضوع رہا ہے اور باوجود زمانہ کی تبدیلی اور اس کے تحت نئے انقلابات کے اس تخصیص اور اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ عورت کا ذکر اب بھی ادب کا اہم ترین اور دلکش ترین موضوع ہے۔ اس کی ایک وجہ تو عورت کی شخصیت کی دلکشی اور جاذبیت ہے اور دوسری وجہ سوسائٹی میں اس کے مقام کی پیچیدگی۔ اور اسی لئے ادب میں ہمیشہ عورت کی شخصیت کو نفسیاتی، رومانی اور سماجی نقطۂ نظر سے پیش کرنے اور سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمیں اس وقت دنیا کے کسی اور ادب سے بحث نہیں۔ ہمارا موضوع صرف ہمارا ادب اور ہمارے ادب کی ایک خاص صنف افسانہ ہے۔

ہماری شاعری میں عورت کی فطرت بے حد دلچسپ طریقوں سے ہمارے سامنے لائی گئی ہے لیکن ہمارے مختصر افسانوں میں اس روحانی مخلوق کی جیسی جیسی تصویریں ہیں وہ اگر ایک طرف انسان کو صرف اُسی کا بنا سکتی ہیں تو دوسری طرف اُن میں یہ اثر بھی موجود ہے کہ انسان بجائے اُس سے مانوس ہونے کے اُس سے دُور بھاگے۔

عورت کی سب سے پہلی اور بعض کے نزدیک بالکل غیر شاعرانہ تصویر اُن افسانوں میں ہے جو سماجی، معاشرتی یا اخلاقی کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اُردو میں جب مختصر افسانہ نویسی کی ابتداء ہوئی تو قوم اور ملک انحطاط اور تنزل کی منزلوں سے گزر رہے تھے نہ اجتماعی زندگی کی حالت قابلِ اطمینان تھی نہ فرد کی۔ ہر طرف نفسی نفسی کا عالم تھا اور زبردست زیر دست کی مجبوری و لاچاری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کو زندگی کا سب سے بڑا اخلاق اور فریضہ جانتے تھے۔ کمزور کے پاس بے بسی کے سوا کوئی اور سہارا نہیں، وہ خاموشی سے ان ظلموں کو برداشت کرنے کے سوا اور کیا کر

سکتے تھے، عورت کو فطرت نے کمزور پیدا کیا ہے اور اس لئے زمانہ نے ہمیشہ اُسے اُس کے حقوق سے محروم رکھا ہے۔ اور ہمارے سماج نے تو اس حق تلفی کو ظلم و تشدد کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اسی لئے ادب کے ہر دور میں ایک گروہ ایسے لکھنے والوں کا رہا ہے جس نے عورت کے حقوق اُسے واپس دلانے کی کوشش کی ہے۔ شاعروں نے اسی غرض سے کہیں کہیں عورت کی صحیح مرتبہ کی مصوری کی ہے اور افسانہ نگاروں نے اس استحقاق کو زیادہ مستحکم بنانے کے لئے عورتوں کو اپنے افسانوں کا کردار بنایا ہے اُن میں سیرت کی جتنی اچھائیاں ممکن تھیں پیدا کیں عورت کو ایثار، محبت، اطاعت اور خدمت کی دیوی بنا کر پیش کیا۔ شوہر خواہ اس پر کتنے ہی ظلم کرے اس کی فطرت کا صرف یہ تقاضا ہے کہ وہ اُس کے پیر دھو دھو کر پیئے، اپنی نیند، عیش و آرام کو صرف اپنے سرتاج زندگی کے آرام پر بھینٹ چڑھا دے اور اُس کے آرام کو اپنا سکھ چین اور خدمت کو عبادت جانے۔ اس قسم کے نسوانی کردار ہمیں عموماً راشد الخیری، پریم چند سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں ملتے ہیں۔ ایسی عورتوں کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی نسائیت ہے وہ شرم و حیاء کی پتلیاں ہیں۔ اُسے قائم رکھنے کے لئے سب کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن ہر بات میں اور ہر کام میں اُن کی فطری نسائیت غالب رہتی ہے۔

عورت کی اس سے زیادہ دلکش اور پُر عظمت تصویریں وہ ہیں جنہیں پریم چند نے اپنے بعض افسانوں میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے ہندوستان کی تاریخ سے کچھ ایسی خواتین کے کردار چن لئے جن میں مشرقی عورتوں کی ساری دلکشیاں تھیں۔ کسی شاعر کا اچھے سے اچھا شعر اُن کی طرف منسوب کیا جا سکتا تھا۔ اُن کے حُسن کی دمک زہرہ و مشتری کو ماند کرتی تھی۔ وہ محبت کی دیویاں تھیں۔ دوسری ہندوستانی عورتوں کی طرح وہ بھی اپنے شوہر کو دیوتا جانتی تھیں لیکن سب باتوں کے ساتھ اُن کے بازوؤں میں زور تھا، لیکن اب ہمارے سامنے صرف اُن کی خیالی تصویریں ہیں خیال آنکھوں کو اُن تک لے جاتا ہے اور دل ان دلفریب مرقعوں کو چلتے پھرتے پتلوں کی شکل میں دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔

اُردو افسانہ نگاروں کا ایک تیسرا گروہ نہ عورت کی پہلی تصویر کو پسند کرتا ہے نہ دوسری کو۔ پہلی میں شعریت نہیں اور دوسری میں نسائیت مفقود ہے اور کچھ ہو یا نہ ہو یہ خوش آئند ضرور ہے۔ اس قسم کے افسانہ نگاروں نے شعریت اور نسوانیت کی جو متحد تصویریں کھینچی ہیں ان میں رومانیت کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ وہ صرف عورت کے ظاہری حسن کو شعریت کہتے ہیں اور ہمارے سامنے اس ظاہری حسن کے ایسے دلکش نمونے پیش کرتے ہیں کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ اسی قسم کا حسن ہے جس کے لئے ہمارے شاعروں نے زاہد فریب، توبہ شکن، صبر آزما اور رہزنِ تمکین و ہوش کی ترکیبیں تراشیں یہی حسن ہے جس کے لئے کبھی شاعر کہتا ہے کہ ع

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ

اور کبھی کہہ اٹھتا ہے کہ ع

دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

یہی حسین سیمیں بدن ہے جس کے لئے بدن کا رواں رواں اس طرح قصیدہ خواں ہے ؎

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کو گنہگار کریں ؛ گال وہ صبحِ درخشاں کو نمک پیار کریں
دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں ؛ سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی،
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی،

ان افسانہ نگاروں کے نزدیک عورت صرف اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ لوگ اس کے ظاہری حسن کو دیکھیں، اُن کی اداؤں اور نازوں پر خود کو نثار کر دیں۔ اُسے حاصل کرنے کی کوشش کریں اور وہ انہیں نہ مل سکے۔ وہ مل گئی تو دونوں جہان سے سیری ہو گئی، روحانی لذتیں مادہ پرستی پر قربان کر دی گئیں۔ ایسی عورتوں کے لئے یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اُن میں سیرت کی بھی وہ خوبیاں موجود ہوں۔ جو

صورت میں ہیں۔ وہ انگریزی پھولوں کا گلدستہ ہیں۔ دیکھیں تو نظر فریب، سیلیں چھوئیں تو چھوڑتے نہ بنے۔ خوشبو کے ہونے نہ ہونے سے کوئی غرض نہیں۔ ایسی عورتوں کے دلفریب مجسمے نیاز اور مجنوں کے بعض افسانوں میں موجود ہیں یا اُن افسانوں میں جنہیں انگریزی جامہ اُتار کر ہندوستانی کپڑے پہنا دئے گئے ہیں کیونکہ بے ہراسے نام ہیں، عریانی ہی عریانی ہے، آنکھوں سے ممکن نہیں کہ دیر تک ان جادو بھری تصویروں کو دیکھیں اور اپنا ایمان محفوظ رکھ سکیں۔

ایک چوتھا گروہ اپنے نزدیک نہ صرف عورت کی ظاہری خوبیوں کو اُس کی دلکشی کا معیار سمجھتا ہے نہ اُس کے فطری اور روحانی محاسن کو۔ وہ اُسے آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنانا چاہتا ہے۔ وہ اُس سحر طراز مجسمۂ حُسن میں پھول کی نزاکت، چاند تاروں کی چمک اور عشوہ و ناز کے ساتھ مشک اور عنبر کی خوشبوؤں کے پانے کی تمنا رکھتا ہے۔ اُس کے نزدیک "حُسن پری اس کا اِک جلوۂ مستانہ ہے" اور حوروں کی روحانیت اُس کی بلند منزلوں کا پہلا زینہ۔ حُسن کے اس مجسمے کو مادی صورت دینا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ تصویریں صرف خیال پیدا کر سکتا ہے۔ زبان اور قلم میں اتنی قدرت نہیں۔ اس لئے افسانہ نگار عموماً ان شکلوں کو مبہم طریقے سے بیان کر دیتا ہے، اور خود کو سماوی بلندیوں تک لے جا کر حُسن کے دوسرے پرستاروں کو ان بلند منزلوں کی طرف کھینچتا ہے لوگ ان تصویروں کو پر عظمت نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنے ذہن میں یہ خیال جما لیتے ہیں کہ ہم جس چیز کو دیکھ رہے ہیں وہ ہماری دنیا سے بالکل الگ ہے۔ ایسے موقع پر اِندر کے دربار کی اپسرائیں، پرلوک میں بسنے والی دیویاں یا گوکل کی گلیوں یا بندرابن کے جنگلوں میں گشت لگانے والی گوپیاں بھی ان خیالی مجسموں کا آسانی سے مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

یہی ذہنیت ذرا اور بدلتی ہے تو حُسن کے متوالے عیبوں میں بھی حُسن ڈھونڈھنے لگتے ہیں بعض افسانہ نگاروں نے عورتوں کو اس قدر بلند مرتبہ دینے کی کوشش کی ہے کہ اُن کے عیبوں پر تاویلوں کے دلچسپ رنگ چڑھا کر اُنہیں بھی

مزیب بنا دیا، کسی عورت کی بُرائی کو اُس کی فطرت کی طرف منسوب کردیا، کسی کو شوہ و ناز کہہ کر ٹال دیا اور کسی جگہ کوئی اور تاویل کردی اور کوشش کی کہ افسانہ پڑھنے والا بھی اُن کی سی نظریں پیدا کرے اور عیب بھی حسن نظر آنے لگیں، اس لئے عورت اور اس کی فطرت معصوم ہے، وہ کسی گناہ یا بُرے فعل کی مرتکب نہیں ہوسکتی ہماری نظریں جن چیزوں کو عیب سمجھتی ہیں، وہ اُس کے لئے حُسن ہیں، وہ اُس کی دلفریبی میں اضافہ کرتی ہیں۔

یہاں تک کہ موجودہ افسانہ نگاروں کے جتنے مختلف گروہوں کی ذہنیتیں بتائی گئیں اُن میں سے ہر ایک نے عورت کو کسی نہ کسی حُسن سے متصف کیا ہے خواہ وہ جسمانی ہو یا روحانی، خواہ اُس کا تعلق اس دنیا سے ہو خواہ دوسری دُنیا سے۔ اُن کے نزدیک عورت پری بھی ہے اور حور بھی اس میں پھولوں کی مہک بھی ہے اور تاروں کی چمک بھی۔ اُس کا ظاہر بھی دلفریب ہے اور باطن بھی دلکش۔ لیکن بعض افسانہ نگاروں کے نزدیک دنیا کی تمام بُرائیوں کا مرکز صرف عورت ہے۔ اُس کا حُسن ظاہر بین نگاہوں کے لئے دلکش ضرور ہے لیکن اس کا انجام خوف ناک، انسان میں فطرت نے جتنے بھی جذبات پیدا کئے ہیں اُن سب کو صرف عورت اُبھارتی ہے اور مرد اپنے آپ کو بڑے سے بڑے گناہ سے بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ ایسے لوگوں کے نزدیک عورت دنیا کی سب سے بُری مخلوق ہے۔ عورت کی ایسی تصویریں عموماً آج کل کے بعض نوجوان افسانہ نگاروں کے یہاں موجود ہیں۔

بعض افسانہ نگار صرف اس مقصد کو دُنیا کے سامنے لانے کے لئے لکھتے ہیں کہ عورت صرف محبت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے، اُس کی فطرت اتنی والہانہ ہے کہ وہ دُنیا میں اس کے سوا اور کچھ کام نہیں کرسکتی کہ لوگ اُس سے محبت کریں اور وہ اس کا اثر لے۔ مغربیت نے ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر اس قدر گہرا اثر ڈال رکھا ہے کہ ادبی تخلیقیں بھی اُسی رنگ میں ڈوبی ہوئی نکلتی ہیں۔ اُردو افسانہ نگاروں نے مغرب کے اس اثر کو اس مبالغہ کے ساتھ قبول کیا ہے کہ ڈر ہے کہ ہمیں کہیں عورت

کی فطری خوبیوں پر بھی مبالغہ کا شبہ نہ ہونے لگے۔

یہ سچ ہے کہ عورت کی فطرت آزاد رہنے کے لئے بنائی گئی ہے، وہ ایک ایسی چیز ہے کہ مرد اُسے کھو کر ابدی مسرت حاصل نہیں کر سکتا۔ اُسے پیدا ہونے سے مرنے تک برابر ماں، بہن اور بیوی کی محبت کی تلاش ہوتی ہے، لیکن وہ یہ چاہتا ہے کہ اُس کی مائیں، بہنیں، بیویاں اسی دُنیا کی ہوں۔ حوریں، پریاں یا دیویاں نہیں۔

ہمارے افسانہ نگاروں میں سے ایک نے ایک جگہ عورت کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے: "عورت کے ہاتھ میں ایک مسیحائی اثر ہے۔ اُس کا ذرا سا اشارہ اُس کا خفیف سا سہارا، برسوں کی تکلیف اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے۔ دُکھے ہوئے دلوں کی تسکین، برباد گھروں کی آبادی۔ قدرتی بیماریوں کا قدرتی علاج صرف عورت ہے۔" اسی افسانہ نگار نے عورت کی ایک دوسری جگہ اس طرح تصویر کشی کی ہے۔ اُس نے اُسی رات اپنی عمر بھر میں پہلی مرتبہ موسیقی کو ایک زندہ عورت کی شکل میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا جس کے نغمے کی اُٹھتی ہوئی لَے ہوا کے ذرّوں کو حسین بنا رہی تھی۔ اُس نے اُس رات ایک عورت کے پاؤں کی حرکت کو ایک شعر کی کیفیت اختیار کرتے دیکھا جس سے بے جان زمین میں جان پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دوسرا رومان پرست افسانہ نگار عورت کو "آزاد، رمیدہ، آغوش سے دور" کہہ کر اپنے دل کو تسکین دیتا ہے، کبھی وہ اُسے دُنیا کی محترم ترین مخلوق، ہم پر حکمراں، ایک مجسم لذت ایک تسکین شکل، ایک سحر مریٔ، اور نور مادی" کہہ کر اپنے رومان پرست جذبات کی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ تصویریں روحانیت، رومان، شعر، موسیقی اور سحر کی مجسم تصویریں ہیں، ان تعریفوں میں ایک پیکر محسوس روحانی سرور کا مجسمہ بن کر ہمارے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ ہم اُس کی پرستش کرتے ہیں، اُس کی ساحرانہ اور خیالی تصویر کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ہم صرف تھوڑی ہی دیر کے بعد فطرت کی ان لطیف تخلیق کو اپنی فطرتوں سے بیحد بلند، اپنی دنیاؤں سے دور، اور اپنی فضاؤں سے الگ محسوس کر کے مادی کیف اور سرور سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بیگانگی ہمیں صرف اس لئے غنیمت معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہمیں فن کی سحر کاریوں کے زیادہ سے زیادہ قریب لاتی ہے، اور یہی اس کا سب سے بڑا حسن ہے۔

وقار عظیم

حصۂ نظم

میرؔ تقی

میر محمد تقی میرؔ نام میرؔ تخلص ۱۱۲۵ھ میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر محمد عبداللہ آگرہ کے شرفا میں سے تھے۔ دس سال کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔

تلاشِ معاش اور شوقِ علم میں دلی کا رخ کیا۔ اور سراج الدین علی خاں آرزو کے ہاں ٹھہرے۔ جو علم و فضل میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ مگر یہ سرچشمہ ان کے لئے محض ایک سراب ثابت ہؤا۔

خواجہ محمد باسط کی وساطت سے امیر الامرا نواب صمصام الدولہ نے ان کا کچھ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور میر جعفر عظیم آبادی نے ان میں علم حاصل کرنے کا شوق دیکھ کر بڑی محنت اور توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔

امروہہ کے سید سعادت علی خاں نے ان کی طبیعت کا رنگ دیکھ کر شعر کہنے کا مشورہ دیا۔ ان کی مزاج شناسی نے وہ ساز چھیڑ دیا۔ جن کے نغموں سے تھوڑے ہی دنوں میں سارا شہر گونج اٹھا۔

دلی کی ویرانی کے بعد پریشان حالی میں جگہ جگہ پھرے اور شاد و ناشاد زندگی بسر کرتے رہے۔ آخری عمر میں آصف الدولہ کے بلانے پر لکھنؤ چلے گئے اور باقی زندگی وہیں بسر کی۔

میر ایک غیور، خوددار اور نازک مزاج انسان تھے۔ دل سوز و گداز سے بھرا ہؤا زبان میں انتہا کی صفائی، بیان میں حد درجہ کی دل کشی اور زور، کلام میں ترنم خیالات میں سادگی، جذبات میں بلندی اور طبیعت میں درد مندی۔ میر کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔

غزلیات

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں مُوند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئے آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کاش اب منہ سے برقع اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے
آنکھ مُندے پر اُن نے گو دیدار کو اپنے عام کیا
یاں کے سفید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا
ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

دامن عزلت کا اب لیا ہے میں نے — دل مرگ سے آشنا کیا ہے میں نے
تھا چشمۂ آب زندگانی نزدیک — پر خاک سے اس کو بھر دیا ہے میں نے

ہم سے تو بتوں کی وہ حیا کی باتیں — وہ طرز اور کلام انس ادا کی باتیں
دیکھیں قرآں میں فال غیروں کیلئے — کیا ان سے کہیں یہ ہیں خدا کی باتیں

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو جا پڑا — یکسر وہ استخوانِ شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

سودا

مرزا رفیع نام سودا تخلص۔ سنہ ۱۱۲۵ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے رجحانِ طبیعت شاعری کی طرف تھا۔ آپ نے شاہ حاتم کی شاگردی میں دے دیا۔

طبیعت میں خداداد جوہر پہلے سے موجود تھے۔ کثرت مشق اس پر مستزاد تھوڑے ہی دنوں میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ شاہ عالم بادشاہ نے مشورۂ سخن کے لئے ان کو منتخب کیا۔ لیکن جب شاہ عالم کی قسمت کا ستارہ ڈوب گیا تو سودا بھی دہلی کو چھوڑ کر فرخ آباد چلے گئے۔ کچھ مدت فیض آباد میں بھی قیام رہا۔ اور آخر نواب آصف الدولہ کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور فراغت سے زندگی بسر کرنے لگے۔

مرزا جب قصیدہ پیش کرتے تو شکوہ الفاظ کے ڈنکے بجا دیتے ہیں۔ غزل سناتے ہیں تو دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ مرثیہ پڑھتے ہیں تو سننے والوں کو خون کے آنسو رلواتے ہیں۔ ہجو کرتے ہیں تو حریفوں پر ہستی تنگ کر دیتے ہیں۔ اردو شاعری اس جامعیت کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہیں کر سکی۔

مرزا کی ہمہ گیری نے کسی صنف سخن کو نہیں چھوڑا۔ قصیدے غزلیں مثنویاں۔ رباعیاں۔ قطعے مستزاد۔ تاریخیں۔ پہیلیاں۔ ترجیع بند، مخمس۔ مرثیے اور ہجویں سب کچھ کہیں اور خوب کہیں۔ خصوصیت سے قصائد میں سودا کا پایہ سب سے بلند ہے۔

ستر سال کی عمر میں سنہ ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی اور آغا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔

قصیدہ

اڑ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عزّ و جل

واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آبِ جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گُلِ نَورستہ کی رنگ آمیزی
پوششِ ہا چھینٹ قلمکار بہ دشت و جبل

عکسِ گلبن بہ زمیں یہ ہے کہ جس کے آگے
کارِ نقاشیٔ مانی ہے دوم وہ اوّل

تارِ بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار سے آبِ رواں عکسِ ہجومِ گُل کے
لوٹے ہے سبزے پہ ازبسکہ ہوا ہے بے کل

جوشِ روئیدگیٔ خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوِ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل

اس قدر محوِ تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشمِ سیارِ گلستاں میں جھپکتی نہیں اک پل

آبِ جو گردِ چمن ملعۂ خورشید سے ہے
خطِ گلزار کے صفحے پہ طلائی جدول

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

فیضِ تاثیرِ ہوا یہ ہے کہ آبِ حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل

دانہ جس شور زمیں میں نہ پھلا دہقاں سے
سبزہ واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کشت کرنے میں ہر اک تخم سے از فیضِ ہوا
گرتے گرتے بہ زمیں برگ و بر آتا ہے نکل

جوہری کو چمنستانِ جہاں میں اس فصل
آ گیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے
ہے فضا اس کی تو دو چار ہی دن میں فیصل

اور میرا سخن آفاق میں تا یومِ قیام
رہے گا سبز بہر مجمع و ہر یک دنگل

تا ابد طرزِ سخن کی ہے مرے رنگینی
جلوۂ رنگِ چمن جاوے گا اک آن میں ڈھل

ایک پیٹو کی ہجو

ہے عجیب و غریب زیرِ سما — اک یہاں صورت آشنا میرا
شاہ قانع اگر ولی ہو فقیر — اس کو مانے کبھی نہ یہ بے پیر
دہر نے یہ بڑی حماقت کی — اپنے گھر اس کی لا ضیافت کی
لاکر ایسا ہی ایک دسترخوان — طول و عرض اس کا کیا کروں میں بیان
شرق سے تا بہ غرب بچھوایا — اس پہ تنہا اسی کو بٹھلایا
اس پہ نعماتِ نو جہاں تک تھے — یاں سے آگے وہ اس کے واں تک تھے
اس میں کچھ اس سے ہو گئی ان بن — اس کو اٹھوا دیا پکڑ گردن
ہاتھ بھی یہ نہ ڈالنے پایا — چاٹتا ہونٹ اپنے گھر آیا
کنکری چننے پر ہے اب گزران — معدہ اس کا ہے مرغ کا سنگدان
سنگریزے تلک نہ اس سے بچے — معدے میں اس کے تو پہاڑ پچے
گھر میں اب جس کے دیگچہ کھڑکے — در پہ اس کے یہ بیٹھے یوں اڑ کے
گور سے پھر جو رستم اٹھ کر آئے — میت اس کی اٹھائے یا نہ اٹھائے
خوردنی کی ہو جس زمیں پہ باس — جمع واں کر کے اپنے ہوش و حواس
بیٹھے مکھی کی طرح پے در پے — دونوں ہاتھوں سے سر کو پیٹے ہے
آگ لگ کر کسی کے گھر سے دُود — ایک ذرہ بھی گر کرے ہے نمود
لوگ تو دوڑیں ہیں بجھانے کو — دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو
ہر کسی بنئے کی دوکان پہ جا — اپنی باتوں میں اس کو لے ہے لگا
کام ہر وجہ اپنا کر لیوے — کلے بندر کی طرح بھر لیوے
اس لئے ہجو خلق کرتا ہے — گالیاں کھانے تک بھی مرتا ہے
نانبائی محلہ یوں فریاد — کرے ہے بار دیکھو یہ بیداد
چاٹے ہے چوری سے رفیدے کو — مار ڈالے گا اس ندیدے کو

جو اسے میہمان بلاوے ہے / آفت اپنے وہ گھر پہ لاوے ہے
بیٹھتے ہی نکالے ہے یہ ذکر / پیٹ کی میرے کچھ تمہیں ہے فکر
بھوک کچھ کم ہے ان دنوں میری / روٹیاں سو پچاس اور سیری
ناں با کو کہو یہ ٹکوا کر / جلد ان کو تنور لگوا کر
جب تلک کھانے پک چکیں سارے / ان ہی کو لا کے میرے سر مارے
جب تلک کھانا آوے تب آوے / اسی ٹک ٹک میں جان کھا جاوے
کھانا آوے تو اس طرح لوٹے / جیسے کوئی کسی کا گھر لوٹے
جاوے بازار کو اگر وہ لئیم / خلق سمجھے کہ پہنچی فوج غنیم
ناں با، کنجڑے، بنئے، حلوائی / کہیں آفت کدھر سے یہ آئی
جو ہے دوکان میں سو اس کو چپکے / جان یارب ہماری اس سے بچے
بھوک میں جب ادھر یہ آتا ہے / لوگوں کو کاٹ کاٹ کھاتا ہے
چار کے کاندھے جب یہ جاوے گا / توشے کی روٹی کو بھی کھاوے گا

غزلیات

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں / تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
کیونکر نہ چاک چاک گریبان دل کروں / دیکھوں جو تیری زلف کو میں دست شانے میں
اے مرغ دل سمجھ کے تو چشم طمع کو کھول / تو نے سنا ہے، دام جسے ہے وہ دانے میں
ہم سا تجھے تو ایک نہیں تجھ سے ہیں کئی / جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانے میں
سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر / اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو جو ہوا سو ہوا / بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر! / میرے لہو کو تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا

پہنچ چکا ہے سرِ زخم دل تلک یارو   کوئی رفو کوئی مرہم کر[illegible]
خدا کے واسطے آ، درگزر گناہ سے میرے   نہ ہوگا پھر کبھی اے تُند خو ہوا سو ہوا
یہ کون حال ہے احوالِ دل پہ اے آنکھو!   نہ پھُوٹ پھُوٹ کے اتنا بہا ہوا سو ہوا
دیا اسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا   پھر آگے دیکھیے جو ہو سو ہو، ہوا سو ہوا

رباعیات

سرمایہ عیش، کامرانی تو ہے   آرام دل و مونس جانی تو ہے
گر تو نہیں آوے جینا کس کام کا   میری تو مرادِ زندگانی تو ہے

افسوس ہماری عمر روتے گزری   نت دل سے غبارِ غم ہی دھوتے گزری
دیکھا نہ کبھی خواب میں اپنا یوسف   ہر چند تمام عمر سوتے گزری

کوتاہ نہ عمر مے پرستی کیجے   زلفوں سے تری درازدستی کیجے
ساقی جو نہ ہو شراب ہے آج وہ اس پہ   پانی پی پی کے فاقہ مستی کیجے

انشاء

سید انشاء اللہ خاں نام انشاء تخلص۔ والد کا نام میر ماشاء اللہ خاں ہے۔ آباؤ اجداد نجف سے آکر دلّی میں آباد ہوئے۔ میر ماشاء اللہ خاں ایک عالم فاضل اور حاذق طبیب تھے شعر بھی کہتے تھے۔ انشاء انھی کے دامن تربیت میں پرورش پاکر عالم، فاضل، طبیب اور شاعر ہوئے۔

انشاء کچھ دنوں مرشد آباد میں رہے وہاں سے واپس آکر دہلی میں شاہ عالم بادشاہ کے زینت محفل بنے۔ دہلی سے طبیعت گھبرائی تو شاہ عالم کے بیٹے مرزا سلیمان شکوہ کے پاس لکھنؤ چلے گئے جس نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کچھ دنوں بعد نواب صادق علی خاں کے دربار میں رسائی ہوگئی۔

انشاء علم النفس کے ساتھ حد درجہ کے ظریف بذلہ سنج اور شوخ مزاج تھے۔ مگر انشاء کی فطری ظرافت اور درباری زندگی نے انشاء کو ہزل اور تمسخر کی طرف مائل کر دیا تھا۔

سید انشاء نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ عورتوں کے مخصوص جذبات وخیالات عورتوں ہی کی زبان میں بڑی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔

سید انشاء نے ستر سال کی عمر میں ۱۲۳۳ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی۔

قصیدہ بہاریہ

بگھیاں پھولوں کی تیار کرانے بوئے سمن — کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن
عالمِ اطفالِ نباتات پہ ہوگا کچھ اور — گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر — کرسیٔ ناز پہ جلوے کی دکھا دے گا پھبن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھائے گا رنگ — کوچ پر ناز کی جب پاؤں رکھیگا بن ٹھن
اپنے گیلاس شگوفے بھی کریں گے حاضر — آکے جب غنچہ و گل کھولیں گے بوتل کا ڈہن
اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے — اُودی بانات کی کُرتی سے شگوفے سوسن
پتے ہل ہل کے بجادیں گے فرنگی طنبور — لالہ لادے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تار رگِ ابر بہاری سے کئی — خود نسیم سحر آئے گی بجانے ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلادیں گے — آپڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن
آئے گا ندر کو شیشے کی گھڑی لے کر حباب — یاسمیں پتوں کی پینس میں چلیگی بن ٹھن

نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرہ
ساتھ لے گی نزاکت بھی جو ہے اسکی بہن

غزل

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دُھن میں اِس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں،
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یک بار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اِس دَور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاؔ
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

بندۂ درگاہ کی بھی اک نرالی ہے نماز — عرش سے بھی کچھ پرے ہے اس نمازی کا مقام
ہے خدا ہی سے توقع اب ترے بیمار کی — ورنہ کیا باقی رہا ہے چارہ سازی کا مقام
سید انشاؔ کو نہایت ان دنوں تشویش ہے
بندہ پرور ہے یہاں بندہ نوازی کا مقام

حمد کے چند اشعار

اے خداوند مہ و مہر و ثریا و شفق — ملءِ نور سے ہے ترے جہاں کی رونق
تذکرہ پھر تو ہوا مسئلہ وحدت کا — عقل اوّل نے پڑھا تجھ سے باد بجے کے سبق

ایک مچھر کے متعلق ؎

مچھروں کو ہوا ہے اب کے یہ اوج — دب گئی جس سے مرہٹوں کی فوج
سو کھے سہمے ہیں کالے کالے ہیں — یہ بھی پر کوئی گھوڑے داغے ہیں

ہیں دوپٹے بیں صاف گھس آتے   اور لحافوں میں ہیں سما جاتے
ہے سپیہ پھول کی کلی آن سے   سب کو ہے ایک بے کلی ان سے
کس کو یہ چین لینے دیتے ہیں
نیند آنکھوں کی لوٹ لیتے ہیں

ہیں زورِ حسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر   نام خدا نگاہ پڑے کیوں نہ ڈنڈ پر
یارب سدا سہاگ کی مہندی رچا کرے   پتے پچیں ٹھمکیں رہے آفت ارنڈ پر
یہ باڑ میری کاٹ کے دی کس نے اس قدر   جو تم رگڑ رہے ہو سرو ہی کرنڈ پر
گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ
بلبل ہمارے زخمِ جگر کے کھرنڈ پر

پہنچتو سے چاندنی کے ہے صحن باغ ٹھنڈا   پھولوں کی سیج پر آ کر دے چراغ ٹھنڈا
شفقت سے ہاتھ تو دھر ٹک دل پہ پیچ تا ہو   یہ آگ سا دہکتا سینہ کا داغ ٹھنڈا
مے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر   جس کے دھوئیں سے ساقی ہو وے دماغ ٹھنڈا
ہیں ایک شخص لاتے خس کی شراب انشاؔ
دھو دھا گلاب سے تو کر رکھ ایاغ ٹھنڈا

خواجہ میر درد

خواجہ میر نام درد تخلص صحیح النسب حسینی سید، والد کا نام خواجہ ناصر اور تخلص عندلیب تھا۔ ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ایک مشہور خاندان تھا۔ سوز و گداز تصوف کے شاعری میں ان کو ارث میں ملی تھی۔

۲۹ سال کی عمر میں باپ کی وفات کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور دنیا سے اپنا دامن چھوڑ کر گوشہ توکل میں بیٹھ گئے اور پھر یہ آستانہ توکل و بے نیازی مرکر ہی چھوڑا۔ دلی کا طوفان انقلاب شرافت کے بڑے بڑے ستونوں کو بہا کر لے گیا۔ لیکن خواجہ صاحب کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

غرض اسی طرح درویشانہ اور قلندرانہ زندگی بسر کر کے خواجہ صاحب ۲۴ رجب ۱۱۹۹ھ کو ۶۸ برس کی عمر میں وفات پا گئے۔

خواجہ صاحب نے مختصر دیوان کی منتخب غزلوں میں اخلاق، تصوف، کیفیات قلبی اور واردات حسن و عشق سبھی کچھ موجود ہے۔ خواجہ صاحب وہ پہلے بزرگ ہیں۔ جنہوں نے اردو غزل کی بنیاد عشق حقیقی پر رکھی۔ غزل کے علاوہ میر درد کی رباعیاں بھی شاعری میں خاص مرتبہ رکھتی ہیں ان کا کلام نامانوس ترکیبوں، ثقیل الفاظ اور دوسرے عیوب سے پاک ہے

غزلیات

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تیری حرف دُوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے مُنہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقشِ قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

افشائے رازِ عشق نہ ہو آبِ اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

اس مسندِ عزت پہ کہ تُو جلوہ نما ہے
کیا تابِ گزر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے ہے تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں ہے تیرے غضب سے
اور دل میں بھروسہ ہے تو ہے تیرے کرم کا

مانندِ حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے اِدھر اُدھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشمِ تر آئے تھے دامن تر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اسے لے کر چلے

جوں شرر ہے ہستیِ بے بُود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
دردؔ کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

مژگانِ تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں
جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں
ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار
ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں
کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط
پر آدمیں تو موجِ نسیمِ وزیدہ ہوں
یہ چاہتا ہے تو تپشِ دل کہ بعدِ مرگ
کنجِ مزار میں بھی نہیں آرمیدہ ہوں
اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غم زدہ تو قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

مخمس

ہم وحشیوں کے دل میں کچھ اور ہی اُمنگ ہے
وحشت بھری ہے اور ہی دل میں ترنگ ہے
ان گمشدوں کے آگے تو عنقا بھی دنگ ہے
اہلِ فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوحِ مزار بھی مری چھاتی پہ سنگ ہے

نے فکرِ صبح کی نہ غمِ شام تھا ہمیں
نے شوقِ بادہ تھا نہ سرِ جام تھا ہمیں
جب تک عدم میں تھے عجب آرام تھا ہمیں
اس ہستیٔ خراب سے کیا کام تھا ہمیں
اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے

نے یاں ہوائے آب ہے نے حرصِ نان کی
نے وحشتِ سفر نہ ہوس ہے جنان کی
زاہد یہ باتیں سب ہیں ترے امتحان کی

فارغ ہو بیٹھ فکر سے دونوں جہان کی
خطرہ جو ہے سو آئینۂ دل پہ زنگ ہے

نہ ہاتھ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے
کسے دماغ کہ ہو دُو بدُو کمینے سے
نہیں خیال مجھے خاتمِ سلیمانؑ کا
برنگِ نام ہوں برکندہ دل نگینے سے
ترقی اور تنزل کو یاں کے کچھ عرصہ
مثالِ ماہ زیادہ نہیں مہینے سے
مآلِ کار سمجھایا ظہورؔ نے ہم کو
یہ نقد مال لگا ہاتھ اس دفینے سے
بسانِ دانۂ انگور سے پرستوں نے
لیا ہے فیض مرے دل کے آبگینے سے

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
ہرچند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

میر حسن

میر غلام حسن نام، حسن تخلص دلی میں پیدا ہوئے بارہ برس کی عمر میں اپنے خاندان سمیت فیض آباد چلے گئے لیکن کچھ مدت بعد لکھنؤ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے۔

تصانیف میں ایک دیوان گیارہ مثنویاں اور شعرا کے اردو کا تذکرہ موجود ہے۔ ان کی مثنوی "سحر البیان" کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی اور مثنوی کو نہیں ہوئی۔ اس مثنوی کا درجہ اردو زبان میں بہت بلند ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح تو یہ ہے کہ آج تک اس پایہ کی مثنوی اردو زبان میں نہیں لکھی گئی۔

میر حسن کی زبان میں صفائی، روانی، طرز ادا میں شوخی اور غایت درجہ کا بانکپن ہے:

جلوسِ شاہانہ

نکل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار
کئے خوان گوہر کے اس پر نثار

زبس تھا سواری کا باہر ہجوم
ہوا جب کہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم

برابر برابر کھڑے تھے سوار
ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار

سنہری روپہلی وہ عماریاں
شب و روز کی سی طرح داریاں

چمکتے ہوئے بادلے کے نشاں
سواروں کے غٹ اور پالوں کی شاں

ہزاروں ہی اطراف میں پالکی،
جھلابورنی، جگمگی، نالکی،

کہاروں کی زربفت کی کرتیاں
اور ان کے دبے پاؤں کی پھرتیاں

بندھیں پگڑیاں تاش کی سر اوپر
چکا چوندہ میں جس سے آوے نظر

وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے
جھلک جس کی ہر ہر قدم پر پڑے

وہ ماہی مراتب وہ سرو رواں
وہ نوبت کہ دولہا کا جیسے سماں

وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما
سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا

وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی
قدم با قدم با لباسِ زری

بجاتے ہوئے شادیانے تمام
چلے آگے آگے بصد شاد کام

سوار اور پیادے صغیر و کبیر
جلو میں تمامی امیر و وزیر

وہ نذریں کہ جس جس نے تھیں ٹھانیاں
شہ و شاہزادے کو گزرانیاں

ہوئے حکم سے شاہ کے پھر سوار
چلے سب قرینے سے باندھے قطار

سجے اور سجائے سبھی خاص و عام
لباس زری میں ملبّس تمام

طرق کے طرق اور پرے کے پرے
کچھ ادھر اُدھر کچھ ورے کچھ پرے

مرصّع کے سازوں سے کوتل سمند
کہ خوبی میں روح القدس سے دوچند

وہ فیلوں کی اور میکڈنبر کی شان
جھلکتے وہ مقیش کے سائباں

چلے پایۂ تخت کے ہو قریب
بدستور شاہانہ نپتے جریب

سواری کے آگے پئے اہتمام
لئے سونے روپے کے عاصے تمام

نقیب اور جلودار اور چوبدار
یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار

اسی اپنے معمول و دستور سے
ادب سے تفاوت سے اور دور سے

یلانو! جوانو! بڑھے جائیو!
دو جانب سے باگیں لئے آئیو

بڑھے جائیں آگے سے چلتے قدم
بڑھے عمر و دولت قدم با قدم

غرض اس طرح سے سواری چلی
کہے تو کہ بادِ بہاری چلی

(از سحرالبیان)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ چچا نے پرورش کا بار اٹھایا۔ ابتدائے عمر میں انھوں نے فارسی زبان کو نہایت محنت اور شوق سے سیکھا۔ اور اس میں کمال حاصل کیا۔ اور فارسی شاعروں میں استاد مانے گئے۔

مرزا غالب اردو شاعری میں نئی طرز کے موجد خیال کئے جاتے ہیں۔ ان کا تخیل بلند اور مضامین عالی ہیں۔ فلسفہ ان کے کلام کا بڑا جزو اور جدت ادا خاص جوہر ہیں۔ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ۷۲ برس کی عمر میں دنیا سے رحلت کی۔
غالب کی اردو تصنیفات میں دیوان غالب، عود ہندی، اردوئے معلیٰ، فارسی میں کلیاتِ غالب، پنج آہنگ، قاطع برہان، نامۂ غالب، مہر نیمروز، دستنبو اور سبد چین مشہور کتابیں ہیں۔

مرزا کے بے شمار شاگرد تھے۔ جن میں مولانا الطاف حسین حالی نے بڑا نام پایا۔ حالی نے مرزا کے حالات زندگی "یادگار غالب" میں لکھے ہیں۔
مرزا کی زندگی میں ان کے کلام کی کوئی قدر نہ ہوئی وہ خود لکھتے ہیں ع

شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اور یہ درست ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے۔ غالب کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھتا جاتا ہے۔ مرزا نے نظم و نثر میں جو موتی بکھیرے ہیں۔ وہ اردو ادب کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔

قطعہ

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو۔ جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ۔ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ۔ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرود و شور، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ۔ نوائے سروش ہے

غزل

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیاء مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے
آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے!

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں
کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں — یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے — نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زباں رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
ہم کو ان سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر - گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل - اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں"
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے"
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر - جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چاردہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا - گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

ناداں ہو - جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیک اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو - نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

جوئے خوں، آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں - تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

ذوق

خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق ۱۲۰۴ھ میں دلی میں پیدا ہوئے
یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنت ہند کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

ہوش سنبھالا تو حافظ غلام رسول شوق سے پڑھنے لگے یہاں ہر وقت شعر و شاعری کی محفل گرم رہتی تھی۔ شیخ کو یہ شاعرانہ ماحول ملا۔ تو ابتدائی عمر میں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا۔ شروع میں حافظ شوق سے اور بعد میں شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے۔ اور مشاعروں میں غزلیں پڑھ کر داد سخن لینے لگے۔

شاہ نصیر ولی عہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے وہ دکن چلے گئے، در ولی عہد کی غزلوں کی اصلاح کا کام شیخ کے سپرد ہوا۔ شیخ کی عمر ابھی ۱۹ سال کی تھی۔ کہ شاہی دربار میں ایک قصیدہ پڑھا جس پر خوش ہو کر بادشاہ نے انہیں خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔

شیخ نے اردو شاعری میں انوکھے انداز، جدید خیالات اور روزمرہ کی بنیاد رکھی اس کے علاوہ قصائد میں ذوق کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

۷۶ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہہ سکے ہیں۔ ذوق آج جہاں سے گذر گیا۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

قصیدہ

خضرِ نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو
اے شاہ راہ دل پر چشمِ ہنروری ہو

منظور اب نظر میں تب شغلِ آئینہ ہوں
روشن قلم سے میرے تاجِ سکندری ہو

تارہ کی طرح چمکے ذرّہ میرے سخن کا
اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو

میں رستمِ معانی اور سیستانِ سخن ہے
دیتا جو زورِ قسمت دل کو تناوری ہو

برگشتہ بخت اپنا گر آئے راستی پر
گر دل بھی سرنگوں پھر دیکھا اپنی سروری ہو

یہ کہہ رہا تھا میں جو یکبار عقل بولی
وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو

تجھ کو خبر نہیں کیا ہے دورِ شاہِ اکبر
قدرت سے پست جس کی شانِ سکندری ہو

ہے فکر نیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں
اور دل کا اس کے مقصد خود بندہ پروری ہو

مثلِ سحاب جا کر باندھے ہوا فلک پر
جس پر کہ اس کی چشمِ الطاف سرسری ہو

دربار میں تو اس کے ہو بہرہ یاب جا کر
بہروزی ہو وے میری اور تیری بہتری ہو

لیکن یہ رسائی اس وقت ہوگی روشن
جب خضرِ راہ تیری، طبعِ سخنوری ہو

تو بھی تو سوچ دل میں تیرے دُرِ سخن کا
اس کے سوا جہاں میں کون آج جوہری ہو

اس کی نظر چڑھیں گر یہ تابدار گوہر
پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو

تب بحرِ فکر میں دل غوّاص ہو کے اترا
معلوم تا کہ سب کو زورِ شناوری ہو

مطلع یہ ہاتھ آیا شاہوار بن کے موتی
شرمندہ جس کے آگے صدف کانِ جوہری ہو

شاہا! نظرِ کرم کی جس ذرّہ پر ذری ہو
وہ آسماں پہ جا کر خورشیدِ خاوری ہو

دیکھی ہے چینِ ابرو آئینہ جبین میں
کیونکر نہ تن میں اسکے ہیبت سے تھرتھری ہو

یہ آستانِ دولت ہے سجدہ گاہِ عالم
دل کو تری عقیدت اور رنگِ سرمدی ہو

دارا کو تیرے در تک ہو کس طرح رسائی
درباں جو تیرے در کا کرتا سکندری ہو

باغِ جہاں میں نرگس نے کیوں نہ جام زریں — جب ہر گدا کو دیتا اک ساغرِ زری ہو
دکھلائے آبداری جب تیغ شعلہ دم کی — شیروں کے دل میں ٹھنڈا خونِ دلاوری ہو
کشتِ امل کو سرسبز آبِ گہر سے کر دے — ابرِ کرم کی تیرے جب فیض گستری ہو
بیشہ میں معدلت کے، وہ شیر ہے تو شاہا! — توشیرواں کو جس سے ہرگز نہ ہمسری ہو

گر آفتاب تیرا ڈالے کرن کو اپنی!
تاجِ گدا کا جلوہ، جوں تاجِ قیصری ہو

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا پائے نگاہ، — اس طرح جاتے ہیں دیکھا پاک دامن آب میں
پھرتا ہے سیلِ حوادث سے کہیں مردوں کا منہ — شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں
صحبتِ اہلِ صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں — زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر — پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر
کیا ڈھونڈھے دشتِ گمشدگی میں مجھے کرے — عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر
ساقی! بطِ شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی — خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے — اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے — پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کیا فائدہ فکرِ بیش و کم سے ہوگا — ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے — جو کچھ کہ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

نسیم

پنڈت دیا شنکر نسیم ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ کے ایک کشمیری برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم لڑکپن میں پائی۔ شاعری میں خواجہ آتش کے شاگرد ہوئے۔ جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔

ان کی مثنوی گلزارِ نسیم کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔ [illegible] جذبات نگاری، ایجاز و اختصار، [illegible] استعارہ، تشبیہ، تمثیل، [illegible] غرض تمام شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں۔ نسیم کا نام گلزارِ نسیم کی بدولت ہمیشہ زندہ رہے گا۔

بادشاہ زین الملوک اور تاج الملوک کی ملاقات

پہنچے ہی گجر وہ شاہِ زرّیں باہ — چاروں شہزادے لے کے ہمراہ
مشرق سے رواں ہوا دلاور — جس طرح اُفق سے شاہِ خاور
بجلی سے جو زرق برق آئے — فرشِ ابر کی طرح بچھتے پائے
دیکھا تو تمام دشت گلزار — دائیں بائیں دو رستہ بازار
غافل تھے کہ سبز باغ ہے یہ — پہنچے ہی جگر کا داغ ہے یہ
تجویز رہے تھے سب کے سب دنگ — جادو افسوں، طلسم، نیرنگ
کیا لشکری اور کیا شہنشاہ — سناٹے میں تھے کہ اللہ اللہ
دیکھے جو جواہرات کے ڈھیر — سب اُن کی ہوس سے ہو گئے سیر
شہزادے نے آمد اُن کی پائی — کی تا درِ خانہ پیشوائی

دونوں میں ہوئیں جو چار آنکھیں
دولت کی کھلیں ہزار آنکھیں

ایوانِ جواہریں میں آئے
الماس کے شہ نشیں میں آئے

وہ چتر کے زیرِ سایہ بیٹھے
افسر سب پایہ پایہ بیٹھے

جو جو کہ تواضعات ہیں عام
لے آئے خواص نازک اندام

چکنی ڈلی، عطر، الائچی۔ پان
نُقل و مے و جام و خوانِ الوان

رغبت سے انہیں کھلا پلا کے
بولا شہزادہ مسکرا کے

اس تاجِ شہی میں کے نگیں ہیں؟
کے نام و نشانِ دل نشیں ہیں؟

سلطاں نے کہا بصد لطافت
یہ چار ہیں عنصرِ خلافت

اک اور ہوا تھا اور حشم
وہ نورِ بصر تھا دشمنِ چشم

جب لائے یہ گُل بکاؤلی کا۔
نکلا تب غار روشنی کا

پوچھا اس نے وہ اب کدھر ہے؟
سلطاں نے کہا کہ کیا خبر ہے؟

پوچھا شہزادے نے کہ یا شاہ
صورت سے ہے اس کی کوئی آگاہ

اک ان میں سے چشم آشنا تھا
گویا اُسی شاہزادے کا تھا،

بولا کہ حضور ادھر تو دیکھیں
دیکھا تو کہا مری نظر میں

صورت وہی رنگ و رُو وہی ہے
لہجہ وہی گفتگو وہی ہے،

یہ سُنتے ہی اُس نے خندہ کر کے
سر پاؤں پہ رکھ دیا پدر کے،

سر قدموں سے شاہ نے اٹھایا
فرزند کو چھاتی سے لگایا،

لے لے کے بلائیں کاکلوں کی،
پیشانی چومی پیٹھ ہتھوں کی،

(گلزارِ نسیم)

مولوی محمد حسین آزاد

مولوی محمد حسین آزاد کا مکمل تعارف حصہ نثر میں موجود ہے۔
مولانا آزاد نے جہاں اردو نثر میں نگارش کے موتی بکھیرے
ہیں وہاں اردو نظم میں نیچرل شاعری کی ایجاد کا سہرا بھی
انھی کے سر پر ہے۔

رات

آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادیٔ مشکیں نسب ہے تو

ہوتا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا
اڑتا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا

تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں
لہرانا پرنیان و حریر سیاہ میں

چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پہ
زرہاں فشاں ہیں یہ اڑے گا جہان پر

تا صبح ہو دیے کا دگر روزگار بند
آرام مسلکم عام ہو اور کار و بار بند

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی

دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

رستے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں

بجلی ہنسے تو رخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
چھرا ہے تیرا حکم اِدھر آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے
اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے

خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی — اور رات سائیں سائیں سی کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پر اور شاہ تخت پر — ماہی بزیرِ آب ہے، طائر درخت پر
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے — دامانِ دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی — چوکا ہے بلکہ رہزنِ نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے — عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے یا کہ پیٹ میں — سب آ گئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خوابِ عدم گیا
دریا بھی اب تو چلتے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر — بیٹھا تھا جس کا سکہ زمیں آسماں پر
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے — رکھ کر کرن کا تاج نکلتا ہے شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے — سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

اولوالعزمی

ہے سامنے کھلا ہوا میدان چلے چلو
باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں دشت و کوہ جیسے کہ پھولا پھلا چمن
دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن

کبک دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھولے اپنے نشان ننگ و نام نے
باندھی کمر ہے کس کے ہر ایک شہسوار کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے
دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم
کرتے ہو کیا امید میں نہ بہار تم
میدان عزم و جزم کے ہو شہسوار تم
بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمت مرداں چلے چلو

آئینۂ دل کا گرد سفر سے اجال دو
پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو
شیطاں جو شبہ ڈالے تو سر سے نکال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو
اور آپ بن کے شیر نیستاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تابِ قرار ہے
کرنا ہے جو کہ کام تو کیا انتظار ہے ؟
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے
ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لے لیا میداں چلے چلو

رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم
اور ہو کبھی صلے کے نہ امیدوار تم

عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دو رخ کو آبِ فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے
آبِ رواں ہیں چشموں سے ہو کے نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے
جو تھم رہے یہاں وہیں وہ آج کل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے
چمکا یا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے
اب خاتموں پہ آ گئے ہیں ان کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو مٹ سکے
وہ گونجا طبلِ فتح کہ میدان لے لئے
ہے کرنائے جنگ کی الحان بڑھے چلو

مولانا الطاف حسین حالی

۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ان کے مورث اعلیٰ ہرات سے ہندوستان میں آئے۔ اور پانی پت کے قاضی مقرر ہوئے۔

مولانا حالی کی تعلیم و تربیت باقاعدہ نہیں ہوئی۔ اپنے طور پر تحصیل علوم میں مصروف رہے۔ اور فارسی عربی اور طب میں خاصی دسترس حاصل کر لی سترہ برس کی عمر میں شادی ہوگئی۔ لیکن تحصیل علم کا شوق غالب تھا۔ لہذا روپوش ہو کر دلی چلے گئے اور علم حاصل کرنے لگے۔

قیام دہلی کے زمانے میں شاعری کا شوق پیدا ہوا اور مرزا غالب سے اصلاح لینے لگے۔ مرزا کی عادت تھی کہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر مولانا کے اشعار دیکھ کر کہا۔ کہ "اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے"۔

حالی اردو شاعری میں مجدد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ہی زلف و رخسار سے نکل کر قومی اور نیچرل شاعری کی بنیاد رکھی اور "مسدس حالی" ایک زندہ جاوید شاہکار کی حیثیت سے قوم کے سامنے پیش کی۔ جو سادگی کا مرقع اور اثر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ان کی نثر بھی شعروں کی طرح سادہ اور حقیقت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری کے علاوہ حیات جاوید، یادگار غالب اور حیات سعدی فن سوانح نگاری کی اچھی مثالیں ہیں۔

انتخاب از مسدس

ولادت آنحضرت صلعم سے قبل عرب کی حالت

وہ دیں جس نے اعدا کو اخواں بنایا — وحوش اور بہائم کو انساں بنایا
درندوں کو غمخوارِ دوراں بنایا — گڈریوں کو عالم کا سلطاں بنایا
وہ خطہ جو تھا ایک ڈھوروں کا گلہ
گراں کر دیا اس کا عالم سے پلہ

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا — نہ کشورستاں تھا نہ کشور کشا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا

نہ آب و ہوا ایسی تھی روح پرور — کہ قابل ہی پیدا ہوں جس سے جواہر
نہ کچھ ایسے ساماں تھے واں میسر — کنول جس سے کھل جائیں دل کے سراسر
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی
فقط آبِ باراں پہ تھی زندگانی

زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں — لوؤں کی لپٹ بادِ صرصر کے طوفاں
پہاڑ اور ٹیلے سراب اور بیاباں — کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی
عرب اور کل کائنات اس کی یہ تھی

نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی — نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی

وہی اپنی فطرت پہ طبعِ بشر تھی خدا کی زمیں بن جُتی سر بسر تھی
پہاڑ اور صحرا میں ڈیرا تھا سب کا
تلے آسماں کے بسیرا تھا سب کا

کہیں آگ پُجتی تھی واں بے محابا کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
بہت سے تھے تثلیث پر دل سے شیدا بتوں کا عمل سو بسو جا بجا تھا
کرشموں کا راہب کے تھا صید کوئی
طلسموں میں کاہن کے تھا قید کوئی

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا خلیلؑ ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہدیٰ کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نامِ حق کا نہ تھا کوئی جویا

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزیٰ پہ وہ نائلہ پر فدا تھا اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

نہ ٹلتے تھے ہرگز جو اڑ بیٹھتے تھے سلجھتے نہ تھے جب جھگڑ بیٹھتے تھے
جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
بلند ایک ہوتا تھا گر واں شرارا
تو اس سے بھڑک اٹھتا تھا ملک سارا

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی　　صدی جس میں آدھی انہوں نے گنوائی
قبیلوں کی کر دی تھی جس نے صفائی　　تھی اک آگ ہر سو عرب میں لگائی
نہ جھگڑا کوئی ملک و دولت کا تھا وہ
کرشمہ اک ان کی جہالت کا تھا وہ

اسی طرح اک اور خوں ریز ہیجا　　عرب میں لقب حرب داحس ہے جس کا
رہا ایک مدت تک آپس میں برپا　　بہا خون کا ہر طرف جس میں دریا
سبب اس کا لکھا ہے یہ اصمعی نے
کہ گھوڑ دوڑ میں چند کی تھی کسی نے

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا　　کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا　　کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا
یونہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یونہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر　　تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھی شوہر کے تیور　　کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

جوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی　　شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
تعیش تھا غفلت تھی دیوانگی تھی　　غرض ہر طرح ان کی حالت بری تھی
بہت اس طرح گزری تھیں ان کو صدیاں
کہ چھائی ہوئی نیکیوں پر تھیں بدیاں

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت　　بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا

مرثیہ غالب:

کیا کہوں حال دردِ پنہانی — وقت کوتاہ و قصّہ طولانی
عیشِ دُنیا سے ہوگیا دل سرد — دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال — گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گمان — تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ سراب — جامِ جمشید و راحِ ریحانی
لفظِ مہمل ہے نطقِ اعرابی — حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی — اک تماشا ہے حُسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک — چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اِک مشتِ خاک کے بدلے — گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دُنیا نے آشنائی کی — اِس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر — تُو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ — ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وُہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی — صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِ وصل سے محروم — جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس — جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقاتر ہے — شان ہو جس میں دل رُبائی کی
جنس کا سد سے ناروا تر ہے — خُوبیاں جس میں ہوں خدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس — آج خاقانی و سنائی کی
رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد — اسد اللہ خان غالب مرد

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج، شوخ مزاج — رند اور مرجعِ کرام و ثقات

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

دل میں چبھتا تھا وہ اگر بے مثل — دن کو کہتا تھا دن اور رات کو رات

ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں — کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل — کس سے دادِ سخن وری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضموں ہے نوحۂ استاد — کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں

لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہلِ انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں

غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حسن و جمال کی صورت — نظم غنج و دلال کی صورت

تہنیت اِک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئینہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت

اس کی توجیہ سے بگڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگ ہجراں وصال کی صورت

لطف آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

(ناتمام)

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جمال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا

کاوش میں ہے الٰہی دُگدا میں ہے طبیعی
جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا

چھوٹے ہوئے ہیں گو جی پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

گو علم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

پھندے سے تیرے کیوں کر جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا

ان کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا

دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری، جاں ہے سو مال تیرا

ہے پُر زوال سے دل اس کا قوی زیادہ
رکھتی ہے آسرا یاں جو پیر زال تیرا

ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی
یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا

سرور جہان آبادی

منشی درگا سہائے سرور ۱۸۷۳ء میں قصبہ جہان آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا ہوئے۔ جہاں ان کے بزرگ قصبہ کے رئیس اور زمیندار تھے۔

سرور بہت جلد اور بے تکلف شعر کہتے تھے۔ اور ہمیشہ شاعرانہ خیالات میں غرق رہتے تھے۔ تمام عمر مالی پریشانیوں میں گذری اور اپنی پریشانیوں سے تنگ آکر انہوں نے اپنا کلام بیچنا شروع کر دیا تھا

سرور کا کلام جذبات نگاری کا مرقع ہے۔ وہ اردو اشعار میں مناسب ہندی الفاظ کو بڑے حسن و خوبی سے ادا کرتے ہیں عین عالم شباب میں وفات باقی۔

(ماخوذ از رسالہ عصری)

وصفِ زبان

ترے نطق میں ہے عجب جاں فزائی شکستہ دلوں کو ہے تو مومیائی
بھری تجھ میں ہے کوٹ کر دلربائی تری ہر ادا میں ہے رنگیں ادائی
وہ جادو بیاں نطق کی تو دلہن ہے
کہ لٹ تیرے گیسو کی زلفِ سخن ہے

جواہر کی لڑیاں ہیں فقرے مسلسل کہ ہے تو فصاحت کی گردن کی ہیکل
ستم! تیری شوخی غضب! تیری چل بل مگر ہے کسی بت کے پاؤں کی چھاگل
تکلم کے گھنگرو بجاتی ہے چھم چھم
کہ تو ناطقہ کو نچاتی ہے چھم چھم

پپیہا کبھی بن کے تو بولتی ہے کبھی بن کے طوطی شکر گھولتی ہے
ہر اک راز سربستہ کو کھولتی ہے کہ کانٹے میں پھولوں کو تو تولتی ہے
سخن سنج ہے تیری میزانِ دانش
ترا نطق ہے جو ہر کانِ دانش

بنایا عجب تیرا قدرت نے پیکر ملا نطق کا روغن قاز منہ پر
کیا نظم نے زیب سر لا کے جھومر پنہایا تجھے نثر نے اپنا زیور
بلاغت نے ہاتھوں میں مہندی لگائی
فصاحت نے زلفِ معنبر بنائی

ذہن میں جو تو بن کے تقریر آئی ترے ساتھ لفظوں کی تاثیر آئی
لئے حسن معنی کی تنویر آئی کہ تو نطق کی بن کے تصویر آئی
بجاتی ہوئی ارگنِ نطق آئی

اُڑاتی ہوئی تو سن نطق آئی

وہ دلچسپ نیچر کا چھیڑا ترانہ — کہ غش ہوگیا جس کو سُنکر زمانہ
کیا نطق نے تیرے گیسو میں شانہ — کہ بنتی وضع تیری عجب شاہدانہ
تجھے قال نے اپنے سانچے میں ڈھالا
رنگیلی! غضب تو نے جوبن نکالا!
فصاحت کے پھولوں کی اوا گہنے والی — تکلم کے پردے میں اوا رہنے والی
کسی کی کڑی تو نہیں سہنے والی — کہ ہے ایک کی مُنہ پہ دس کہنے والی
نہیں تجھ کو صولت پناہوں کی ہیبت
کہ غالب نہیں تجھ پہ شاہوں کی ہیبت
سناں ہو کہ نیزہ - چھُری ہو کہ خنجر — زرہ ہو کہ بکتر ہو - یا خود و مغفر
سپر اور تفنگ و مہیم - یا تاج و افسر — ہیں تیرے لئے اے زباں سب برابر
وہ آزاد رَو ہے کہ رُکتی نہیں تُو
وہ سر ہے - در شہ پہ جھُکتی نہیں تُو
جو شیلے جوانوں کو لڑوانے والی — اکھاڑے میں شیروں سے بھڑ جانے والی
سواروں کے نیزوں کو چمکانے والی — شجاعت کے شعلوں کو بھڑکانے والی
جو تو بڑھ کے کرتب دکھاتی ہے رن میں
دلیروں کی ہمت بڑھاتی ہے رن میں
بندھاتی ہے تو ماندہ بیووں کی ہمت — یتیموں سے کرتی ہے اظہارِ شفقت
مریضوں کو دیتی ہے تسکینِ صحت — کہ ہے تیرے لب کی مفرح حلاوت
ترے ہونٹ ہیں نوش دا روئے سادہ
مقوی ہیں یا قوتیوں سے زیادہ
کہیں شہد ہے تو کہیں قند ہے تو — مواعظ کہیں ہے. کہیں پند ہے تو
دہن میں لفظ بند ہر چند ہے تو — مگر وقتِ تقریر کب بند ہے تو

روانی میں ہے سیل۔ چلنے میں صرصر
چھلاوہ ہے شوخی میں۔ تیزی میں خنجر
عیاں ہیں ترے نکتہ سنجوں پہ جوہر　　کہ ہے تو بشر کے فضائل کا زیور
ہر اقلیم میں ہے ترا سکۂ زر　　کہ زیرِ نگیں ہے ترے ہفت کشور
چمک تیری ہر تاج و دیہیم میں ہے
نئی شاہزادی ہر اقلیم میں ہے

نسیم سحر

کیا جیتی جیتی! آہ! نسیمِ سحر ہے تو　　آرامِ جاں ہے، راحتِ قلب و جگر ہے تو
نورِ نگاہ و دیدۂ اہلِ نظر ہے تو　　سرمایۂ حیات، فروغِ بشر ہے تو
تو وہ کہ تیرے دم سے معطر مشامِ شوق
کرتی ہے اک نگاہ میں سرمست جامِ شوق
آتی ہے تو چمن میں جو لے کر پیامِ صبح　　بھرتی ہے آبِ گوہرِ شبنم سے جامِ صبح
آنے سے تیرے باغ میں اے خوش خرامِ صبح　　ہوتا ہے ہر روش پہ نیا اہتمامِ صبح
کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں غنچے چٹکتے ہیں،
شاخوں پہ طائرانِ غزل خواں چہکتے ہیں،
گلگشتِ باغ کیا جو گلستاں میں تو نہ ہو　　سبزی نہ ہو گیاہ میں پھولوں میں بو نہ ہو
یہ جوشِ گل چمن میں یہ جوشِ نمو نہ ہو،　　سبزہ میں تازگی یہ لبِ آبِ جو نہ ہو
تو بھر کے ہاتھ سے نہ پلائے جو جامِ شوق
تازہ نہ ہو گلوں کا چمن میں مشامِ شوق

میر انیس

میر ببر علی نام انیس تخلص ۱۸۰۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے بعد کو ان کا خاندان لکھنؤ چلا آیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی انیس مرثیہ گوئی کے بادشاہ تھے۔ اور یہ فن ان کے آبا و اجداد کا خاص حصّہ تھا۔ وہ خود فخریہ کہتے ہیں ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیّر کی مدّاحی میں

انیس کا شمار اردو زبان کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو زبان میں کامیاب رزمیہ نظمیں کہیں۔ کلام میں اچھوتے استعارے۔ تشبیہیں صنائع و بدائع ہیں۔

انیس صحت محاورہ کا بھی خاص خیال رکھتے تھے۔ اور بہت سے نئے محاورے بنا گئے۔ بہت پُرگو شاعر تھے۔ لیکن باوجود پُرگوئی کے ان کے کلام میں ابتذال یا عامیہ پن نظر نہیں آتا۔

آمدِ صُبح

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح　　گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح　　سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم　　مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم　　سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار　　تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار　　کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سُو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں　　تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤسِ آسماں
ذروں کی روشنی پہ ستاروں کا تھا گماں　　نہرِ فرات بیچ میں تھی مثلِ کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سرِ کوہِ طور تھی
گویا فلک سے بارشِ بارانِ نور تھی

اوجِ زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی　　کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی
ہر خشک و تر پہ تھا کرمِ بحرِ سرمدی　　بے آب تھے مگر دُرِ دریائے احمدی
روکے ہوئے تھی نہر کو امت رسول کی

سبزہ ہرا تھا خشک تھی کھیتی بتولؑ کی

وہ پھولنا شفق کا وہ بینائے لاجورد مخمل سی وہ گیاہ وہ گل سبز و سرخ و زرد
رکھتی تھی پھونک کر قدم اپنا ہوائے سرد یہ خوف تھا کہ دامن گل پر پڑے نہ گرد
دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

گرمی کی شدت

گرمی کا زور جنگ کی کیونکر کروں بیاں ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر
وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب خیمے تھے جو حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے چشمہ فرات کا
جھیلوں سے چارپائے نہ اٹھتے تھے تا بہ شام مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثل موم خام
سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے
آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر خس خانہ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں

پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار — ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار — کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ بار دار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتّے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے — آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے — گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت — پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت — سنولا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہرے پہ ڈالے ہیں
توسن ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر — صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج و مسافرت میں ہیں سلطانِ بحر و بر — لب ہائے گل سے خشک ہیں چہرے عرق میں تر
آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشک بار اٹے ہیں غبار سے

اکبر الہ آبادی

۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء میں ضلع الہ آباد کے قصبہ بارہ میں پیدا ہوئے ان کے والد سید تفضل حسین اپنے زمانے کے مشہور صاحب علم اور حساب داں تھے۔ شہر کے اکثر بچے انہیں سے پڑھا کرتے تھے اکبر بھی اپنے والد سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔

پندرہ سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ تو کام کاج کی سوجھی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس لئے کامیابی نہ ہوئی آخر بڑی تنگ و دو کے بعد جمنا کے پل پر مزدوری کا حساب کتاب کرنے پر نوکر ہو گئے۔ یہیں آپ نے انگریزی زبان سیکھنی شروع کی۔ پھر ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ اور ساتھ ہی ساتھ قانون کی کتابیں بھی پڑھتے رہے۔ آدمی ہوشیار اور ذہین تھے۔ وکالت میں کامیاب ہوئے۔ اور نائب تحصیلدار لے لئے گئے۔ اور سیشن جج پر ریٹائر ہوئے۔ حکومت سے خان بہادر کا خطاب بھی ملا۔ آخر ۱۹۲۱ء میں ۷۵ سال کی عمر میں اس دنیا سے چل بسے۔

اکبر کا شمار اردو زبان کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ عام شاعروں کی طرح اکبر کی شاعری بھی غزل سے شروع ہوئی۔ لیکن جلد ہی انہوں نے مذہب، اخلاق، سیاست، معاشرت ایسے اہم مسائل کیطرف توجہ کی۔ انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئی طرز کی بنا ڈالی۔

اکبر کی شاعری کا اصلی جوہر ان کی ظرافت ہے۔ انہوں نے ظرافت کے پردے میں قوم کے گندے مقاصد میں نشتر لگائے ہیں اور قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ انگریزی الفاظ کو نہایت عمدگی سے شعروں میں کھپایا ہے۔

برقِ کلیسا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں جو دوچار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ بہار

زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل چہکے

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطفِ تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حسنِ بیاں شوخیٔ تقریر میں غرق
ترکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت بھی نہ رہی
سر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اُس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یا حفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشنِ فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہدِ وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے میرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائے کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامانِ اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ابھی ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

دشمنِ صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذتِ جاں راحتِ روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثرِ آدم و نوح

شجرِ طوبیٰ کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حُور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہے براق و رفرف
تشنگی بندھ گئی ہے قوم کی انجمن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جاں باز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ

اب نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہرِ تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نور ایماں کا ترے آئینہ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحۂ خاطر سے وہ بحثِ بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو ایک

موجِ کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہِ عتاب آپ کو اے جاں نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحبِ فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ اور یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

بنائے ملت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں

ادھر ہے قومِ ضعیف و مسکیں ادھر ہیں کچھ مرشدانِ خود بیں
ادھر نشان اس کا مٹ رہا ہے ادھر وہ اپنے نہ پر رہے ہیں

کٹی رگِ اتحادِ ملت رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آب صافی نہار ہے ہیں نکھر رہے ہیں

صدائے الحاد اٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں

اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی یہی وبا ہے
خیال میٹر کا بڑھ چلا ہے خدا کا انکار کر رہے ہیں

مگر وہاں کی بنا ہے نیشن، رکا ہے ملحد کا آپریشن!

نہیں ہے گم لفظ سالویشن، خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے وہاں وہی عزت بشپ ہے
یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں، وہاں کلیسا سنور رہے ہیں
جناب اکبر سے کوئی کہدے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا فہر کہہ رہے ہیں

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہونگے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہونگے

نئے عنوان سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی
نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے

عقائد پر قیامت آئےگی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہونگے

بدل جائیگا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں
زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا
ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہونگے

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ
کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زورِ بازو نہیں تو کیا اسپیچ
ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

مذکر کے لئے ہی HE ہے مونث کیلئے شی SHE ہے
مگر حضرت مخنث ہیں نہ ہیوں میں نہ شیوں میں

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں
ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں
خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

شریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اسمٰعیل

مولوی محمد اسماعیل ۱۶ نومبر ۱۸۴۲ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر سررشتہ تعلیمات کی ملازمت میں گذری ۱۸۹۹ء میں پنشن لے کر اپنے وطن مالوف میرٹھ میں آگئے۔ اور باقی عمر یہیں گذری۔ اور یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو انتقال کیا۔

مولوی صاحب شاعر اور نثر نگار تھے۔ اردو شاعری میں طرزِ نو کے موجد ہیں۔ کلام میں سلاست، بیان میں سادگی، الفاظ میں شستگی اور روانی میں برجستگی مولانا کی خصوصیات ہیں۔ نثر میں بچوں کے لئے بہت سی اردو ریڈریں بھی لکھیں جو مختلف محکمہ ہائے تعلیم میں بطور منظور شدہ سرکاری کتب مروج ہوئیں۔

مولانا نے شاعری میں جدید اور قدیم دونوں طرز پہ طبع آزمائی کی ہے۔ اور تقریباً ہر صنفِ شعر میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ مولانا کا کلیات چھپ چکا ہے۔ جس میں مفصل سوانح حیات بھی درج ہیں۔

شمع ہستی

اے شمع ہستی! اے زندگانی!
بھاتی ہے دل کو تیری کہانی

ہے کوچ تیرا ہر لمحہ جاری
جاتی ہے بگ ٹٹ تیری سواری

بجلی سے بڑھ کر بے تاب ہے تو
یا واہمہ ہے یا خواب ہے تو

کیوں چپ چپاتی ہر دم رواں ہے؟
آئی کہاں سے جاتی کہاں ہے؟

ظاہر ہیں یوں تو سب پونرے گنؐ
لیکن نہ پایا تیرا سر دین

گزرا نہ کوئی اس ہفت خواں سے
جاہل ہیں تیرے تیر نہاں سے

فی الجملہ ہمت سب ہار بیٹھے
ہیں سر بزانو ناچار بیٹھے

اے زندگانی! اے شمع ہستی
سونی پڑی تھی تجھ بن یہ بستی

چاروں طرف تھی چھائی اندھیری
ناگاہ اٹھی اک ڈبیک تیری

وہ ڈبیک تھی بس نورؐ علیٰ نور
کا ہے کو رہتی پردہ میں مستور

پھولوں میں جھلکی تاروں میں چمکی
بخشی جہاں کو رونق ارم کی

ہوتا نہ یہاں جو تیرا ٹھکانا
چوپٹ ہی رہتا یہ کارخانہ

کیا پھونک ماری دنیا کے تن میں!
گویا لگادی دَوں خشک بن میں

بزم جہاں میں رونق ہے تجھ سے
اس میکدہ میں ہُوحق ہے تجھ سے

ہے تیرے دم سے اے عالم آرا!!!
بزم عروسی آفاق سارا

سرگرم ہے تُو جادوگری میں
ہیں تیرے عشوے خشکی تری میں

مٹی کا جوبن ہے تو نے نکھارا
دے دے کے چھینٹے اُس کو اُبھارا

بے حس کو بخشا احساس تُو نے
دی مشت گل کو بُو باس تُو نے

تھی بھولی بھالی بھونڈی بہت گم
تو نے سکھایا اس کو غم و چشم

کرتب سے تیرے سانچے میں ڈھلکر
کندن سی نکلی رنگت بدل کر

ٹھکرا کے تو نے جب کہہ دیا قُم
اُٹھ بیٹھی فوراً کرتی تبسم

کھولی ہے اپنی اوقات پہلی
پھرتی ہے خوش خوش کیا اہلی گہلی

پاتی ہے خلقت جب تیری آہٹ
ہوتی ہے پیدا اک گدگداہٹ

مچتا ہے پھر تو اودھم غضب کا
بجتا ہے ڈنکا عیش و طرب کا

کہتی ہے دنیا "تو ہے تو کیا غم
تو آئے نت نت تو آئے جم جم"

جیتے ہیں جب تک مرتے ہیں تجھ پر
سب کچھ تصدق کرتے ہیں تجھ پر

کیا مال ہے جو تیرے سوا ہے
تو ہی نہ ہو تو سب پہ دھنا ہے

اے سب کی پیاری سب کی چہیتی
کہہ منہ زبانی کچھ آپ بیتی

"قدرت کے گھر کی میں لاڈلی ہوں
ناز و نعم سے برسوں پلی ہوں

تقویم احسن میرا لگن تھا
فردوس اعلیٰ میرا وطن تھا

حور و ملک کی آبادیاں تھیں
بے فکریاں تھیں آزادیاں تھیں

چلتی تھی ہر دم باد بہاری
شیر و عسل کی نہریں تھیں جاری

میری ادا پر مرتے تھے قدسی
سجدہ پہ سجدہ کرتے تھے قدسی

تکریم میری ہوتی تھی از حد
ہیں داستانیں جن کی زباں زد

پھر دیس چھوٹا گزری سو جھیلی
پردیسیوں کا اللہ بیلی!

پل مارنے کا ہے یاں بسیرا
حبِ وطن ہے ایمان میرا

آب و ہوا میں دشت و جبل میں
میری رسائی ہے ہر محل میں

لیکن یہاں میں خلوت نشیں ہوں
ہوں اس طرح پر گویا نہیں ہوں

خواب گراں کی حالت ہے طاری
مستی میں گم ہے سب ہوشیاری

جب آتے آتے سبزہ میں آئی
کروٹ بدل کر میں لہلہائی

انگڑائیاں لیں منہ کھول ڈالا
پر آنکھ سے کچھ دیکھا نہ بھالا

داخل ہوئی جب حیواں کے تن میں
اک شور اٹھا اس انجمن میں

انساں کا جامہ جب میں نے پہنا
اللہ رے میں کیا میرا کہنا!

کس کس جتن سے میں نے بنایا
رتبہ بہ رتبہ پایہ بہ پایہ

جامد کو نامی نامی کو حیواں
حیواں کو وحشی وحشی کو انساں

پھیلایا میں نے کیا کیا بکھیڑا
شادی و غم کے ارگن کو چھیڑا

نیکی بدی کے میلے جمائے
جھوٹ اور سچ کے سکے چلائے

جو ناچ میں نے جس کو نچایا
وہ ناچتے ہی اس کو بن آیا

القصہ یوں ہیں وہ اسمِ اعظم
ہے جس کے بس میں تسخیر عالم

کچھ کچھ کھلے ہیں انداز میرے
دیکھے ہیں کس نے اعجاز میرے

مجھ کو نہ سمجھو تم آج کل کی
ہوں موجِ مضطر بحرِ ازل کی

رکھوں گی یوں ہی جاری سفر میں
قعرِ ابد کی لوں گی خبر میں

ہے میری ہستی اک طرفہ مضموں
کچھ بھی نہیں ہوں پر میں ہی ہوں سب کچھ

سنتے رہو گے میری کہانی
جب تک ہے باقی دنیائے فانی"

مکالمۂ سیف و قلم

سیف و قلم میں جو ہوئی دو بدو
شوق ہے تم کو تو سنو مو بمو

خامہ لگا کہنے کہ او تیغِ تیز
تجھ سے بھلا کس کو مجالِ ستیز

آب وہ تیری کہ نہ ٹھیرے نگاہ
آنچ وہ تیری کہ خدا کی پناہ

رہزنِ سفاک کی یاور ہے تو
خون کے دریا کی شناور ہے تو

سیکھے ستم کس ستم ایجاد سے
شور ہے برپا تری بیداد سے

شوخی و بے باکی و تیزی میں برق
آگ ہے اور آب میں رہتی ہے غرق

تند مزاجی میں تو شداد ہے
بیضۂ فولاد کی اولاد ہے

آتشِ سوزاں کا پیا تُو نے دُود
اس لئے جاں سوز ہے تیرا وجود

حیف تیری سختی و آہن دلی
نوعِ بشر کی ہے تو دشمن دنی

خرمنِ ہستی میں لگاتی ہے آگ
عافیت و امن سے رکھتی ہے لاگ

گو کہ مجلا ہے تو آئینہ وار
تیرہ درونی ہے تیری آشکار

تیری گھٹی میں پڑا زہر ہے
چال قیامت تو ادا قہر ہے

فتنۂ عالم ہے تیرا بانکپن
شوخی و ٹھگی ہے تیرا خاص فن

شکل انوکھی تو نرالی ہے دھج
جسم بھی خم دار طبیعت بھی کج

قحط زدوں کا سا تن و توش ہے
کھانے پہ ڈھوکے تو بلا نوش ہے

عرصۂ راحت ہے ترے دم سے تنگ
ایسی لڑاکا کہ بنی خانہ جنگ

تیری جبلت ہے فسوق و جدال
ناحق و حق کا نہیں تجھ کو خیال

قتل کا بہت رکھتی ہے چاؤ تو
رن میں کیا کرتی ہے ستھراؤ تو

اُف نہ کرے لاکھ گلے کاٹ کر
جی نہ بھرے تیرا لہو چاٹ کر

خلقِ خدا تجھ سے ہے آزار کش
کرتی ہی رہتی ہے سدا چپقلش

بحرِ فنا کہئے ترے گھاٹ کو
جس نے دئے سینکڑوں بیڑے ڈبو

گرچہ سراپا ہے ترا آب گوں
پر تری چتون سے ٹپکتا ہے خوں

تو نے اجاڑیں بہت آبادیاں
چھین لیں اقوام کی آزادیاں

تو نے کروڑوں کئے بچے یتیم
لاکھوں ہی باپوں کے کئے دل دونیم

لے گئی ماؤں کی کمائی کو لوٹ
رہ گئیں بیچاریاں چھاتی کو کوٹ

دلھنیں روتی ہیں تری جان کو
ساتھ ہی لے جائیں گی ارمان کو

موتیوں سے مانگ تھی جن کی بھری
ان سے کرائی ہے تو گدیہ گری

تو نے رفیقوں کو رلایا ہے خوں
غم سے عزیزوں کو ہوا ہے جنوں

تفرقہ پرداز! یہ کیا کر دیا
گوشت کو ناخن سے جدا کر دیا

شیوہ ترا شہرۂ آفاق ہے
خون خرابہ میں تو مشتاق ہے

مشعر کیفیتِ قلعۂ اکبر آباد

یارب! یہ کسی شمعِ کشتہ کا دھواں ہے — یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمیِ بزم کی فریاد و فغاں ہے — یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دورِ گذشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — بانیٔ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے
اُڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہیٔ اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہیٔ اکبر

باہر سے نظر ڈالئے اس قلعہ پہ یک چند — یہ پا ہے لبِ آبِ جمن صورتِ الو
گویا کہ ہے اک سورما مضبوط تنومند — یا ہند کا رجپوت ہے یا تُرکِ سمرقند
کیا بارۂ سنگین کا پہنا ہے قزاگند — ریتی کا قزاگند پہ باندھا ہے کمربند
مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرّد کے لئے بُرج ہیں سرکوب

وہ قصرِ معلّٰی کہ جہاں عام تھا دربار — آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
اور سقفِ زرانداود ہے مانندِ چمن زار — اور فرش ہے مرمر کا کہ چشمۂ انوار
اب بانگِ نقیب اس میں نہ چاوش کی للکار — سرہنگ کمربستہ نہ وہ مجمعِ حضّار
کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہِ عظمت و اجلال تھا میں بھی

وہ بارگہِ خاص کی پاکیزہ عمارت — تاباں تھے جہاں نیّرِ شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت — آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت — سیاح کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت
کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
تھا مخزنِ اسرار یہی تاج وروں کا

وہ رنگ محل برجِ مثمن کا وہ انداز — صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرافراز

ہاں مطربِ خوش لہجہ کی تھی کو نجتی آواز — گہ ہند کی دُھرپت تھی کبھی نغمۂ شیراز
اب کون ہے بتلائے جو کیفیتِ آغاز — زنہار کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز

جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ برج منوّر
اب ان کا مقابر میں نہ خاک ہے بستر

اُس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب — فوّارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جامِ بلوریں ہیں نہ وہ گوہرِ نایاب — وہ چلمن زرتار نہ وہ بستر کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب — یہ معرضِ خدّام تھا وہ موقفِ حجاب

وُہ بزم نہ وہ دَور نہ وہ جام نہ ساقی
ہاں طاق و رواق - اور در و بام ہیں باقی

علامہ اقبالؒ

پاکستان کا یہ بلند پایہ شاعر ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوا ابتدائی تعلیم وطن ہی میں پائی۔ انٹرمیڈیٹ مرے کالج سیالکوٹ سے پاس کیا۔ جہاں انہیں شمس العلماء مولوی سید میر حسن ایسے جید عالم کے فیضِ تربیت سے مستفیض ہونے کا موقعہ ملا انہوں نے اقبال میں عربی اور فارسی کا صحیح مذاق پیدا کر دیا۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے اور ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اورینٹل کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر بھی رہے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں رہ کر انگلستان اور جرمنی کی علمی اور قانونی ڈگریاں حاصل کیں۔

اقبال ایک زبردست شاعر اور مفکر تھے اور ان کی شہرت وطن سے نکل کر دوسرے ملکوں میں پہنچ چکی ہے۔ ان کی زندگی میں ہی ان کی فارسی مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہو چکا تھا۔

پاکستان کا تصور سب سے پہلے آپ ہی کے ذہن میں پیدا ہوا۔ حکومت کی طرف سے انہیں سر کا خطاب ملا ہوا تھا۔ مگر قوم نے انہیں حکیم الامت اور ترجمانِ حقیقت کے القابوں سے نوازا۔

اقبال کچھ مدت بیمار رہ کر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو اس دنیائے فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرما گئے۔ اور انہیں جامع عالمگیری کے صدر دروازہ کے پاس دفن کیا گیا۔

علامہ مرحوم کی شاعری نے مسلمانوں کی قوم میں ایک نئی زندگی اور روح پیدا کر دی ہے۔

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِّ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمان مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب

تا بدخشاں پھر وہی لعل گراں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا بھیجے سفیر
رات کے تاروں میں اپنے رازداں پیدا کرے
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

خودی

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے — خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانہ کے دریا میں بہتی ہوئی — ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی — دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں — پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے — یہی اس کی تقویم کا راز ہے
اسے واسطہ کیا کم و بیش سے — نشیب و فراز و کم و بیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر — ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے سنگھاسن کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فرد خالِ محمود سے در گزر — خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام — کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

فقر و ملوکیت

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے — ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلبِ سلیم!
اس کی بڑھتی ہوئی بے باکی و بے تابی سے — تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم!
اب ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقرِ غیور — کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم!
عشق و مستی نے کیا ضبطِ نفس مجھ پہ حرام — کہ گرہ غنچے کی کھلتی نہیں بے موجِ نسیم!

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

ابلیس

اے خدائے کن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر — آہ! وہ زندانیِ نزدیک و دور و دیر و زود!
حرفِ استکبار تیرے سامنے ممکن نہ تھا — ہاں، مگر تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!

یزداں

کب کھلا تجھ پر یہ راز؟ انکار سے پہلے کہ بعد؟

ابلیس

بعد! اے تیری تجلی سے کمالاتِ وجود!

یزداں

(فرشتوں کی طرف دیکھ کر)

پستیِ فطرت نے سکھلائی ہے یہ حجت اسے — کہتا ہے تیری مشیت میں نہ تھا میرا سجود!
دے رہا ہے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام — ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود کہتا ہے دود!

کہیں سرِ راہ گزر بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

کبھی اے حقیقتِ منتظَر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں ہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں
جو میں سربسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کب ملے گا نماز میں

واعظ! کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بےخبر! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو | کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

بڑی باریک ہیں، واعظ کی چالیں | لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

جمع کر خرمن تو پہلے دانہ دانہ چن کے تو | آ ہی نکلے گی کوئی بجلی جلانے کیلئے

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل | یہاں کی زندگی پابندیٔ رسمِ فغاں تک ہے

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے
ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سروِ کنارِ جو کا

صدائے لن ترانی سن کے اے اقبالؔ میں چپ ہوں
تقاضوں کی کہاں طاقت ہے مجھ فرقت کے مارے میں

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
مرے اشعار اے اقبالؔ کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم | طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے | نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

آغا حشر کاشمیری

آغا محمد شاہ حشر کاشمیری ایک ڈرامہ نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ آغا حشر ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ غزل خوب لکھتے تھے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں "شکریہ یورپ" ایک بلند پایہ نظم ہے۔ جو آغا حشر مرحوم نے ایک ہی نشست میں لکھی تھی۔

شکریۂ یورپ

مدتوں سے نغمۂ توحید محوِ خواب تھا
ساز ہستیٔ مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روح درد تھی
شعلہ ریزیٔ نواہائے اخوت سرد تھی
کر چکا تھا اپنی ہستی مسلم پرجوش گم
گرم ہنگامہ تھے سب یہ محشر فراموش گم
ماضیٔ رنگیں تماشا حیرتیٔ حال تھا
روزگار جلوہ زا کے لب پہ کیف الحال تھا
آمد و رفت نفس لاتی تھی پیغام حیات
ورنہ نذر خود فراموشی تھا نا کام حیات
چشم بینا حیرت طفلانہ کا گہوارہ تھی
صرف تعمیر تحیّر طاقتِ نظارہ تھی
نغمہ سنج قدس چپ تھا گلشن تکبیر میں
بند تھا شور انا مسلم لب تقریر میں

مدفن صد جلوۂ آشوب تر آئینہ بود
یک جہانِ بیقراری دم بخود در سینہ بود

وہ پیام آخری اسلام جس کا نام تھا
وہ ظہور صدق جو پروردۂ الہام تھا
وہ تجلیٔ حقیقت جو ظلالت سوز تھی
گرمیٔ قلب محمدؐ سے تپش اندوز تھی
روشنی دنیا کو دی جس مہر عالمتاب نے
رنگ فطرت دھو دیا جس نور کے سیلاب نے
ظلمت آگیں خلقت انساں کو بینا کر دیا
سنگ ریزے کو جلا دے کر نگینہ کر دیا

شعلے پیدا کر دئے خاکسترِ افسردہ میں   زندگی کی لہر دوڑا دی حیاتِ مردہ میں
شورشِ ہنگامہ آرا آب و گِل میں ڈال دی   شورِ بادل کا تڑپ بجلی کی دل میں ڈال دی
ایک ہلچل پڑ گئی جذباتِ زنگ آلود میں   آگ سی گویا لگا دی تودۂ بارود میں

بارہا نالید و گفت اے قومِ ما بیدار شو
حصۂ خود از حریفاں گیر و گرمِ کار شو

پُر ز غوغا شد جہاں شورم ز ہفت اختر گذشت   پنبہ در گوشی چرا ؟ برخیز آب از سر گذشت
مایۂ صد آفت است ایں گوشِ ناشنوائے تو   ہوش کن امروز گردد خوار تر فردائے تو
شرم کن! محوِ ادائے کفر ساماں کردۂ   آں دل و جانے کہ اوّل نذرِ قرآں کردۂ
اے کہ فطرت نرم و ہمت ہمچو آہن داشتی   قطرہ بودی گر طوفاں بدامن داشتی
پُر کن از صہبائے دوشیں ساغرِ ایام را   باز رنگ جلوہ دہ! از صبحِ ماضی شام را
حرفِ نسیاں ہیبتِ غرناطہ و بغداد شد   باز برخواں آں سبق کو خلق را از یاد شد
سیرتِ فاروق بنما شیوۂ حیدر بگیر   تاج از کسریٰ ستان و باج از قیصر بگیر

حال و استقبال ہر دو حاصلِ تدبیرِ تست
ہاں بجہد آمادہ شو در دستِ تو تعمیرِ تست

ہاں چھڑک پیشانیٔ ظلمت پہ افشانِ سحر   ٹانک دے دامانِ شب میں پھر گریبانِ سحر
بہرہ ور کر سوزِ دل کو احمدِ بے میم سے   جگمگا دے شمعِ جاں کو شمعِ ابراہیم سے
اپنی ہستی نذر دے ملت کی قربانگاہ کو   زندہ کر دنیا میں آئینِ خلیل اللہ کو
ڈال دے شورِ نوا معمورۂ ظلمات میں   دوڑ جا آہنگ بن کر سازِ موجودات میں
خاک کو بھر دے سرودِ آسماں پرواز سے   گرم کر دے روحِ مستی شعلۂ آواز سے
حسنِ آرائش سے زینتِ عالمِ امکاں کو دے   خلعتِ تجدیدِ آئینِ کہن ساماں کو دے
کلیاتِ دہر کی اک شرحِ نو تحریر کر   نظمِ ہستی کی نئے الفاظ میں تفسیر کر

طرحِ نو انداز بنیادِ جہاں از سر فگن
شعلہ در پیراہنِ آتش بہ خشک و تر فگن

تیری لب بندی سبق آموز گویائی ہوئی
طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی

آج ان ذرّوں کو بھی نازِ تابانی یہ ہے
تیرے در کا نقش سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

منتظر نظارے ہیں چشم خمار آلود کھول
اُٹھ کلید فتح بن قفل درِ مقصود کھول

اے خوشا غفلت جو ممنونِ اثر کچھ بھی نہیں
کان نے سب کچھ سنا دل کو خبر کچھ بھی نہیں

گو صدائے ہمت افزا تا بگوش آتی رہی
نالہ بن کر پیہم آوازِ سروش آتی رہی

پھر بھی ننگ زندگی آسودۂ خوابی رہا
سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا

جب تغافل اپنا شیوہ خفتہ قسمت نے کیا
اور یہی سامان بیداری مشیت نے کیا

دفعتاً از جلوۂ سینہ اُفق تابندہ شد
قُم باذنی گفت مغرب روحِ مشرق زندہ شد

اے زمین یورپ اے مقراضِ پیراہن نواز
اے حریفِ ایشیا اے شعلۂ خرمن نواز

چارہ سازی تیری بنیاد افگن کاشانہ ہے
تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے

اشکِ حسرت زا سے چشم حریت نمناک ہے
خونچکاں رودادِ اقوام گریباں چاک ہے

حرفِ تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری
آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری

عظمت دیرینہ نالاں ہے ترے برتاؤ سے
ڈھل گیا حسنِ قدامت خون کے چھڑکاؤ سے

جلوہ گاہ شوکتِ مشرق کو سُونا کر دیا
جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا

اُٹھ رہا ہے شورِ غم خاکستر پامال سے
کہہ رہا ہے ایشیا رو کر زبانِ حال سے

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پرِ پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

گرچہ اک دنیا کا دل تیری طرف سے خون ہے
امتِ خیر الوریٰ لیکن تری ممنون ہے

کون ہوں کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی
تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ ملت کھل گئی

چوٹ کھا کر بھر گیا دل لذتِ ایثار سے
جلوے جاگے شیشۂ بشکستہ کی جھنکار سے

یک بیک خونِ تنِ بیجاں میں ہیجاں آ گیا
قطرہ دریا بن گیا دریا میں طوفاں آ گیا

چونک اُٹھی روحِ اخوت ایک دل خستہ ہوئے
پتیاں گل بن گئیں۔ گل مل کے گلدستہ ہوئے

ہو گئیں بکھری ہوئی اینٹیں بہم تعمیر کی
ہل گئی ہر اک کڑی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی
بت شکن وحدت پرست اک جسم اک جاں ہو گئے
غل ہوا دنیا میں پھر کافر مسلماں ہو گئے

از کرم بپذیر یارب جوش بے اندازہ را
تا قیامت زندہ دار ایں زندگی تازہ را

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کے لئے
اے دعا ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے
اے خدا اب پھیر دے رخ گردش ایام کے
صلح تھی کل جن سے اب وہ برسر پیکار ہیں
وقت اور تقدیر دونوں پئے آزار ہیں
ڈھونڈتے ہیں اب مداوا سوزش غم کیلئے
کر رہے ہیں زخم دل فریاد مرہم کیلئے
رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
خلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں!
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں!

حسرت

مولانا فضل الحسن صاحب حسرت موہانی شاعر ادیب اور ایک نڈر سیاست دان کی حیثیت سے برّعظیم ہندو پاکستان میں بہت مشہور ہیں۔ اگرچہ تمام عمر طوق و سلاسل میں گذری لیکن کسی وقت میں شعر و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ خود فرماتے ہیں ؎

اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی

اردو غزل میں مولانا مرحوم کا پایہ بہت بلند ہے۔ ایک مدت تک کانپور سے اردوئے معلّٰی کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی ماہنامہ نکال کر خدمت علم و ادب میں سرگرم حصہ لیتے رہے۔

مقبرۂ نورجہاں

کیا اسی بیگم کا ہے یہ خوار خستہ مقبرہ
برسوں ڈنکا جس کا ملکِ ہند میں بجتا رہا
جس کی صورت جلوۂ فردوس کی تصویر تھی
جس کی رنگینی بہارِ خطۂ کشمیر تھی

جس کی رنگین بزم رشکِ روضۂ فردوس تھی
بیکسی سے اس کے لئے وضع کی ہے کیا صورت بنی
ظالموں نے قبر کا تعویذ تک چھوڑا نہیں
کونسا گوشہ ہے تربت کا کہ جو توڑا نہیں

بدلہ سنجی سے خجل ہوتی تھی جس کے پھلجھڑی
حیف وہ خاموش آغوشِ لحد میں ہے پڑی
قصر میں جس کے بچھا تھا فرش دیباؤ حریر
آہ فرشِ خاک پر سوتی ہے وہ ماہ منیر

جگھٹے میں نازنینوں کے جو کرتی تھی بسر
آہ اس کی قبر پر اب بیکسی ہے نوحہ گر
سیج پر پھولوں کے سوتی تھی کبھی جو نازنین
پھول دو سو کھے بھی اس کی قبر پہ چڑھتے نہیں

جس کی پابوسی کی کرتے آرزو گلہائے تر
خشک کانٹوں کا پڑا ہے ڈھیر اس کی قبر پر
قصر میں جلتی تھیں جس کے شمعہائے عنبریں

حیف روشن اک دیا بھی قبر پہ اس کی نہیں
نام روشن ہے جہاں میں آہ جس کا سربسر
نام کو بھی روشنی آئی نہ اس کی قبر پہ
کر دئے جس نے بہت سے مٹا البل و نشاں
اس شکستہ مقبرہ میں وہ پڑی ہے بے نشاں
جس نے صد ہا خلعتِ دیباؤ اطلس دیدئے
حیف تر ہے اس کی تربت ایک چادر کیلئے
گرچہ مرقد پہ نشانِ لوح بھی پیدا نہیں
نقشِ نامِ نیک لوحِ دل سے مٹ سکتا نہیں
گر نہیں ہے گور پر اس کے دیا تو کیا ہوا
ہے جہاں میں نور اس کے نام کا پھیلا ہوا
نیک ناموں کے نشاں باقی رہیں گے حشر تک
کیا ہوا گر دورِ گردوں نے مٹا دی قبر تک

روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے
اس جفاجو سے بہ ایمائے تمنا اب تک
ہوسِ لطف و عنایات چلی جاتی ہے
ل ہی جاتے ہیں پشیمانیٔ غم کے اسباب
شوقِ حرماں کی مدارات چلی جاتی ہے
ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے
دل کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں تو غضب کو ہم سے
رسمِ پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے
اس ستم گر کو ستم گر نہیں کہتے بنتا
سعیٔ تاویلِ خیالات چلی جاتی ہے
نگہ یار سے پا لیتے ہیں دل کی باتیں
شہرتِ کشف وکرامات چلی جاتی ہے
غیرتِ حسن نے مجبور کیا ہے حسرت
وصلِ جاناں کی یونہی رات چلی جاتی ہے

تجھ سا ہو یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

دل آرزوئے شوق کا اظہار نہ کر دے — ڈرتا ہے مگر یہ کہ وہ انکار نہ کر دے
ہشیار کہ اس پرسش پیہم کی نوازش — عشاق ستم کش کو ہوس کار نہ کر دے
ہم جور پرستوں پہ گمان ترک وفا کا — یہ وہم کہیں تجھ کو گنہگار نہ کر دے
ہوتا ہے بڑا لذت آزار کا لپکا — مرنا بھی کہیں مجھ کو یہ دشوار نہ کر دے
کچھ حد بھی ہے اس شورش خاموش کی حسرت — یہ کشمکش غم تجھے بیکار نہ کر دے

سب سے چھپتے ہیں چھپیں مجھ سے تو پردا نہ کریں — سیر گلشن وہ کریں شوق سے تنہا نہ کریں
اب تو آتا ہے یہی جی میں کہ اے محو جفا — کچھ بھی ہو جائے مگر تیری تمنا نہ کریں
میں ہوں مجبور تو مجبور کی پرسش ہے ضرور — وہ مسیحا ہیں تو بیمار کو اچھا نہ کریں
درد دل اور نہ بڑھ جائے تسلی سے کہیں — آپ اس کام کا زنہار ارادہ نہ کریں
شکوۂ جور تقاضائے کرم عرض وفا — تم جو مل جاؤ کہیں ہم کو تو کیا کیا نہ کریں
نور جاں کیلئے کیوں ہو کسی کامل کی تلاش — ہم تری صورت زیبا کا تماشا نہ کریں
حال کھل جائے گا بیتابیٔ دل کا حسرت — بار بار آپ انہیں شوق سے دیکھا نہ کریں

جوش ملیح آبادی:

شبیر حسین خاں نام اور جوش تخلص ہے۔ ان کا خاندان کئی پشتوں سے شاعر چلا آتا ہے۔ ان کے پردادا حسام الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خاں گویا کا شعرائے اردو کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔ دادا نواب محمد احمد خاں بہادر تعلقدار کسمنڈی تھے جن کے دیوان کا نام عرفان آدم ہے۔ والد نواب محمد بشیر احمد خاں بہادر رئیس اعظم بھی ایک نہایت خوش گو شاعر تھے۔ جوش صاحب ۱۸۹۶ء میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے سیتاپور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ میں تعلیم پائی لیکن والد کی ناوقت وفات کے باعث تعلیم ترک کر کے اپنی آبائی جاگیر کے انتظام میں مصروف ہو گئے۔ ان کی ناتجربہ کاری اور اہلکاروں کی چالاکیوں سے جاگیر کا ایک بڑا حصہ تلف ہو گیا۔ جوش صاحب والد کے انتقال کے چند سال بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ میں بحیثیت ناظر ادبی کام کرنے لگے۔ وہاں سے پنشن لے کر دہلی آ گئے۔ اور ایک بلند پایہ ادبی رسالہ "کلیم" کے نام سے نکالتے رہے۔

جوش صاحب کی شاعری ان کے اپنے تاثرات کا مرقع ہے۔ وہ حسن اور شباب کے نغمے الاپنے میں جو جوش اور سرمستی سے معمور ہیں کمال رکھتے ہیں۔ چند سال پہلے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ "روح ادب" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ بعد کا کلام پانچ جلدوں میں شعلہ و شبنم، نقش و نگار، فکر و نشاط، جنون و حکمت اور شاعر کی راتیں کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ آج کل کراچی میں عزلت گزیں ہیں۔

چاندنی رات

رات چھٹکاتی ہے تارے صبح برساتی ہے نور　　موسمِ باراں بچھا دیتا ہے سبزہ دُور دُور
چاندنی شب بھر دکھاتی ہے تجلیاتِ روئے حور　　ذرہ ذرہ صبح کو کہتا ہے میں ہوں برقِ طور

رات، زلفیں کھول دیتی ہے سُلانے کے لئے
تاج پہنے صبح آتی ہے جگانے کے لئے

لوریاں ہنس ہنس کے عجب نغمے سناتی ہیں مجھے　　ڈالیاں پھولوں کی جھک جھک کر بلاتی ہیں مجھے
شاخیں اپنے سائے میں پہروں بٹھاتی ہیں مجھے　　ندیاں اپنے کناروں پر سلاتی ہیں مجھے

کوئی مجھ کو رنج ان احباب میں دیتا نہیں
اور اس خدمت کی قیمت بھی کوئی لیتا نہیں

دیکھتے ہیں مجھ کو پہروں خندہ پیشانی سے پھول　　کس قدر مانوس ہیں آئینِ مہمانی سے پھول
ٹوٹ کر دامن میں آ جاتے ہیں آسانی سے پھول　　کرتے ہیں مسرور مجھ کو اپنی قربانی سے پھول

پھول کے مانند انسانو! تمہارا دل نہیں
میری خاطر جان بھی دینا انہیں مشکل نہیں

گونجتی ہے کوہ و صحرا میں پپیہے کی صدا　　اُودی اُودی آسمانوں پر جب آتی ہے گھٹا
روح کو بیدار کرتی ہے بیاباں کی ہوا　　دُور ہوتی ہے خودی، سینے میں آتا ہے خدا

کام رہتا ہے نہ دولت سے نہ فانی جاہ سے
لو لگا کر بیٹھ جاتا ہوں فقط اللہ سے،

صاف دل ہو جا، مجھے تعلیم یہ دیتی ہے نہر　　ندیوں کے پیچ و خم سے خون میں آتی ہے لہر
دشت ہنستے ہیں کہ آبادی پہ کیوں نازاں ہیں شہر　　آبِ حیواں جس کو سمجھے ہیں وہ ہے اک موجِ زہر

سوز دیتا ہے مجھے برسات کا دریا مجھے

عقل دیتا ہے گھنے جنگل کا سناٹا مجھے

نقرئی چادر بچھاتا ہے مہ سیمیں بدن چومتی ہے آ کے پیشانی مری زریں کرن
دیکھ کر شاداب ہوتا ہے مجھے صحنِ چمن کس قدر خوش ہوں کہ جنگل ہے مرا پیارا وطن

روز صحرا کی طرف جانا مرا دستور ہے
بستیوں میں ہوں، مگر میری قرابت دور ہے

رُباعیات

لب تشنہ و جاں خستہ و دل مُردہ نہ ہو غم دیدہ و آزردہ و افسردہ نہ ہو،
لاشِ دہلی پہ لکھنؤ نے یہ کہا، ہم بھی اب آ رہے ہیں آزردہ نہ ہو

ہر شے پہ سیہ عَلَم سے لہراتے ہیں سائے سے ہر اک چیز پہ تھراتے ہیں،
کیا جانئے کیا دیکھ رہی ہیں نظریں آنسو ہیں کہ اُمڈے ہی چلے آتے ہیں

سب بے خور شیدِ بے خواب ہیں کس سے پوچھوں ہر رُوح میں گرداب ہیں کس سے پوچھوں
اشکوں میں چمک رہے ہیں چہرے جن کے کس سمت وہ احباب ہیں کس سے پوچھوں

دِل بے کسیِ ادب پہ تھراتا ہے بے کیف فضا میں دم گھٹا جاتا ہے
فردوسی و رُودکی سمجھتا ہوں اُسے مصرع بھی مرا آن جو دُہراتا ہے

باقی نہیں اک شعور رکھنے والا صہبائے کہن سال کا چکھنے والا
کیا اپنے معانی کا میں رونا روؤں الفاظ نہیں کوئی پرکھنے والا

ہر بزم ہے بیہوش، پکاروں کس کو
ہر رند ہے خاموش، پکاروں کس کو
کس کو معلوم، کیا دلوں پر بیتی
سب ہو گئے روپوش، پکاروں کس کو

نظارگیانِ موج و ساحل ہیں کہاں
جو غنچہ و گرداب تھے وہ دل ہیں کہاں
غم دیدہ و حیران ہے مدارت بری
اے دورِ زمانہ، اہلِ محفل ہیں کہاں

اربابِ اشارت، کہاں ہو، بولو
رندانِ خوش اوقات، کہاں ہو، بولو
بچھڑا ہوا اک عمر کے بعد آیا ہوں
یارانِ خرابات، کہاں ہو، بولو

کچھ دادِ جگر کاوئ دمساز تو دو
اک رشتۂ بیباک کو اذنِ پرواز تو دو
آتے نہیں سامنے جو یارانِ عزیز
مجھ خستہ کی آواز پر آواز تو دو

جوش

محمد الدین تاثیر

تاثیر مرحوم کا تعارف حصہ نثر میں دیا گیا ہے۔ مرحوم نظم و نثر
میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ذیل کی نظم جدید انداز میں ایک
کامیاب نظم ہے۔ مرحوم نے ۱۹۵۰ء میں انتقال کیا۔

فرار

(محاورہ مابین شاعر و ضمیر کائنات)

مجھے حاصل ہیں دنیا کے مراتب مال و دولت بھی
گوارا میری سیرت ہے گوارا میری صورت بھی
میسر ہے خمارِ عشرت و کیفِ محبت بھی
تو پھر یہ مردنی کیوں چھا رہی ہے میری دنیا پر

تجھے حاصل ہے سب کچھ پھر بھی غم بے حاصلی کا ہے
یہ غم تیرا بجا ہے یہ ترا احساس سچا ہے
کہ جیتا جاگتا ہے تو کہ تیرا قلب زندہ ہے
مگر اک مردنی چھائی ہوئی ہے تیری دنیا پر

میں گھل مل جاؤں گا یوں خاکساروں بے نواؤں میں
بدل ڈالوں گا سب احکام اپنے التجاؤں میں
میں اپنا مال و دولت بانٹ ڈالوں گا گداؤں میں
کرے گا طعن کوئی کس طرح پھر میری دنیا پر

غریبوں کی غریبی کیا مٹے گی ان نوالوں سے
نپٹ سکتا نہیں تو اس طرح سرمائے والوں سے

الٹ ہا مگل ہے تیرا مسئلہ ان سب سوالوں سے
کہ تیری اپنی دنیا طعنہ زن ہے تیسری دنیا پہ

کروں گا اپنا گھر آباد میں اک اور دنیا میں
کنارِ آبِ رکنا باد و گل گشتِ مصلےٰ میں
کسی آباد بستی میں کسی آزاد صحرا میں
نہ ہوگا پھر کسی کا بھی تسلط میری دنیا پر

جہاں بھی جائے گا تو تیری دنیا ساتھ جائے گی
نہ چھوڑے گی کبھی تجھ کو یہ تنہا ساتھ جائے گی
یہی حسرت یہی تیری تمنا ساتھ جائے گی
رہے گا تیری دنیا کا تسلط تیری دنیا پر

میں دنیا چھوڑ دوں گا میں خدا سے لو لگاؤں گا
صنم خانوں کے ایوانوں میں قندیلیں جلاؤں گا
کلیساؤں کے محرابوں میں اپنا سر جھکاؤں گا
خدا کے عرش کا سایہ رہے گا میری دنیا پر

تو جا ہے بھی تو پرچھائیں سے دل بہلا نہیں سکتا
خدا کا نور بھی آنکھیں تری چندھیا نہیں سکتا
جسے تو سچ سمجھتا ہے اسے جھٹلا نہیں سکتا
اندھیرا ہی اندھیرا چھا رہا ہے تیری دنیا پر

مری ظلمت کو چمکا دے گی طلعت مہ جبینوں کی
حصارِ عافیت بن جائیں گی باہیں حسینوں کی
غموں کو محو کر دے گی مسرت ہم نشینوں کی
خوشی کے پھول برسیں گے ہمیشہ میری دنیا پر

تمناؤں میں الجھا تا رہے گا دل کو تو کب تک

کھلونے دے کے بہلاتا رہے گا دل کو تو کب تک
خلافِ عقل منواتا رہے گا دل کو تو کب تک
ہوس کی ظلمتیں چھائی ہوئی ہیں تیری دنیا پر

نرالی ہے زمانے سے مرے افکار کی دنیا
حسینوں سے حسین تر ہے مرے اشعار کی دنیا
شبِ مہتاب کی دنیا، مہِ رخسار کی دنیا؟
یہی انوار نکہت بار ہوں گے میری دنیا پر

چھپا رکھے گا خوابوں میں کہاں تک تو حقیقت کو
دبا رکھے گا لفظوں میں کہاں تک تو صداقت کو
یہ پردے اور بے پردہ کریں گے تیری فطرت کو
تری فطرت رہے گی سایہ افگن تیری دنیا پر

تو میں تیغ و کفن باندھے ہوئے کود وں گا میداں میں
حیاتِ جاوداں پنہاں ہے آبِ تیغِ برّاں میں
بہار آ جائے شاید اس طرح میرے گلستاں میں
خزاں چھائی ہوئی ہے مدتوں سے میری دنیا پر

بہار آئی نہ ہو جس باغ میں اس کی خزاں کیسی
ترا جینا بھی مرنا ہے حیات جاوداں کیسی
یہ تلواریں کہاں کی ہیں، یہ ترکش کیا، کماں کیسی
ابد کی موت طاری ہو چکی ہے تیری دنیا پر

نہ جینے کی ہوس باقی نہ مرنے کا خطر دل میں
بھٹکتے پھرتے ہیں رہرو غبارِ راہِ منزل میں
ابھی لیلائے مستقبل چھپی بیٹھی ہے محمل میں
ابھی کچھ دیر تاریکی رہے گی ساری دنیا پر

محروم

منشی تلوک چند صاحب محروم آپ کا وطن مالوف عیسیٰ خیل میانوالی ہے۔ آپ کی طبیعت میں شاعری کا ملکہ فطری ہے۔ فصاحت اور روانی سوز و گداز آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ پیدائش ١٨٨٥ء۔ آپ میانوالی میں ہیڈ ماسٹری کے عہدے پر بھی مامور رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ترک وطن کر کے ہندوستان چلے گئے ہیں۔

موت

اے موت بحر و بر پہ ہے سکہ رواں ترا ظالم مطیع حکم ہے سارا جہاں ترا
راہ جفا پہ کوئی نہیں ہم عناں ترا توسن رواں ہے صورت برق تپاں ترا
کچھ کچھ شریک جور ہے گو آسماں ترا لیکن وہ دوں خصال بھی ثانی کہاں ترا

تو پھول توڑ لیتی ہے اس کے چمن سے بھی
ہر صبح ہے رخ مہ و انجم پہ مردنی

ماتم کدہ بہ دہر جو ہے تیرے دم سے ہے ویراں ہر ایک شہر جو ہے تیرے دم سے ہے
دریائے غم میں لہر جو ہے تیرے دم سے ہے نالوں میں لہر بہر جو ہے تیرے دم سے ہے
امرت جہاں میں زہر جو ہے تیرے دم سے ہے جینا خدا کا قہر جو ہے تیرے دم سے ہے

جو دل ہے تیرے داغ سے یاں لالہ زار ہے
ماہی سے ماہ تک جو ہے سوداغدار ہے

مارا کسی غریب کو تو نے وطن سے دور ماں باپ سے کہیں پرے بھائی بہن سے دور
لاشہ کوئی پڑا ہے مزار و کفن سے دور دست صدائے شیون و شور محن سے دور

پھولوں کی آہ نازبھری انجمن سے دُور
گھونٹا گلا ہزار کا صحنِ چمن سے دُور
گھیرا کسی کو ورطۂ دریا کے درمیاں
پھانسا کسی کو دامنِ صحرا کے درمیاں

تو جس کا بچہ لے گئی اُس ماں کا حال دیکھ
جاری ہیں اشک گرچہ ہوئے ماہ و سال دیکھ
اے موت دیکھ طولِ زباں ملال دیکھ
اب تک لٹے ہیں گرد سے سر کے بال دیکھ
ایسی بھی غمزدوں کی کہیں ہے مثال دیکھ
ہر وقت روتے دھونے سے آنکھیں ہیں لال دیکھ
نورِ نظر کے غم میں یہ اتنا جو روئے گی
آنکھیں تو خیر، جان کو اک روز کھوئے گی

اے موت آہ تیرے ستائے ہوئے یتیم
نقشِ غلط کی طرح مٹائے ہوئے یتیم
وہ سیلِ اشکِ خوں میں بہائے ہوئے یتیم
سوزِ غمِ نہاں کے جلائے ہوئے یتیم
دوشِ پدر سے خاک پہ آئے ہوئے یتیم
گودی سے ماں کی آہ چھڑائے ہوئے یتیم
روتے ہیں اور دیتے ہیں رو رو دعا تجھے
ان کو رُلا کے موت بھلا کیا ملا تجھے

عاشق کو آکے حسن کا جلوہ دکھا گئی
دل آگیا کسی پہ تو بس موت آ گئی
پروانے کے شکار کو شمعیں جلا گئی
گل بہرِ عندلیب چمن میں کھلا گئی
جھونکوں میں جب سموم کے ظالم سما گئی
دم میں چراغِ ہستئ گل کو بجھا گئی
صیاد بن کے مرغِ چمن زاد پر گری
اور برق ہو کے خانۂ صیاد پر گری

اے موت مت ڈرا مجھے مجھ کو فنا نہیں
جلنے کا مجھ پہ نام کو جادو ترا نہیں
کچھ ابتدا نہیں ہے مری انتہا نہیں
میں وہ ہوں مجھ سے چھیڑ کی لیلیٰ بجا نہیں
تیری رسائی جسم سے آگے ذرا نہیں
ہاں جسم نیلا مال ہے بیشک مرا نہیں
شمشان تیری آگ مجھے کب جلا سکے
آغوشِ قبر تو مجھے کیوں کر دبا سکے

شبِ غم

وہی شام دھندلی دھندلی وہی رات کالی کالی -
وہی خامشی ہوا میں وہی بدلیوں کی جالی
وہی شمع پھیکی پھیکی مرے ساتھ رونے والی
وہی میں وہی مرا دل وہی مشورے خیالی
شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
مرے گھر میں کیوں خموشی ہے دل پہ یوں تباہی
یہ مکاں ہے یا کہ صحرا میں مکیں ہوں یا کہ راہی
در بام پہ ہے اکثر شبِ گور کی سیاہی
میں ہوں زندہ یا کہ مردہ مجھے کیا ہوا الٰہی
شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
میں کسے یہاں پکاروں کہ نہیں نشاں کسی کا
نہ قدم کی کوئی آہٹ نہ گذر یہاں کسی کا
ہے جہاں میں کوئی مونس کوئی رازداں کسی کا
ہے مکیں یہاں کا تنہا یہ بھی ہے مکاں کسی کا
شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے
ترے رحم سے بسر ہو یہ شبِ محن الٰہی
نظر آئے پھر کسی کی مجھے انجمن الٰہی
مری روح چھوڑ جائے نہ دیارِ تن الٰہی
کہیں دامنِ شبِ غم نہ بنے کفن الٰہی
شبِ غم بُری بلا ہے شبِ غم بُری بلا ہے

ابوالاثر حفیظ جالندھری

ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ مولانا گرامی کے ارشد تلامذہ سے ہیں ان کی شاعری ایک طرف تو شباب کی مستانہ ترنگوں کی تصویر کشی اور جوانی کی حسین امنگوں کی چہرہ کشائی کرتی ہے۔ دوسرا پہلو منظر نگاری ہے جس کو شاعر نے اچھوتی اور نادر تشبیہات سے دلکشی اور دلربائی کا جامہ پہنا دیا ہے

تاریخ اسلام کے زریں واقعات رزم و بزم کو اردو نظم میں لکھ کر "شاہنامہ اسلام" کی صورت میں پیش کیا ہے جس پر قوم نے انہیں فردوسیِ اسلام کا خطاب دیا ہے۔

نثر میں سات طبع زاد افسانوں کا مجموعہ چھپ کر اہلِ ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر چکا ہے۔

مجاہدینِ اسلام کی صف بندی

مجاہد عشق کو مختار کر کے مرنے جینے پر ‌ ‌ ‌ مثالِ کوہِ آہن ڈٹ گئے مٹی کے سینے پر
سرِ راہِ شہادت سربلندوں نے صفیں باندھیں ‌ ‌ ‌ خدا کا حق ادا کرنے کو بندوں نے صفیں باندھیں
یہ اک مسجود کے ساجد، یہ اک مطلوب کے طالب ‌ ‌ ‌ یہ اک معبود کے عابد، یہ اک محبوب کے طالب
نہ ملک و مال کی دھن میں نہ عزّ و جاہ کی خاطر ‌ ‌ ‌ فقط اللہ کی خاطر، فقط اللہ کی خاطر
خیالِ مرگ کر سکتا نہ تھا ہرگز ملول ان کو ‌ ‌ ‌ کہ بہرِ جنگ لایا تھا صداقت کا اصول ان کو
نہ ذاتی رنج تھا کوئی نہ کینہ ان کے سینوں میں ‌ ‌ ‌ صفائے قلب تھی مانندِ آئینہ جبینوں میں
نہ کوئی زعمِ باطل تھا نہ کوئی جوشِ ہنگامی ‌ ‌ ‌ نہ فکرِ کامیابی تھی نہ ذکرِ خوفِ ناکامی
نہ کثرت کی کوئی پروا نہ تھا قلت کا غم ان کو ‌ ‌ ‌ نہ کچھ اندیشۂ پست و بلند و بیش و کم ان کو
نہتے تھے مگر تسکین و اطمینان رکھتے تھے ‌ ‌ ‌ کہ ساماں پر نہیں ایمان پہ ایمان رکھتے تھے
یہ چند افراد جو دیندار تھے عابد تھے زاہد تھے ‌ ‌ ‌ یہی تھے ہاں یہی اسلام کے سچے مجاہد تھے
مجاہد تھے کہ جوشِ ضبط کی خاموش تصویریں ‌ ‌ ‌ مجاہد تھے کہ دِینِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کی تفسیریں
چلے آتے تھے مسجد کے نمازی آج میداں میں ‌ ‌ ‌ صفیں باندھے کھڑے تھے بن کے غازی آج میداں میں

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیواروں کے سائے میں
نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

صفِ اسلام

صفیں باندھے کھڑے تھے سامنے ایمان والے بھی ‌ ‌ ‌ خدا والے، محمدؐ والے بھی قرآن والے بھی،
نمائش تھی نہ شوکت تھی نہ گھوڑے تھے نہ جوڑے تھے ‌ ‌ ‌ نہ کلغی تھی نہ طرّہ، کمندیں تھیں نہ کوڑے تھے

اگرچہ عرش پیما ہمتِ مردانہ تھی ان کی،
فقیرانہ تھا مسلک وضع درویشانہ تھی ان کی
نمازِ عجز کے سجدے تڑپتے تھے جبینوں میں
چٹانوں کی طرح مضبوط دل رکھتے تھے سینوں میں
تھے ان کے پاس دو گھوڑے چھ زرہیں آٹھ شمشیریں
پلٹنے آئے تھے یہ لوگ دُنیا بھر کی تقدیریں
نہ تیغ و تیر پر تکیہ، نہ خنجر پر نہ بھالے پر
بھروسا تھا تو اک سادی سی کالی کملی والے پر

برفانی چوٹیوں سے گزرتے ہوئے سپاہیوں کا راگ

تن کے بیٹھے ہیں یہ مغرور یہاں صاحبِ تاج
اِن پہاڑوں سے لشکر کو ابھی لینا ہے خراج
گرم جوشی پہ کوئی حرف نہ آنے پائے
شعلۂ عشق تہِ برف نہ آنے پائے
جسم و جاں جائیں مگر ہمّتِ عالی نہ دبے
رُوح پرواز کرے، لے پر و بالی نہ دبے
ہم اولوالعزم ہیں پیچھے نہیں ہٹنے والے
اور ہوں گے کوئی منزل سے پلٹنے والے
مٹ گئے ہم تو یہ کام اور بشر کر لیں گے
کوہ کیا چیز ہے، افلاک کو سر کر لیں گے
المدد المدد اے جذبۂ دشوار پسند
قلّۂ کوہ ذرا اور بلند اور بلند
بادو باراں سے کہو جوشِ جوانی دکھلائیں
طبع حاضر ہو تو کچھ اپنی روانی دکھلائیں
سر پہ ہر ایک بلا آئے دمِ سربازی
ژالہ کیا، بامِ فلک سے ہو کلوخ اندازی
آسمانوں سے ہو یخ بستہ چٹانوں کا نزول
سرد مہری بھی یہ منظور یہ سختی بھی قبول
اٹھے سیلاب کہ طوفان قیامت توڑے
اُس پہ لعنت ہو جو منہ راہِ طلب سے موڑے

شامِ رنگین

مغرب کے گھر میں سورج بستر جما رہا ہے
رنگیں بادلے میں چہرہ چھپا رہا ہے
کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو

عکسِ شفق نے کی ہے اس طرح زرفشانی — گھُل مل کے بہہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی
اوڑھے سیاہ دوپٹے سرسبز وادیوں نے — زیور اتار ڈالے گلزار زادیوں نے
چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیڑوں تلے اندھیرا — چڑیوں نے کھیت چھوڑا لینے لگیں بسیرا
کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں — پھولوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں
لپٹی ہوئی ہیں نیندیں کیف آفریں ہوا میں — خاموشیوں کی لہریں اُٹھنے لگیں فضا میں
گم ہو چلی ہے دنیا بہکے ہوئے سُروں میں — دل غرق ہو رہا ہے چپ چاپ کے فسوں میں
کھیتوں میں کام کرکے لوٹے ہیں کام والے — چادر سروں پہ ڈالے کندھوں پہ ہل سنبھالے
اب شام آگئی ہے چمکے ہیں بھاگ ان کے — ہر سمت کھنچتے ہیں رستوں پہ راگ ان کے
لے کے ڈھور ڈنگر چرواہے آرہے ہیں — سیٹی بجا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں
کمسن سہیلیوں کا پنگھٹ پہ جمگھٹا ہے — جانے اکیلیوں کا دل کس طرح کٹا ہے
یہ بار بار باتیں، یہ بار بار ہنسنا — یہ بے شمار باتیں، یہ بے شمار ہنسنا
وہ گدگدا رہی ہے، یہ کھِل کھِلا رہی ہے — یہ بھر چکی ہے پانی، گاگر اٹھا رہی ہے
شرما کے اس نے کھینچے منہ پہ ہنسی کے مارے — رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے

شرم و حیا کی سرخی چہرے پہ چھا رہی ہے
شام اس کو دیکھتی ہے اور مسکرا رہی ہے

فیض

فیض احمد فیض خطۂ پنجاب کے نوجوان ادیب شاعر اور صحافی ہیں۔ جدید اردو شاعری میں ان کا مقام کافی بلند ہے۔

گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے۔ دوسری جنگ عظیم میں فوج میں بھرتی ہو گئے۔ وہاں سے فارغ ہوئے تو میدان صحافت میں قدم رکھا۔ آج کل روزنامہ "پاکستان ٹائمز" روزنامہ "امروز" اور ہفت روزہ "لیل و نہار" کے مدیر اعلیٰ ہیں۔

شورشِ بربط و نے

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں، پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شب خوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے
شیرینیِ لب، خوشبوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیِ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے"

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیِ کاکل و لب، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر

سد مقسوم ہے لذتِ دردِ جگر موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اس ذوقِ نظر کا شکر کرو، اس دیدۂ تر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز:-

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائیِ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا
جب خونِ جگر برفاب بنا جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوقِ رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل، اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز:-

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں دمامۂ حشمتِ قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل، بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ مال و حشم یہ لوح و قلم یہ طبل و علم سب اپنے ہیں

ساغر نظامی

محمد صمد یار خاں نام ساغر تخلص ۲۱ دسمبر ۱۹۰۵ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے، مذہبی اور اردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہوئی اور انگریزی کی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ اور محمدن اینگلو یعنی علی گڑھ ایم۔ اے۔ او کالج میں ہوئی۔

بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق پڑ گیا۔ اور تیرہ برس کی عمر میں شعر و ادب کی مجلسوں اور مشاعروں کی نشستوں میں شریک ہونے لگے۔ شروع میں سیماب اکبرآبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ اور ایک مدت تک استاد و شاگردوں میں ادبی اور تجارتی اشتراک بھی قائم رہا، کئی علمی، ادبی، مزاحی اور سیاسی پرچے بھی نکالے جیسے علی گڑھ پنچ، استقلال، پیمانہ اور صبوحی وغیرہ۔

پرگو شاعر ہیں، بادۂ مشرق، صبوحی، رنگ محل وغیرہ کتب ان کی زندگی میں چھپ کر قبولیت عامہ کا فخر حاصل کر چکی ہیں نظم کے علاوہ نثر میں افسانوں کا مجموعہ کہکشاں کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ساغر جب مشاعروں میں پڑھتے ہیں۔ تو چھا جاتے ہیں۔

آشوبِ عصر

روک لیں شدتِ ہنگامہ نے راہیں میری
زیرِ لب آ کے پلٹ جاتی ہیں آہیں میری
ماتمِ دہر میں آزاد نگاہیں میری
اب وہ خود ڈھونڈتی پھرتی ہیں پناہیں میری

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

کاہشِ جذبۂ ملت سے پریشانی ہے
شورشِ فتنۂ باطل کی فراوانی ہے
نفسِ سرد کی ہر موج میں طغیانی ہے
روح ہر جسم میں اب موج نہیں پانی ہے

نقش برآب ہے تعمیرِ جہاں کچھ بھی نہیں
آج انساں بجز وہم و گماں کچھ بھی نہیں

پھول ہوتے ہیں شگفتہ ورقِ خونیں سے
بادہ ہوتا ہے مرکب عرقِ خونیں سے
ہر سحر ہوتی ہے پیدا طبقِ خونیں سے
شام ہوتی ہے ہویدا شفقِ خونیں سے

چشمِ خونبار ہے ساغر ہے کہ پیمانہ ہے
خون ہی خوں لیکن سرخیِ افسانہ ہے

لرزشوں میں ہیں مسلسل در و بامِ عالم
ہے خرابیِ نظر منظرِ عامِ عالم
لغزشوں سے جو مرتب ہے خرامِ عالم
ایک بہکا ہوا میکش ہے نظامِ عالم

گوشہ گوشہ سے پریشان ہوا آتی ہے
شمع پھر پردۂ فانوس میں تھراتی ہے

نہ رہیں نغمۂ بلبل کی نوائیں باقی
نہ رہیں باغ میں طوطی کی صدائیں باقی
اب کہاں ہیں وہ دل آویز فضائیں باقی
ہیں فقط حسرتِ باقی کی گھٹائیں باقی

بارشِ یاس ہے امید کے ایوانوں پر
بجلیاں گرتی ہیں اُجڑے ہوئے کاشانوں پر

سرحدیں مشرق و مغرب کی شرر خیز ہیں آج
جدتیں عقلِ بشر کی ستم انگیز ہیں آج
نیتیں اہلِ جہاں کی خطر آمیز ہیں آج
حکمتیں امن کی اِک خنجرِ خونریز ہیں آج

قتلِ عالم ہے خود آرائی و شاہی کے لئے
سب یہ سامان ہیں دُنیا کی تباہی کے لئے

اُفق دہر پہ طاری ہے سیاہی کیسی
ذہنِ عالم پہ یہ آئی ہے تباہی کیسی
کم نگاہی ہے یہ انساں کی الٰہی کیسی
کہ فنا ہو گئی دنیا ہی تو شاہی کیسی

آج طاری ہیں نئی وحشتیں انسانوں پر
چاہتے ہیں کہ حکومت کریں ویرانوں پر

نہ سکوں ہے کہیں باقی نہ اماں باقی ہے
دیدۂ یاس بہ ہر سو نگراں باقی ہے
رفعتِ فکر کا دھندلا سا نشاں باقی ہے
برتری فطرتِ انساں میں کہاں باقی ہے

نفس مغلوب ہے ڈرپوک لٹیرے کی طرح
مادہ رُوح پہ غالب ہے اندھیرے کی طرح

آج فرسودہ و پامال ہے ارژنگِ قدیم
نہ وہ موسیقیِ دیریں ہے نہ وہ چنگِ قدیم
جوہرِ آئینہ بن بن کے اُڑا رنگِ قدیم
اب کہاں محفلِ مستی میں وہ آہنگِ قدیم

کیف و مستی کا وہ پہلا سا اب انداز نہیں
نغمے خاموش ہیں اور ساز میں آواز نہیں

نہ وہ مطرب ہے نہ وہ چنگ نہ وہ نغمہ و ساز
نہ وہ وجدان نہ وہ کیف نہ وہ سوز و گداز
نہ وہ معیارِ حقیقت نہ وہ اندازِ مجاز
نہ وہ محمود نہ وہ ذوق کی مستی نہ ایاز

نہ وہ بادہ ہے نہ گردش ہے وہ پیمانوں کی
لے گیا لوٹ کے دُنیا کوئی انسانوں کی

اب نہ وہ عشق نگاریں ہے نہ وہ حُسنِ نگار
مشربِ قیس کی عظمت ہے نہ لیلےٰ کا وقار

نہ محبت کا سلیقہ نہ وفا کا معیار
نہ وہ جذبات نہ احساس نہ ذوقِ بیدار

نالۂ نیم شبی کے لئے فرصت نہ رہی
اب دُعائے سحری کی بھی ضرورت نہ رہی

خود پرستی کا چلن عام ہوا ہے ہر سو
خود نمائی کا اثر پھیل گیا ہے ہر سو
اب فریب اور ہوس جلوہ نما ہے ہر سو
محشرِ حرص و ہوا ہے کہ بپا ہے ہر سو

بیخودی کو ہے جنوں میرے سوا کوئی نہیں
اور خودی کو یہ یقیں ہے کہ خدا کوئی نہیں

اک صدا یہ ہے کہ انسان مہذب ہی نہیں
فلسفہ کو کسی تحقیق سے مطلب ہی نہیں
زعمِ الحاد ہے بندوں کا کوئی رب ہی نہیں
خبطِ سائنس کو یہ ہے کہ کوئی مذہب ہی نہیں

مختلف رنگ سے اوہام کی گلچینی ہے
ایک ہنگامۂ خود رائی و خود بینی ہے

کائنات آج حقیقت میں ہے محشر آباد
جس کی فطرت نے حقیقت پہ رکھی تھی بنیاد
تھا جو تخلیق کا منشا ہوا آخر برباد
آج ہر ملک میں شورش ہے ہر اک گھر میں فساد

وحشتیں ان میں نمودار ہیں حیوانوں کی
کون کہتا ہے کہ بستی ہے یہ انسانوں کی

دم بخود دیکھ رہی ہے یہ تماشا فطرت
لبِ خاموش کی تصویر ہے گویا فطرت
بلکہ لکھتی ہے ہر اک چیز قبضہ فطرت
غور فرما ہے نکالے گی نتیجہ فطرت

ابدی ہے یہ خموشی کوئی کہہ سکتا ہے
ایک حالت پہ زمانہ کہیں رہ سکتا ہے

یہی نیرنگِ جہاں حشر کا دیباچہ ہے
کسی آشوب کی تمہید یہ ہنگامہ ہے
ختم جو حشر میں ہوگا یہ وہی قصہ ہے
کہہ رہا ہے جسے انجام کا اندازہ ہے

کاش حالات کا یہ دورِ مسلسل ہو جائے
داستان اتنی بڑھا دو کہ مکمل ہو جائے

آج ہر سعیِ سکوں کوشش لاحاصل ہے — جس میں ہیں صبح کے آثار یہ وہ محفل ہے
شام سے صبح بدل جائے بہت مشکل ہے — ختم افسانہ ہو یہ وقت اسی قابل ہے

ہوش میں اپنے نہیں بزم کے دیوانے بھی
شمع افسردہ ہے خاموش ہیں پروانے بھی

پھر کسی محفلِ نو کی کہیں تیاری ہے — خود نہیں گرمیِ محفل سے گرانباری ہے
ہر طرف خواب کا عالم جو یہاں طاری ہے — اس پردہ میں نہاں محشرِ بیداری ہے

"لذتِ سیر و گرِ چشم تماشا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی"

جلوہ فرما کوئی پھر ہو گا نئی شانوں سے — عزتیں عالمِ نو پائے گا انسانوں سے
بجلیاں چمکیں گی وحدت کے نہاں خانوں سے — انجمن پھر یونہی بھر جائے گی پروانوں سے

نئی تنویر، نیا چاند، نئی شب ہو گی،
نئے لوگوں سے نئی بزم مرتب ہو گی،

غزل

سنا مغنی مجھے وہ نغمہ کہ جھوم جائے شباب تیرا — اگر ذرا بھی کیا تکلف تو چھین لوں گا رباب تیرا
غرور کر نغمہ ریزیوں پر مگر مغنی یقین فرما — وہیں بنا ہے یہ سازِ دل بھی جہاں بنا ہے رباب تیرا
صبیح کلیوں میں میں نے سونگھی ترے تبسم کی بوئے نازک — عمیق چشموں سے میں نے دیکھا ابل رہا ہے شباب تیرا
بلند ہر بند و بست سے تھی حدود میں تیری خوابگہ کی — وہ اک نگاہِ خیال میری جو لوٹ لائی حجاب تیرا
نہ میری آنکھیں سکوں تماشا نہ تیرے جلوے قرار فرما — ہیں ایک ہی کشمکش میں دونوں نگاہ میری نقاب تیرا
جنونِ ہنگامہ میری آہیں فسادِ عریاں تری نگاہیں — تباہیٔ کائنات ٹھیری مری جوانی شباب تیرا
لبوں سے مس کر کے تو نے ساقی کیا تھا لبریز جو ازل میں — نظر میں اب تک چھلک رہا ہے وہ ایک جامِ شراب تیرا
حساب کی فرصتیں کسے ہیں مگر یہ دنیا کا فیصلہ ہے — وفا جو ہو بے حساب میری ستم بھی ہو بے حساب تیرا

یہ تیری عارضِ روشن نگاہیاں ہیں کہ رات بجلی بنی ہوئی ہے
لطیف پردوں میں سونے والے چمک رہا ہے حجاب تیرا

بہار آنکھوں کے کھٹکے میں حیا کے چشمے چھلک رہے ہیں
عجیب عالم سے منظروں سے گزر رہا ہے شباب تیرا

کچھ اس متانت سے جھوم کر چل کہ ٹوٹ جائے نظامِ گلشن
شگفتگی بن کے پھوٹ نکلے کلی کلی سے شباب تیرا

یہ تیری ساغر سیاہ مستی یہ حسن کیشی یہ مے پرستی
کہیں نہ دنیا تباہ کر دے مذاقِ خانہ خراب تیرا

کتب خانہ [illegible] اسلامیہ دہلی

مطبوعہ فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور باہتمام عبدالحمید خاں پرنٹر و پبلشر